جائزہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۱	بابت ماہ جنوری ۱۹۷۰ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

اڈیٹر: ۷۴۲۵۸ منیجر: ۷۴۴۷۰

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　ٹائٹل: دیال پرنٹنگ پریس دہلی

شذرات

۱۷ر دسمبر سے رباط میں عرب ملکوں کی چوٹی کانفرنس شروع ہورہی ہے، یہ کانفرنس ایسے وقت میں منعقد ہورہی ہے جب مغربی ایشیا کے عرب اسرائیل تنازعہ کے کسی سیاسی حل کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، اور دنیا کو یہ دکھانے کے لئے کہ عرب خود کسی پرامن سیاسی مسئلے کے حق میں نہیں ہیں، گذشتہ ہفتہ سے اسرائیل نے شام اردن اور سویز کے علاقہ میں اپنی فوجی سرگرمیاں تیز کردی ہیں، اس سے مقصد یہ ہے کہ عرب ان حملوں کا شدت سے جواب دینے پر مجبور ہوں گے اور پھر وہ ساری دنیا میں پروپیگنڈا کرے گا کہ عرب ممالک اسرائیل کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور وہ مسئلہ کا کوئی سیاسی حل نہیں چاہتے، پچھلے دنوں امریکہ کی طرف سے عرب اسرائیل سمجھوتے سے متعلق جو تجویزیں آئی تھیں انھیں عربوں نے رد کردیا ہے اور سوویٹ یونین نے بھی ان کی مخالفت کی ہے، بس اس کے بعد سے اسرائیل کے حملے شدید اور وسیع پیمانے پر ہورہے ہیں۔

رباط میں ہونے والی عرب چوٹی کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ اب جبکہ اسرائیل سینائی اور دوسرے عرب علاقوں کو جن پر اُس نے گذشتہ جنگ میں قبضہ کرلیا تھا، چھوڑنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں اور ایسی صورت میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ فوجی کارروائی کے ذریعہ اس سے یہ علاقے خالی کرائے جائیں، عربوں کی فوجی طاقت کو کس طرح مجتمع اور منظم کیا جائے، اور اسرائیل سے آخری اور فیصلہ کن لڑائی لڑی جائے اس وقت بعض عرب ملکوں میں ایسے پُرجوش اور ذمہ دار عناصر ہیں جو چاہتے ہیں کہ رباط کا یہ اجتماع ایک جنگی کونسل کی شکل اختیار کرلے، اور عرب لیگ میں شامل سارے ملک اپنی فوجی اور اقتصادی قوت کو اس اہم مقصد کے لئے وقف کردیں۔ ان حلقوں کی یہ خواہش تو غالبًا پوری نہیں ہوگی، ہاں اس کا امکان

ہے کہ رباط کے اجتماع میں شریک ہونے والے عرب ممالک سخت فوجی کارروائی کے لئے کوئی منصوبہ بنانے پر تیار ہو جائیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خرطوم کی چوٹی کانفرنس کے مقابلہ میں رباط کی یہ کانفرنس زیادہ سخت، مثبت اور موثر اقدام کی تجویز منظور کرے گی۔

صدر ناصر نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اسرائیل کے مشرق میں جو عرب ملک ہیں ان کی ایک مشترک کمان ہو اور اسرائیل کے مغرب میں عرب ملکوں کی الگ ایک مشترک کمان ہو، پھر ان دونوں فوجی کمانوں میں مناسب اور موثر تال میل کے لئے ایک مرکزی کمان قائم کی جائے۔ اس وقت سویز کے علاقہ میں سوڈان، الجزائر، کویت اور عراق کے فوجی ہیں، ادھر مشرق میں عراق کے تقریباً ۱۲ ہزار فوجی اردن میں اور لگ بھگ اتنے ہی جنوبی شام میں ہیں، سعودی عرب کی فوجوں کا بھی ایک حصہ اردن میں متعین ہے۔ لیکن یہ سب اُن سپاہیوں کے باقیات ہیں جو گذشتہ جنگ کے موقع پر جلدی میں بھیجے گئے تھے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر ناصر واضح طور پر مشرقی اور مغربی کمانوں کی صورت میں عرب ملکوں کی مشترک فوجوں کا کوئی مربوط انتظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن لڑائی کی صورت میں سب سے بڑا مسئلہ عربوں کے پھیلے ہوئے علاقے کو فضائیہ کی ایک مضبوط چھتری فراہم کرنا ہوگا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عربوں کے پاس ہر قسم کے، یعنی لڑاکو، بمباری کرنے والے اور ٹرانسپورٹ وغیرہ کی قسم کے، اتنے ہوائی جہاز ہیں کہ وہ مشرق و مغرب، شمال اور جنوب ہر طرف ایسے مقامات کی حفاظت کر سکیں جو فوجی، نیم فوجی اور معاشی اہمیت کے حامل ہوں؟ پھر لڑنے والی پیدل فوج اور بکتر بند دستے کے ہوائی تحفظ کا مسئلہ بھی ہوگا اور اس سب پر مستزاد یہ کہ کیا عربوں کے پاس اتنے ماہرین ہیں جو اس قدر وسیع علاقے میں پھیل کر لڑائی کے زمانے میں فوجی ضرورتوں کو پورا کر سکیں؟ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ صدر ناصر کی تجویز کس طرح عمل میں آسکے گی۔ اسرائیل اس رمز سے خوب واقف ہے کہ خالص میدانی جنگ میں وہ عربوں سے نہیں جیت سکتا، تعداد بہرحال نظر انداز نہیں کی جاسکتی اور میدانی جنگ میں اردنی، عراقی اور مصری اچھے لڑنے والے بھی ہیں اور ان کے پاس سامان بھی ہے، اسی لئے شروع ہی سے اسرائیل نے اپنی ہوائی طاقت پر زیادہ توجہ دی ہے اور اپنی فضائیہ کو جدید طرز کے ہوائی جہازوں اور دوسرے سامانوں سے اس قدر لیس کر دیا ہے کہ بیک وقت، مشرق اور مغرب ہر طرف، دور دور تک، عربوں کے علاقے

اس کی زد میں رہتے ہیں کیا عربوں کے پاس اس وقت اسرائیل کی فضائیہ کا کوئی موثر جواب ہے ؟

مشرق میں شام، عراق اور اردن اور کویت ہیں، سعودی عرب کو بھی ایک لحاظ سے اسی مشرقی محاذ میں شامل کر لیجئے، ظاہر ہے کہ ان سب کی مل کر اتنی ہوائی طاقت نہیں ہے کہ اسرائیلی فضائیہ کی ایک تہائی طاقت کا بھرپور وار جھیل سکے۔ کہتے ہیں کہ صدر ناصر کی تجویز ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اُردن میں اپنے ہوائی اڈے قائم کر کے مغربی محاذ سے عرب ہوائی فوج کا ایک حصہ اس طرف منتقل کر دے۔ یہ تجویز کہاں تک عمل میں آسکتی ہے اسے تو کوئی فوجی ماہر ہی بتا سکتا ہے، سوال یہ ہے کہ خود متحدہ عرب جمہوریہ، سوڈان، لیبیا، الجزائر اور مراکش کی ہوائی طاقت کا کیا حال ہے؟ ہمارا اندازہ تو یہ ہے کہ اس وقت ان سب کی متحدہ فضائی قوت کچھ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوگی۔ لیبیا میں انقلاب کی وجہ سے صورت حال میں ایک تبدیلی تو ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اب لیبیا میں برطانوی اور امریکی اڈوں کو اسرائیل استعمال نہیں کر سکے گا، دوسرے یہ کہ اگر لیبیا میں انقلابی حکومت باقی رہتی ہے تو مراکش اور الجزائر سے متحدہ عرب جمہوریہ تک زمین کا راستہ برقرار اور محفوظ رہے گا بشرطیکہ ایسی مضبوط اور اچھی سڑکیں ہوں جن پر فوجوں کی نقل و حرکت ہو سکے۔ اب لیبیا سے متحدہ عرب جمہوریہ کو ہر قسم کی مدد بھی مل سکتی ہے اور جیسا کہ معلوم ہوا ہے یہ سلسلہ شروع بھی ہو چکا ہے۔

گذشتہ عرب اسرائیل جنگ میں شام کی بعثی حکومت نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس کی مثال اس منچلے نوجوان کے بیجا اور بے محل جوش و خروش سے دی جا سکتی ہے جس کی مہم جوئی پورے خاندان کو مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہے، عربوں پر اس رویئے سے جو مصیبت ٹوٹی اور عین جنگ کے زمانے میں اس نے جس طرح کم ہمتی دکھائی اسے عرب عرصہ تک یاد رکھیں گے۔ اب شام پھر وہی جوش و خروش دکھا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں کو چاہئے کہ وہ مغربی ملکوں کو تیل کی سپلائی فوراً بند کر دیں، حالانکہ اسے معلوم ہے کہ اسی تیل کی آمدنی سے سعودی عرب اور کویت متحدہ عرب جمہوریہ اور اُردن کی اس کٹھن وقت میں مدد کر رہے ہیں اور اپنی معیشت کو بھی چلا رہے ہیں۔ تیل کی آمدنی نہ ہو تو سعودی عرب، کویت اور اُدھر صحارا میں لیبیا کا پورا معاشی نظام بکھر کر رہ جائے۔ معاشی حالات

کا یہ وہ تجربہ ہے جس سے یہ ممالک نکل نہیں سکتے۔ شام کی طرف سے تیل کی سپلائی کے سلسلہ میں مغربی ملکوں کے بائیکاٹ کی باتیں سنکر خیال ہوتا ہے کہ شام کے حکمران غیر ذمہ داری کی باتوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سوڈان اور لیبیا میں انقلاب اور جنوبی یمن میں بائیں بازو کی حکومت کے قیام سے عرب ملکوں میں بائیں بازو کے رجحانات کا پلہ بھاری ہو گیا ہے اور رباط کی چوٹی کانفرنس کے مذاکرات اور فیصلوں پر اس کا اثر پڑے گا۔ لیکن مراکش، ٹیونیشیا، سعودی عرب، کویت اور لبنان کے رجحانات بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے، خود اردن جس کے سامنے جنگ کے سوا اور کوئی دوسرا لائحہ عمل نہیں، کئی معاملات میں دائیں بازو کی حکومتوں کا ہمنوا ہے، اس لئے مغربی طاقتیں ان ملکوں کے ذریعہ رباط کانفرنس پر اثر انداز ہونے کی ضرور کوشش کریں گی، عین ممکن ہے کہ کانفرنس کے موقع پر ایسا مرحلہ بھی آجائے کہ کانفرنس کے بے نتیجہ ثابت ہونے کے امکان نظر آنے لگیں۔ لیکن ان ملکوں کے سامنے یہ بات بھی رہے گی کہ ان کیلئے عرب قوم پرستوں کے حلقے کسی ایسی صورت کو برداشت نہیں کریں گے جو عام عرب مفاد کے خلاف ہو، اردن، سعودی عرب اور لبنان تو خاص طور پر اپنے عرب نیشنلسٹوں اور فلسطینی عربوں کی تنظیم سے خائف ہیں، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ رباط کانفرنس میں اسرائیل کے خلاف سخت اقدام کے حامی ملکوں کی مخالفت کھل کر نہیں کی جائے گی اور اسی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ خرطوم کانفرنس کے مقابلہ میں رباط کا یہ اجتماع نتیجہ خیز ہوگا۔ پھر بھی، ان تمام باتوں کے باوجود، بائیں بازو کی عرب حکومتوں کا کوئی فیصلہ یا ان حکومتوں کے اثر سے رباط کانفرنس کا فوجی اقدام سے متعلق کوئی فیصلہ اس وقت تک کارگر نہیں ہوگا جب تک سوویٹ یونین کی تائید اِسے حاصل نہ ہو، لڑائی اسلحے کے بغیر نہیں لڑی جاتی اور بائیں بازو کی عرب حکومتوں کو فوجی سامان اور اسلحے مل سکتے ہیں تو سوویٹ یونین یا مشرقی یورپ کے ملکوں سے، اشتراکی چین موجودہ حالات میں اس سلسلہ میں کوئی بڑی خدمت نہیں انجام دے سکتا۔

پروفیسر محمد مجیب

شیخ فریدؒ گنج شکرؒ

امام غزالی نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے کہ سچا دوست وہ ہے جو سوچتا رہے کہ دوست کے لئے وہ کیا کر سکتا ہے اور جس کا اس طرف خیال ہی نہ جائے کہ دوستی سے خود اس کو کیا حاصل ہوگا۔ یہی بات محبت کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ محبت کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بھول جائے، سب کچھ دے اور بدلے میں کچھ نہ مانگے، یہ بھی نہ چاہے کہ محبت کے بدلے اس سے محبت کی جائے۔

ماں باپ، بھائی بہن، بیوی شوہر، دوست سب محبت کے دعویدار ہوتے ہیں مگر یہ محبت جذبات کا فریب بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں بے غرضی کی بنیادی شرط پوری نہیں ہوتی، اور جب کبھی محبت کی وجہ سے نقصان یا دکھ پہنچنے لگتا ہے تو سب مجبور ہو کر یہ سوچتے ہیں کہ انھوں نے کیا دیا اور اس کے بدلے میں انھیں کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے اور اس میں کوئی عیب نہیں۔ انسان فائدے کا امیدوار نہ ہو، نقصان اٹھانے پر بھی تیار ہو تب بھی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے جس سے گذرنے کے بعد اس کا صبر اور تحمل جواب دے دیتا ہے۔ تب محبت کے لئے کوئی سہارا نہیں رہتا۔ طبیعت دنیا سے، آدمیوں سے بیزار سی ہو جاتی ہے۔ ایک منزل تک انسان سے انسان کی محبت رہنما کا کام کرتی ہے اور یہ سمجھنا صحیح ہوتا ہے کہ خدا سے محبت اسی کو ہو سکتی ہے جو انسانوں سے محبت کرتا ہو مگر اس منزل کے آخر تک پہنچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے سچی محبت وہی کر سکتا ہے جسے خدا سے اور صرف خدا سے محبت ہو۔ ایک منزل پر انسان محبت کے معاملوں میں اپنے رجحان، اپنی طبیعت کے مطابق چلتا ہے، اپنے اختیار سے کام لیتا ہے، چاہے زبان سے وہ کہے کہ: عشق پر زور نہیں۔

اس کے آگے جو منزل ہے وہاں محبت یا تو فنا ہوجاتی ہے یا خدا کا حکم بن جاتی ہے۔

آج کل خدا اور انسان کے درمیان ملت اور شریعت کی دیواریں اس طرح حائل ہیں کہ یہ سمجھنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے کہ خدا کا حکم کیا ہے اور اس حکم کی تعمیل کیسے کی جاسکتی ہے۔ لوگ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خدا کا حکم کیا ہے، اپنے دل کے سوا ہر جگہ نظر دوڑاتے ہیں، سوچتے ہیں کہ وہ بھی قانونی حکم کی طرح کچھ ہوگا اور کہیں لکھا ہوا مل جائے گا، بے شک وہ لکھا ہوا بھی ملتا ہے، مگر اسے وہی سمجھ سکتا ہے جس نے پہلے اپنے ذہن اور اپنے دل کو پاک کرلیا ہو اور رضاجوئی کی مشق کرکے بصیرت حاصل کی ہو۔ اکثریت ہمیشہ یہ چاہتی ہے کہ خدا کا حکم بیان کرنے کی ذمہ داری کسی اور پر ڈال دے۔ لیکن ایک زمانے میں ایسے آزاد بندے بھی ہوا کرتے تھے جنھیں کسی دوسرے کا ایسا توسط گوارا نہ تھا جو ان کے اور خدا کے درمیان غیریت کی دیوار بناکر کھڑی کردے۔ وہ ایسے رہنما کو تلاش کرتے جو ان کے دل کی بات کو سمجھ سکتا، توبہ کرتے، یعنی اعلیٰ کی خاطر ادنیٰ سے بالکل منہ پھیر لیتے، فاقے کرکے پیٹ کی کی غلامی سے نجات حاصل کرتے۔ مسلسل عبادت کرکے اپنے الگ وجود کا احساس مٹا دیتے۔ یہ سب تیاری تھی اس منصب کا حق ادا کرنے کے لئے جیسے دلوں کو دریافت کرنا، یعنی خواہش اور غرض کی آلائشوں کو دور کرکے دلوں تک پہنچنا اور "تالیف قلوب" یعنی بگڑے اور بچھڑے اور سہمے اور خود غرض یا غرور میں ڈوبے ہوئے دلوں کا ملانا، ایک لڑی میں پرونا تھا۔ یہ کام صرف محبت کے ذریعہ ہوسکتا تھا۔ لیکن کوئی محبت کرنا چاہتا تو کیسے کرتا۔ حکومت اور اقتدار کی ہوس ایسی تھی کہ حاکموں کے ہاتھ بے گناہوں کے خون میں ڈوبے رہتے تھے۔

شیخ فرید گنج شکرؒ ۱۱۷۳ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ۱۲۶۵ء میں وفات پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کی سلطنت نئی نئی قائم ہوئی تھی اور تلوار کے زور پر ہی قائم رہ سکتی تھی۔ شیخ فریدؒ کے ایک ہم عصر شیخ کمال الدین زاہد تھے جن کی دینداری ان کے علم کی طرح ہر طرف مشہور تھی۔ سلطان بلبن نے اُن کو دربار میں بلایا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ جامع مسجد کی امامت قبول کریں۔ انھوں نے انکار کردیا، اور جب سلطان نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا کہ مسلمانوں کے پاس بس ایک چیز اُن

نماز باقی رہ گئی ہے ،کیا بادشاہ چاہتا ہے کہ وہ بھی اُن سے چھین لے ؟ دراصل عالموں کا یہ منصب تھا کہ
نہ قدروں کو اپنی زندگی میں نمایاں کریں۔ مگر یہ محبت کا پیغام کس کو اور کیسے سناتے جب لوگ حکومت کے
ست نگر تھے ، اور ان کا سارا وقت ایک دوسرے سے جھگڑنے میں گذرتا تھا۔ جون پور کے دو عالموں
ں اس بات پر بحث شروع ہوئی کہ بلی کی رال پاک ہوتی ہے یا نجس اور ختم ہوئی ایسی گالی گلوج پر جس نے
ماری بستی کو شرمندہ کر دیا۔ محبت کے آداب سیکھنے کا آرزومند سوداگروں میں جا کر بیٹھتا تو دیکھتا کہ وہ عالموں
سے بھی زیادہ حکومت اور حاکموں کے دست نگر ہیں اور دستکاری کرنے والے خود اس کے محتاج تھے کہ کوئی
ن کے دُکھ درد کو سُنے ۔ وہ لوگ جو دنیا سے الگ ہو کر ایک کونے میں بیٹھتے ،عبادت کرتے اور دلوں کی
ریافت اور تالیفِ قلوب میں مشغول رہتے ایک بڑا ہی نیک اور مفید کام کرتے جسے کرنے کے لئے بڑی
ہمت درکار تھی اور جو کسی اور طریقے سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ انھوں نے دنیا کو چھوڑا تو محبت کا حق ادا
رنے کے لئے چھوڑا۔

شیخ فریدؒ شیخ قطب الدین بختیارؒ کاکی کے مُرید تھے۔ ان کی طبیعت سخت ریاضتیں کرنے کی طرف مائل تھی اور ان کے پیر انھیں ٹوکتے رہتے تھے کہ زیادہ ریاضت کروگے تو لوگوں کو خیال ہوگا کہ تم انھیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو۔ شیخ فریدؒ کو جب خلافت نامہ مل گیا تو انھوں نے اجودھن کو اپنا مرکز بنایا اور وہیں توکل کی زندگی گذارتے رہے۔ انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی اور ان کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں جن کی تاریخی سند بہت کمزور ہے۔ مگر ہمیں کافی ایسی باتیں معلوم ہیں جن کے سہارے سے ان کی زندگی کا نقشہ بنایا جا سکتا ہے۔

جب وہ مُرید ہو چکے تھے تو ایک مرتبہ شیخ فریدؒ نے اپنے پیر سے پوچھا کہ بہت سے لوگ تعویذ لکھوانے آتے ہیں، فرمائیے کیا کروں۔ پیر نے جواب دیا کہ معاملہ نہ میرے ہاتھ میں ہے نہ تمہارے۔ تعویذ پر خدا کا نام ہوتا ہے لکھ دیا کرو۔ آج کل ہم تعویذ لکھوانے کے قائل نہیں ہیں۔ بیمار ڈاکٹر کے پاس یا ہسپتال جاتا ہے، جسے اپنا کوئی کام کرانا ہوتا ہے وہ درخواستیں لکھتا ہے، سفارشیں کراتا ہے۔ ایک طرح سے کام نہیں بنتا تو دوسری طرح سے کوشش کرتا ہے۔ آج کل ایسی آسانیاں

ہیں جو پہلے نہیں تھیں۔ پھر بھی لوگ پریشان رہتے ہیں اور انھیں اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کی بات سننے والا کوئی نہیں۔ اور آج کل اتنی فرصت ہے کس کو کہ بیٹھ کر دکھ درد کی باتیں سنے۔ ایسی باتیں سننا اور سنتے رہنا، ہر مصیبت زدہ سے جو اُن کے پاس آتا ہمدردی کرنا شیخ فریدؒ اور اُن جیسے تمام صوفی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اِسی تعویذ لکھنے کے کام کو لیجئے۔ شیخ فریدؒ اسے برسوں کرتے رہے۔ پھر انھوں نے اسے اپنے مرید شیخ نظام الدین اولیاؒ کے سپرد کردیا۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس میں کتنا وقت لگتا ہے اور اسے اپنے ذمے لیتے ہوئے گھبرائے۔ شیخ فریدؒ نے فرمایا، تم ابھی سے پریشان ہو کہ تمھیں اتنی دُعائیں لکھنی ہوں گی، اس وقت کیا کرو گے جب بہت سے حاجت مند تمھارے دروازے پر آئیں گے اور تم سے دعاؤں کی درخواست کریں گے؟ ایک موقع پر ایک آدمی شیخ فریدؒ کے پاس آیا۔ اُس کے بیمار بھائی کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے اپنی پریشانی بیان کی۔ شیخ فریدؒ نے فرمایا، تمھاری جو حالت اس وقت ہے ویسی ہی حالت میری تمام عمر رہی ہے، لیکن میں نے کسی کو بتایا نہیں۔ اس پر بھی ایسے لوگ تھے جنھیں شیخ فریدؒ کی توجہ کافی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک بوڑھے فرّاش نے اُن سے کہا، شیخ فریدؒ، تم ملنے والوں سے کچھ بیزار سے لگتے ہو۔ خدا کا شکرادا کرنے کا بہتر طریقہ اختیار کرو، شیخ فریدؒ نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

اُن کی ہدایتوں میں سے ایک یہ تھی کہ بھلائی کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہا کرو۔ بھلائی کرنا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، اس لئے کہ سب اپنی فکروں اور پریشانیوں اور خواہشوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ شخص بہت خوش قسمت ہے جسے بھلائی کرنے اور اس طرح محبت کا پیغام دلوں تک پہنچانے کا موقع ملے۔ فرّاش نے ٹھیک کہا تھا کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ لوگ آتے ہیں، اپنا دُکھ درد بیان کرتے ہیں اور دل پر محبت کا اثر لے کر واپس جاتے ہیں۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

ڈاکٹر مشیر الحق

ملایا میں قانون شریعت

(مضمون کا پہلا حصہ جو ملایا کی سیاسی تاریخ سے متعلق ہے "انسائی کلوپیڈیا برٹانیکا" اور "انسائی کلوپیڈیا امریکانا" میں مندرج اعداد و شمار کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔
جہاں تک ملایا میں قانونِ شریعت سے متعلق معلومات کا تعلق ہے وہ سنگاپور کے اسٹیٹ ایڈووکیٹ جنرل، ڈاکٹر احمد ابراہیم کی کتاب "اسلامک لاء ان ملایا" (مطبوعہ سنگاپور ۱۹۶۵ء) سے حاصل کی گئی ہیں۔ بطور حوالہ حاشیے میں ایک ہی کتاب کا بار بار ذکر کرنے کے بجائے جہاں ضروری سمجھا گیا ہے، متن مضمون میں مذکورہ بالا کتاب کے صفحات کا حوالہ دے دیا گیا ہے)

جنوب ایشیا کے جس خطے کو آج ہم ملایا کہتے ہیں وہ زیادہ دن نہیں گزرے جب چند چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں پر مشتمل صرف ایک جغرافیائی علاقہ تھا۔ ملایا کی ریاستوں میں ملاکا وہ پہلی ریاست تھی جو صدیوں پہلے مسلمان عرب تاجروں اور صوفیوں کے ذریعے اسلام سے روشناس ہوئی، اس کے بعد سلطان ملاکا کی کوششوں سے اڑوس پڑوس کی دوسری ریاستوں میں بھی اسلام پھیل گیا۔

پندرھویں صدی میں جب پرتگالیوں کے قدم اس علاقے میں پہنچے تو ملایا کی ریاستوں کے مسلمان سلاطین کا سیاسی زوال شروع ہوا۔ تقریباً دو سو سال تک پرتگالی اس علاقے کی تجارت پر بلا شرکت غیرے قابض رہے۔ آخر اٹھارویں صدی میں اس علاقے کے ایک چھوٹے سے جزیرے پینانگ پر انگریزوں کا تسلط ہوا۔ اس کے بعد سے پرتگالی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے گئے اور انگریز پورے علاقے پر اپنا اثر بڑھاتے چلے گئے۔ اس صدی کی دوسری جنگِ عظیم کے شروع ہونے تک ملایا کی تمام ریاستوں پر انگریزوں کا اقتدار مکمل ہو چکا تھا۔ سیاسی طور سے ملایا کی ریاستوں کی حیثیت کم و بیش وہی تھی جو آزادی سے قبل

ہند و پاک کی دیسی ریاستوں کی تھی۔

دوسری جنگِ عظیم میں جب جاپانیوں کے ہاتھوں انگریزوں کو اس علاقے میں شکست ہوئی تو ان کی برسہا برس کی جمی ہوئی سیاسی ساکھ بالکل اُکھڑ گئی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد انگریزوں کو اس پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ ملایا کی آزادی کے سلسلے میں وہاں کی سیاسی تحریکوں کے لیڈروں سے گفت و شنید کریں۔ تجربے کے طور پر ۱۹۴۸ء میں انگریزوں کی سرپرستی میں ملایا کی چند ریاستوں میں دستوری حکومت قائم ہوئی۔ چند برسوں کے بعد ملایا کو مکمل خود مختاری مل گئی اور ۱۹۵۷ میں ملایا کی حسب ذیل ۱۱ ملکوں کو ملا کر فیڈریشن آف ملایا کا قیام عمل میں لایا گیا:

۱۔ جوہور	(آبادی ۹۲۵،۹۱۹)	۷۔ کیلنتان	(آبادی ۵۰۵،۱۷۱)
۲۔ پاہنگ	(″ ۳۱۲،۹۷۸)	۸۔ ترنگانو	(″ ۲۷۸،۱۴۷)
۳۔ نگری سمبلین	(″ ۳۶۵،۰۴۵)	۹۔ پیرک	(″ ۱،۲۲۰،۶۳۳)
۴۔ سالنگور	(″ ۱،۰۱۲،۰۴۷)	۱۰۔ پینانگ	(″ ۲۷۴،۳۲۵)
۵۔ کیدہ	(″ ۷۰۱،۴۸۶)	۱۱۔ ملاکا	(″ ۲۹۱،۲۳۳)
۶۔ پرلس	(″ ۹۰،۸۳۴)		

وفاقی حکومت کا کل رقبہ ۱۹۵۷ء میں ۵۰ ہزار ۶ سو مربع میل اور تمام ریاستوں کی مجموعی آبادی ۹۱۵،۲۷۶،۶ تھی۔[۵]

۱۹۶۳ء میں ۳ اور برطانوی اقتدار والے علاقے (سنگاپور، شمالی بورنیو اور سراواک) اس فیڈریشن میں ملا دیئے گئے اور اس طرح سیاسی طور سے یہ پورا علاقہ فیڈریشن آف ملایا کے بجائے فیڈریشن آف ملیشیا کہلانے لگا۔ جس حصے کو پہلے فیڈریشن آف ملایا کہتے تھے وہ فیڈریشن آف ملیشیا کے قیام کے بعد پھر سے صرف ملایا کہا جانے لگا۔

---

۵ یہ اعداد و شمار ۱۹۵۷ء کے ہیں، جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۴، (ایڈیشن ۱۹۶۴)، ص ۱۱ ۷ مسلسل سے لی گئی ہیں۔

فیڈریشن کا سیاسی اعلیٰ سربراہ کار وہاں کا وزیر اعظم ہوتا ہے جو پارلیمانی انداز سے ملک کا نظم و نسق چلاتا ہے۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی کے علاوہ ہر ریاست میں اندرونی نظم و نسق کے لئے ریاستی قانون ساز اسمبلیاں ہیں۔ موجودہ ۱۴ ریاستوں میں سے پانچ ریاستیں ایسی ہیں جن کا دستوری حاکم اعلیٰ مرکز کی طرف سے متقرر کردہ گورنر ہوتا ہے۔ بقیہ ۹ ریاستوں میں دستوری اعلیٰ حکمرانی وہاں کے پرانے حکمرانوں ہی کے ہاتھ میں باقی رکھی گئی ہے۔ یہ نو حکمران اپنے میں سے کسی ایک کو فیڈریشن کے دستوری حکمران کی حیثیت سے پانچ سال کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ یہ حکمراں کاغذی طور پر پورے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک ہے لیکن فی الواقعہ اس کی حیثیت برطانیہ کے دستوری حکمراں کی سی ہے۔ اصل اختیار پارلیمنٹ کے ہاتھوں میں ہے۔

(۲)

ملایا کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب اتنا زیادہ ہے کہ ہم اُسے ایک طرح سے خالص مسلمانوں کا ملک کہہ سکتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان اصولی طور پر دو قسم کے قوانین کے تحت زندگی گزارتے ہیں، ایک تو وہ سیکولر قانون ہے جو ملایا کے ہر شہری پر بلا اختلاف مذہب و ملت عائد ہوتا ہے، دوسری طرف اسلامی شریعت ہے جس کا دائرہ یہاں کے صرف مسلمان باشندوں تک محدود ہے لیکن درحقیقت ملایا میں شریعت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو قانونِ شریعت کے تحت نہ آجاتا ہو۔

ملایا کے اصل مسلمان باشندوں کی اکثریت چونکہ شافعی المذہب ہے اس لئے سرکاری طور پر فقہ شافعی کو قوانین شریعت کے مرتب کرنے میں ترجیح دی گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے کہ اگر فقہ شافعی کی "مسلّمہ" (ORTHODOX) روایات مفادِ عامّہ کا ساتھ نہ دیں تو پھر فقہ شافعی کی "دوسرے درجے کی مسلّمہ" (LESS ORTHODOX) روایات کی بنا پر شرعی قانونسازی کی جائے گی۔ لیکن اگر کبھی یہ محسوس ہو کہ نفس مذہب شافعی کے مطابق قانون سازی سے مفادِ عامّہ کو نقصان پہنچ رہا ہے تو پھر دستوری حکمراں کی خصوصی اجازت سے مذاہب حنفی، مالکی یا حنبلی میں سے جو

مذہب بھی اس وقت کے مسلم مفاد کے مطابق ہوگا اُسے اپنایا جائے گا۔(ص۔ ۱۴۹) ملایا کی مسلمان آبادی ایک زمانے سے شریعت کے ساتھ ساتھ اپنے رواجی قاعدوں کو بھی قانون کا درجہ دیتی آئی ہے۔ یہ رواجی دستور جو ملایا اور انڈونیشیا میں قانون عادت (ADAT LAW) کہلاتے ہیں، اس حد تک وہاں والوں کی زندگی میں گھر کر چکے ہیں کہ ملایا کے عام مسلمانوں کو رواج اور شریعت میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ حد یہ ہے کہ اگر کبھی ایسا موقع آبھی جائے جب دوسروں کو رواج اور شریعت میں کھلا ہوا تضاد نظر آتا ہو تو ایسے موقع پر ملایا کے مسلمان عوام کی نظروں میں وہ تضاد درحقیقت شریعت اور رواج میں نہیں بلکہ ملایا کے رواج اور عربوں کے رواج میں ہوتا ہے مثلاً ملایا کے ساحلی علاقوں پر بسے ہوئے مسلمان مچھیرے صدیوں سے سمندر کی غیر مرئی دیوی کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے آئے ہیں۔ کیونکہ اس طرح اُن کے بقول سمندر کی دیوی اپنی اولاد — مچھلیوں — کو اپنے معتقدین کے قدموں میں لا ڈالتی ہے — ۱۹۵۸ء میں ریاست ترنگانو کے (عربی النسل) سرکاری مفتی نے اس عقیدے کو شریعت کے خلاف قرار دیا۔ اس فتوے سے علاقے کے مچھیروں میں ایک بددلی سی پھیلی اور انھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس موقع پر ایک چشم دید گواہ کے بیان کے مطابق ریاست کیلنتان کے ایک غیر عربی النسل مسلمان سرکاری افسر نے مفتی صاحب کے رویے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ وہ خود عربی النسل ہیں اس لئے اسلام کے نام پہ عرب کے رسم و رواج کو رائج کرنا چاہتے ہیں، ورنہ دراصل ملایا کے مچھیرے جو کچھ کر رہے وہ اسلام کے خلاف نہیں ہے[1]

رواجی قوانین کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ ملایا کی بعض ریاستوں میں قانون سازی کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ کسی بھی مسئلے میں قانون بناتے وقت اس ریاست میں رائج رسم و رواج کو بھی خاص طور سے ذہن میں رکھا جائے گا۔(ص۔ ۱۵۲)

---

[1] SHIRLE GORDON IN HIS PREFACE TO ISLAMIC LAW IN MALAYA BY DR. AHMAD IBRAHIM, ED. BY SHIRLE GORDON, SINGAPORE, 1965.

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ملایا کے مسلمان اپنی روزمرّہ کی زندگی میں قوانینِ شریعت کے بجائے اپنے رواجی قوانین کے تحت زندگی گزارتے ہیں کسی طور سے بھی دُرست نہ ہوگا۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، کرۂ ارض پر اس وقت شاید ملایا ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں شریعتِ اسلامیہ کے ایک بہت بڑے حصّے کو ریاستی قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً ریاستہائے ملایا میں قانون عادت کے مطابق وہاں کے مسلمان عام طور سے "یکزوجیت" (MONOGAMY) پر عمل کرتے ہیں۔ اگرچہ قانونِ شریعت کی رُو سے اُنھیں "کثیرالازدواجی" (POLYGAMY) کی اجازت ہے لیکن وہاں کے معاشرے کا ڈھانچہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے والا شخص اتنے زیادہ گھریلو اور "سسرالی" مصائب کا شکار ہو جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر حالات میں اُسے پہلی بیوی سے چھٹکارا ہی حاصل کرنا پڑتا ہے، جو مالی پیچیدگیوں کی وجہ سے شوہر کے لئے نہ تو آسان ہے اور نہ ہی خوش کُن۔ اس طرح صورتِ حال یہ ہے کہ اصولی طور سے ملایا کے مسلمانوں کے لئے تعددِ ازدواج جائز ہے لیکن حقیقتاً وہ یکزوجیت پر عامل ہیں۔

شریعت نے شادی کے لئے کسی عمر کا کوئی تعین نہیں کیا ہے۔ والدین یا قانونی سرپرست اپنے نابالغ بچّوں کا نکاح کر سکتے ہیں۔ اس قانون کی رُو سے ملایا کے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ جس عمر میں چاہیں شادی کریں۔ لیکن ریاستہائے ملایا میں "مسلم قانونِ ازدواج" کی رو سے ۱۳ سال سے کم عمر کی "بیوی" سے باقاعدہ جنسی تعلق قائم کرنا "ناجائز جنسی تعلق" کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ (ص ۱۸۱)

ملایا میں رائج قانونِ شریعت کی رُو سے ریاست کی طرف سے متعینہ قاضی، امام یا نکاح افسر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نکاح پڑھانے کا مجاز نہیں ہے۔ ہر نکاح کو باقاعدہ شادی کے دفتر میں درج کرانا ضروری ہے۔ چونکہ شریعت میں نکاح پڑھانے کا کام کسی ایک خاص شخص کے سپرد نہیں ہے۔ اس لئے ملایا میں اگر کوئی غیر مجاز شخص نکاح پڑھاتا ہے تو وہ نکاح تو جائز ہوگا لیکن چونکہ ایسا نکاح شادی کے دفتر میں درج نہیں ہو سکتا اس لئے متعلقہ لوگوں کو اندراج نہ کرانے کے جرم میں جیل اور جرمانے کی سزا ملے گی۔ (ص ۳۱۹) شادی کی درخواست میں اس بات کی وضاحت کرنی ہوتی ہے کہ

درخواست کنندہ کے پہلے سے بیوی موجود نہیں ہے۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں شادی کی اجازت فوراً نہیں مل سکتی۔ قاضی کی عدالت تمام معاملات کی اچھی طرح تحقیق کر لینے کے بعد اگر ضروری سمجھے گی تو دوسری شادی کی اجازت دے گی۔ (ص ۱۸۷)

ملایا کی کوئی مسلمان عورت کسی بھی غیر مسلم سے خواہ وہ کتابی ہو یا غیر کتابی، شادی نہیں کر سکتی، کیونکہ شریعت میں اس کی ممانعت ہے۔ ہاں قانونِ شریعت کے مطابق ایک مسلمان مرد کسی کتابیہ لڑکی (یہودی، عیسائی) سے شادی کر سکتا ہے مگر اس شادی کا اندراج بھی اُسے قاضی کی عدالت میں "مسلم قانونِ ازدواج" کے تحت کرانا ہوگا۔ میاں بیوی میں سے اگر ایک غیر مسلم ہو تو ایسی شادی مسلم قانونِ ازدواج کے تحت رجسٹرڈ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی "سول میرج ایکٹ" کے تحت اُسے نکاح "تسلیم کیا جائے گا" کیونکہ "سول میرج ایکٹ" کے تحت صرف وہی شادیاں ہو سکتی ہیں جن میں عورت اور مرد دونوں غیر مسلم ہوں۔ (ص-۱۹۵)

ریاستہائے ملایا نے اگرچہ قانونِ شریعت کی پابندی کرتے ہوئے شوہروں کو طلاق دینے کا حق دیا ہے لیکن اس حق کو مختلف پابندیوں کے ذریعے بہت حد تک محدود بھی کر دیا ہے۔ ملایا کے مسلم قانونِ ازدواج کی رُو سے صرف اسی طلاق کو مؤثر تسلیم کیا جاتا ہے جو باقاعدہ نوٹس دینے کے بعد قاضی کی عدالت میں دی جائے اور قاضی دونوں فریقوں کے بیانات کو سُن کر طلاق پر مہرِ تصدیق ثبت کر دے۔ (ص ۲۰۱)

منگنی کی رسم شریعت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن ملایا کے قانون عادت میں اسے خاصی اہمیت حاصل ہے۔ رواج کے مطابق نکاح سے قبل لڑکے اور لڑکی کے اعزا ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں۔ نیز شادی کے سلسلے میں مہر اور دوسرے لین دین کے معاملات طے کرتے ہیں۔ جب ایک بار نسبت یا منگنی کی رسم پختہ ہو جاتی ہے تو پھر شادی سے انکار کرنا ... رواجی قانون کے تحت بہت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نسبت پختہ ہو جانے کے بعد اگر لڑکے والے بغیر کسی معقول عذر کے شادی سے انکار کر دیں تو نہ صرف یہ کہ منگنی کی رسم کے موقع پر لڑکی والوں نے

جو کچھ تحفے کے طور پر انھیں دیا ہے، یا اس سلسلے میں جو دوسرے ضروری اخراجات برداشت کئے ہیں وہ سب لڑکے والوں کو واپس کرنے ہوں گے بلکہ مہر کی جو رقم طے ہو چکی ہے وہ بھی انھیں ادا کرنی ہوگی۔ اور اگر لڑکی والے عہد شکنی کرتے ہیں تو انھیں صرف لڑکے والوں کی طرف سے بھیجے گئے تمام تحفے واپس کرنے ہوں گے اور وہ اخراجات ادا کرنے پڑیں گے جو منگنی کے سلسلے میں لڑکی والوں نے کئے تھے (ص۔ ۱۷۵، ۱۷۶)

(۳)

مذکورہ بالا بحث سے ہمیں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ ملایا میں قانونِ شریعت صرف نکاح و طلاق کے مسائل تک محدود ہے۔ اس کے برعکس ملایا کی ریاستیں اپنے دستور کی رُو سے اس بات کی پابند ہیں کہ وہ اپنے حدود میں رہنے والے مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشے پر شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ریاست میں حکومت کی طرف سے ایک انجمن ہوتی ہے جو مختلف ریاستوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ کسی ریاست میں اسے "مجلس برائے مذہب اسلام اور رواج ملایا" کہا جاتا ہے، کسی ریاست میں "مجلس برائے مذہب اسلام" اور کہیں پر صرف "مجلس مذہب" کہا جاتا ہے۔ ملک کا دستوری حکمراں اس "مجلس" کا نگرانِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس کی منظوری کے بغیر مجلس نہ تو کوئی نیا قانون بنا سکتی ہے اور نہ کسی پُرانے قانون کو منسوخ کر سکتی ہے۔ جس طرح مختلف ریاستوں میں اس مجلس کو چند الفاظ کی کمی و بیشی کے ساتھ مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے اسی طرح اس مجلس کی ہیئت مرکزی بھی ہر ریاست میں یکساں نہیں ہے۔ مثلاً ریاست سیلانگور میں "مجلس" میں صدر کے علاوہ کم از کم سات ممبران ہوں گے۔ ممبران کے لئے یہ شرط ہے کہ ان میں کم از کم ایک ہندوستانی مسلمان ہو اور ایک پاکستانی مسلمان۔ (ص۔ ۱۵۱) ریاست نگری سمبلین میں "مجلس" حسب ذیل پندرہ افراد پر مشتمل ہوگی: ریاست کی انتظامی کونسل کا ایک ممبر جو "مجلس" کا صدر ہوگا، مذہبی معاملات کے محکمے کا صدر، مفتی ریاست، قاضی ریاست، انسپکٹر مذہبی مدارس، ریاستی قانون ساز اسمبلی کے پانچ ممبران، پانچ غیر سرکاری افراد جن میں سے کم از کم ایک ملایا کے علاوہ کسی دوسرے ملک کا مسلمان شخص ہوگا، مذہبی معاملات کے محکمے کا سکریٹری جو اپنے عہدے کی بنا پر (EX-OFFICIO) اس مجلس کا بھی سکریٹری ہوگا۔ (ص۔ ۱۴۸)

ریاست کے بیت المال کی دیکھ بھال اور آمد و خرچ کی ذمے داری مجلس کے سر ہوتی ہے۔ بیت المال کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ زکوٰۃ اور فطرہ ہے، جس کی وصولیابی مجلس کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ملایا میں سرکاری قانون کے مطابق انفرادی طور سے زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم مستحقین کو نہیں دی جا سکتی۔ نہ ہی کوئی شخص یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا سکتا ہے کہ اس پر زکوٰۃ یا فطرہ فرض نہیں ہے۔ جس طرح اس زمانے میں کوئی صاحبِ حیثیت انکم ٹیکس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا اسی طرح ملایا کے مسلمان ریاست کے دوسرے سیکولر ٹیکسوں کے علاوہ زکوٰۃ اور فطرے سے بھی نہیں بچ سکتے۔ اگر کوئی شخص مجلس کو زکوٰۃ کی رقم دینے سے انکار کرے یا کسی دوسرے کو زکوٰۃ دینے سے روکے تو قانوناً مجلس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مطالبے کی رقم اس کی جائداد سے وصول کر لے اور قانون شکنی کے جرم میں ایسے شخص کو زیادہ سے زیادہ سات روز کے لئے جیل بھیج دے یا اس پر زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم کے علاوہ ۱۰۰ ڈالر تک جرمانہ کر دے۔ (ص۔ ۳۴۷) اگر کوئی شخص مجلس کے مقرر کردہ عمال کے علاوہ کسی دوسرے کو زکوٰۃ یا فطرہ کی رقم دے دے گا تو اس پر مجلس کا مطالبہ باقی رہے گا اور اُسے دوبارہ متعینہ رقم مجلس کے بیت المال میں جمع کرنی ہوگی۔ (ص۔ ۳۴۸) ہاں اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس پر زکوٰۃ یا فطرہ کی رقم کی تشخیص غلط ہوئی ہے تو وہ باقاعدہ مجلس کے سامنے اپیل کر سکتا ہے۔ مجلس تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مطالبے کو معاف کر سکتی ہے، یا کم کر سکتی ہے، یا بڑھا سکتی ہے۔ (ص ۳۴۷)

ریاست کی تمام مساجد، مذہبی مدارس اور اوقاف کی نگرانی مجلس کے ذمّے ہے۔ اگر کوئی مسلمان لاوارث مر جاتا ہے تو اس کی جائداد کی وارث بھی مجلس ہی ہوتی ہے۔ ہر ریاست کی مجلس کے ماتحت مسلمانوں کے مذہبی امور پر نظر رکھنے کے لئے ایک "محکمہ برائے مذہبی امور" اور ایک "شریعت کمیٹی" (LEGALCOMMITTEE) ہوتی ہے۔ محکمہ برائے مذہبی امور ایک طرح سے مجلس کا انتظامی بازو ہوتا ہے اور شریعت کمیٹی دارالافتا کی حیثیت رکھتی ہے۔ ریاست کا مفتی اپنے عہدے کی بنا پر مجلس کا ممبر اور شریعت کمیٹی کا صدر ہوتا ہے۔ صدر (مفتی ریاست) کے علاوہ شریعت کمیٹی کے ممبران کی تعداد کم از کم چار اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ہوتی ہے جن میں سے دو ممبروں کو "مجلس" کا ممبر بھی ہونا ضروری ہے۔ شریعت کمیٹی کا

بنیادی کام اہم مسائل میں فتووں کا اجرا ہے۔ ملایا میں شریعت کمیٹی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو، کسی بھی شرعی یا رواجی مسئلہ پر فتویٰ دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں قانون شکنی کرنے والوں کو بعض ریاستوں میں ایک سال تک کی قید یا ۳ ہزار ڈالر تک جرمانے کی سزا مقرر ہے۔ بعض ریاستوں میں ۳ ماہ تک کی قید یا ۲۵۰ ڈالر تک جرمانے کی سزا، اور ایک ریاست میں قید اور جرمانہ دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔ (ص ـ ۳۵۵)

فتویٰ حاصل کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ شریعت کمیٹی کے سکریٹری کے پاس استفتا بھیجا جائے۔ سکریٹری اُسے شریعت کمیٹی کے سامنے پیش کرے گا۔ اگر شریعت کمیٹی کی نظروں میں اس استفتا کا جواب دینا مفادِ عامّہ کے خلاف نہ ہوگا تو وہ اس پر غور کرے گی۔ جب شریعت کمیٹی کے تمام ممبران متفقہ طور سے کوئی فتویٰ دیدیں گے تو اس فتوے کو صدر شریعت کمیٹی (مفتی ریاست) "مجلس" کی طرف سے شائع کردیں گے۔ لیکن اگر شریعت کمیٹی کے تمام ممبران فتوے سے متّفق نہ ہوں تو شریعت کمیٹی اسے "بکثرت آرا" پاس نہیں کرسکتی، بلکہ تمام کاغذات مجلس کے پاس ہدایت کے لئے بھیج دے گی۔ مجلس میں اگر وہ فتویٰ "بکثرت آرا" پاس ہوجاتا ہے تو پھر اُسے سرکاری طور سے شائع کردیا جائے گا۔ مجلس اگر کسی موقع پر ضرورت سمجھے تو خود بھی اپنے تئیں کسی خاص مسئلے پر استفتا کے بغیر فتویٰ جاری کرسکتی ہے۔ ایسے تمام فتاویٰ حکمران کی منظوری کے بعد سرکاری طور سے گزٹ میں شائع کئے جائیں گے اور وہ ریاست کے مسلمانوں کے لئے "قانون" کا درجہ رکھیں گے۔ (ص ـ ۱۴۹)

ملایا میں نہ صرف یہ کہ فرد کو فتویٰ دینے کی اجازت نہیں ہے بلکہ انفرادی طور سے کھُلم کھُلا شریعت کی تبلیغ و تعلیم اور مذہبی بحث و مباحثہ بھی قابلِ مواخذہ جرم ہے، کیونکہ شریعت کے اجراء کی تمام ذمّہ داری ریاست نے اپنے سر لے لی ہے۔ اسی وجہ سے ہم ایک طرف تو یہ دیکھتے ہیں کہ اگر مسلم والدین اپنے بچوں کو مجلس کے قرآنی مدرسے میں قرآن و دینیات کی تعلیم کے لئے نہیں بھیجتے یا ایسے مدرسوں میں بچے کی حاضری پچاس فی صدی سے کم ہوتی ہے تو باپ یا سرپرست کو ۵ ڈالر جرمانے تک کی سزا ہوسکتی ہے تو دوسری طرف ہمیں، یہ بھی نظر آتا ہے کہ اگر کوئی شخص پبلک میں مذہبی وعظ و نصیحت کی محفل منعقد کرتا ہے یا خود

اپنے ہی گھر میں اپنے خاندان کے ممبروں کے علاوہ دوسروں کو بُلا کر مذہبی بحث و مباحثہ کرتا ہے تو اُسے ۱۰۰ ڈالر جرمانے تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔ (ص - ۳۶۱) اسی طرح اگر کوئی شخص مجلس کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرتا ہے یا کسی عمارت کو مسجد قرار دے دیتا ہے تو ایسے شخص پر ایک ہزار ڈالر تک جرمانہ ہو سکتا ہے اور اس قسم کی بنائی ہوئی ہر مسجد کو، بشرطیکہ وہ کسی دوسرے غیر متعلق شخص کی ملکیت نہ ہو مجلس کے حکم سے مسمار کر دیا جاتا ہے۔ (ص - ۳۶۲) دستور کی رو سے مجلس کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ جس مسجد یا مدرسے کو چاہے اُسے عارضی طور سے یا مستقل طور سے بند کر دے۔ (ص - ۳۶۲)

مجلس کے فرائض میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ مسلمانوں میں "بدعقیدگی" یا "بے عملی" کا رجحان نہ پیدا ہونے دے۔ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعے اہل السنۃ والجماعت کے مسلّمہ عقائد، یا چاروں فقہی مذاہب میں سے کسی بھی مذہب یا مجلس کے شائع کردہ فتووں کے خلاف میدان ہموار کر رہا ہے تو پھر ایسے شخص پر باقاعدہ شرعی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ اسی طرح اگر اس قسم کا کوئی لٹریچر کسی شخص کے پاس سے دستیاب ہو تو ایسے لٹریچر کو ضائع کر دینے کے علاوہ عدالت اس شخص کو ۶ ماہ قید یا ۵۰۰ ڈالر جرمانہ تک کی سزا دے سکتی ہے۔ (ص - ۳۵۹)

مذہبی معاملات کی دیکھ بھال کے لئے مجلس کی طرف سے باقاعدہ محتسب (INSPECTOR) مقرر ہیں۔ ان کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے حلقے کے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت پر گہری نظر رکھیں؛ بلا عذر جمعہ کی نماز میں نہ آنے والوں اور زکوٰۃ و فطرہ ادا نہ کرنے والوں کے خلاف کارروائی کریں؛ حلقے کے امام کے پاس رکھے ہوئے شادی، طلاق، خلع و رجعت کے رجسٹر کی خانہ پری کی وقتاً فوقتاً جانچ کرتے رہیں؛ اپنے علاقے کے معمّر اور بااثر لوگوں سے مل کر عام حالات کا جائزہ لیتے رہیں؛ اور متعینہ وقفے سے مجلس کے سامنے اپنے حلقے کی باقاعدہ رپورٹ پیش کریں جس میں مسلمانوں کی خاندانی و اجتماعی زندگی، لوگوں کی مذہبی معلومات، مسجدوں کی حالت وغیرہ کی تفصیل درج ہو۔ (ص ۳۷۴)

اگر کوئی شخص شریعت کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتا ہوا پایا جائے تو پولیس کا کوئی آفیسر یا اس کی

غیر موجودگی میں میر محلہ یا اس علاقے کی مسجد کا امام اُسے بغیر کسی وارنٹ کے گرفتار کرکے شرعی عدالت کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔ اس قسم کے معاملات کا تصفیہ بالترتیب حسب ذیل اشخاص کرسکتے ہیں۔

۱۔ ریاست کے حکمران کی طرف سے اس قسم کی سماعت کے لئے باقاعدہ مقرر کردہ شخص، (اس کی غیر موجودگی میں)۔

۲۔ مجلس کا مقرر کردہ کوئی شخص، یا

۳۔ وکیل سرکار (PUBLIC PROSECUTOR) یا اس کا نائب، یا

۴۔ پولیس آفیسر، (یا صرف ریاست سیلانگور میں میر محلہ یا میر دیہات) یا

۵۔ علاقے کی مسجد کا امام (بعض ریاستوں میں علاقے کی جامع مسجد کا امام) یا

۶۔ وہ شخص جس نے شریعت کی خلاف ورزی ہوتے دیکھی ہے۔

اس ترتیب میں ذکر کئے ہوئے پہلے شخص کی موجودگی میں دوسرا شخص اور اس کی موجودگی میں تیسرا شخص (وغیرہ وغیرہ) مقدمے کی سماعت کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ (ص۔ ۳۷۲)

(۴)

اگر ہم اسلامی تعلیمات کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ اس دنیا میں صاف ستھری اور پُر اثر زندگی گزارنے کے لئے جس قسم کا لائحہ عمل ہمیں دیا گیا ہے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک کو شریعت کی اصطلاح میں "عبادات" اور دوسرے کو "معاملات" کہا جاتا ہے۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ عبادات کی ادائگی اور تکمیل کو فرد کے ضمیر پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور "معاملات" کا اثر چونکہ فرد سے آگے بڑھ کر سماج کے ایک بڑے حصے پر پڑتا ہے اس لئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ "معاملات" کی ایماندارانہ پابندی اور تکمیل کے لئے فرد کے اوپر سماج کا دباؤ ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ میں اگرچہ عبادات اور معاملات دونوں کی ادائگی اور تکمیل پر بہت زور دیا گیا ہے لیکن جہاں تک ان دونوں کی عدم پابندی کے بارے میں قانون سازی کا تعلق ہے،

حکم موجود ہے کہ "مسلمانو، جب جمعہ کی نماز کے لئے تمہیں پکارا جائے تو لپک کر جاؤ" (۹ : ۶۲) " لیکن اس کے بعد قرآن یہ نہیں بتاتا کہ اگر کوئی شخص اس حکم پر عمل نہ کرے تو اس کے ساتھ اس دنیا میں کیا برتاؤ کیا جانا چاہئیے۔ دوسری طرف قرآن چوری کرنے یا ناجائز جنسی تعلقات رکھنے سے نہ صرف یہ کہ منع کرتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان حرکات کا مرتکب ہوتا ہے تو پھر اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے "۔[1]

مسائلِ شریعت کی مذکورہ بالا تقسیم بظاہر جتنی سیدھی اور سپاٹ نظر آتی ہے درحقیقت اتنی ہی پیچیدہ ہے۔ اگر ہم ایک صالح معاشرے کی بنیاد ڈالنا چاہیں تو ایک مرحلہ ایسا ضرور آئے گا جہاں سماج یا ریاست اس بات پر مجبور ہوگی کہ معاملات کی طرح عبادات کی ادائگی اور تکمیل پر بھی اپنے افراد کو مجبور کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ قانون کی زبان میں ہم زندگی کے ان دو پہلوؤں کو بھلے ہی "معاملات" اور "عبادات" کے ناموں سے الگ الگ پکاریں لیکن اپنے اثر کے اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے پر اس حد تک منحصر ہیں کہ ایک کی تکمیل دوسرے کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ زندگی کے ان دونوں گوشوں کو ہم خواہ "حقوق اللہ" کہیں یا "حقوق العباد"؛ یا خواجہ نظام الدین اولیا کی زبان میں عبادات کو "طاعت لازم" اور معاملات کو " طاعت متعدی"[2] کہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ جس طرح ایک شخص "حقوق العباد" یا " طاعتِ متعدی " کو ایمانداری سے ادا کئے بغیر " حقوق اللہ " کی ادائگی نہیں کر سکتا اسی طرح "طاعتِ لازم " یا " حقوق اللہ " کی پابندی کئے بغیر "حقوق العباد " یا " طاعتِ متعدی " کی تکمیل بھی آسان نہیں ہے۔

جب ہم اس معہود ذہنی کے ساتھ ملایا میں رائج اسلامی قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر

---

[1] مثلاً چوری کے بارے میں قرآنی حکم سورہ نمبر ۵ ' المائدۃ ' آیت نمبر ۳۸ - نیز زنا سے متعلق سورہ النور نمبر ۲۴ آیت نمبر ۲ ملاحظہ ہو۔

[2] ملاحظہ ہو سیر الاولیا (ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، مرتبہ امیر خورد۔ محب الہند پریس، دہلی، ۱۳۰۹ھ ص ۱۴۱) بحوالہ ایم مجیب، دی انڈین مسلمس، لندن، ۱۹۶۷۔ ص ۱۳۱۔

آتا ہے کہ وہاں کے مسلم قانون سازوں نے شریعتِ اسلامیہ کو بحیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھا ہے۔ انھوں نے یہ نہیں کیا ہے کہ "طاعت لازم" کی ادائگی کو بالکلیہ فرد کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ملایا کا مسلمان باشندہ اگر ایک طرف اجتماعی اور خاندانی زندگی کو شریعت کے مطابق گزارنے پر مجبور ہے تو دوسری طرف وہ اپنی انفرادی زندگی میں بھی "حقوق اللہ" (روزہ، نماز، حج وغیرہ) کے لئے اللہ کے علاوہ ریاست کے سامنے بھی جواب دہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ملایا میں حقوق اللہ کی ادائگی میں کوتاہی کرنے والا شخص بھی اسی طرح ریاست کی نظروں میں مجرم ہے جس طرح حقوق العباد کی تکمیل نہ کرنے والا شخص۔

یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے کچھ جرم ایسے ہیں جن کے لئے قرآن میں سزائیں بھی متعین کردی گئی ہیں، مثلاً چوری کے لئے قطع ید (قرآن ۳۸ : ۵)، یا زناکاری کے لئے دُرّے لگانا (قرآن، ۲ : ۲۴)۔ انھیں ہم "حدود" کہتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سارے جرم ایسے ہیں جن کی سزائیں قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ ایسے جرموں کی سزا کا تعین شریعت نے ریاست ("اولوالامر") کی صوابدید پر چھوڑدیا ہے۔ اس قسم کی سزائیں تعزیرات کہلاتی ہیں۔ مسلمانوں کا عام خیال یہ ہے کہ حدود اللہ میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہیں کی جاسکتی (اگرچہ اس زمانے میں بعض مسلمان مفکرین اس بات کے قائل ہیں کہ ایک خاص حد میں رہتے ہوئے حدود اللہ میں بھی ترمیم و تبدیل کی گنجائش موجود ہے[۵۱])۔ یہ خیال کہ مسلمانوں نے اپنے سیاسی اقتدار کے زمانے میں قرآنی سزاؤں کی لفظ بہ لفظ پابندی کی ہے، تاریخی حیثیت سے درست نہیں ہے[۵۲] بہر حال یہ موقع اس بحث میں پڑنے کا نہیں ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا، لیکن اس سلسلے میں اتنی بات ذہن میں ضرور رکھنی چاہیئے کہ ماضی میں جن لوگوں نے

---

۵۱ اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کا مقالہ، "پاکستان اور قانونِ شریعت" سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" نئی دہلی جلد ۱ شمارہ ۱، ۱۹۶۹ء، ص ص ۷۹ مسلسل۔

۵۲ مثلاً شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳ - ۱۷۶۲)، اپنے زمانے کے عمالِ حکومت کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"... کیا سبب ہے کہ اس ملک میں گزشتہ ۶ صدیوں سے حدود اللہ پر عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے ...."

(تفہیماتِ الٰہیہ، جلد ۱، ص ۲۱۶)

قانونِ شریعت کی تدوین کا اہم کام انجام دیا ہے۔ خود انھوں نے "حدود اللہ" پر عمل درآمد کو مختلف حالات کے پیشِ نظر اس حد تک محدود کر دیا ہے کہ اب ان پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا انسانی استطاعت کے باہر ہے نتیجتاً ایک حساس "جج" اپنے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ ڈالے بغیر ایک چور کو جیل یا جرمانے کی سزا تو دے سکتا ہے لیکن "قطعِ ید" کے فیصلے پر دستخط کرنے کے لئے اس کا ہاتھ شاید ہی اٹھ پائے[۱] بہرحال اس بحث سے قطع نظر کہ ماضی میں قرآنی سزاؤں پر کس حد تک عمل درآمد ہوا ہے یا اس زمانے میں ان سزاؤں پر عمل ممکن ہے یا نہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ ملایا کی کسی بھی ریاست میں شریعت کی خلاف ورزی کرنے والوں کو "قرآنی سزائیں" نہیں دی جاتیں، بلکہ ہر قسم کے جرم پر خواہ وہ نظری طور پر حدود اللہ کی صف میں آتا ہو یا تعزیرات کی، صرف جیل یا جرمانے کی سزا ہوتی ہے۔ (ص ۱۹۶)

(۵)

اب ہم مثال کے طور پر چند ان حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ذکر کریں گے، جن پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ملایا کا ایک مسلمان باشندہ اپنے کو وہاں کی شرعی عدالت کے سامنے جوابدہ پاتا ہے۔

جمعہ کی نماز ملایا کے ہر مسلمان عاقل بالغ مرد کے لئے قانوناً یہ ضروری ہے کہ وہ پابندی کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کیا کرے، سوائے اس کے کہ اس کے پاس کوئی ایسا عذر موجود ہو جو ریاست کے قوانین میں "عذرِ شرعی" کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً اس کی غیر حاضری کی وجہ سخت بارش ہو، یا اس کے مکان سے قریب ترین جامع مسجد ۳ میل سے زیادہ کے فاصلے پر ہو، یا کسی خاص وجہ سے امام جامع مسجد نے اُسے غیر حاضری کی اجازت دے دی ہو، یا وہ بیمار رہا ہو، یا سفر میں ہو، یا جس علاقے میں وہ رہتا ہو وہاں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ سے کم ہونے کی وجہ سے اس علاقے کے مسلمانوں پر جمعہ کی جماعت ہی فرض نہ ہو۔ عذرِ شرعی کے بغیر جماعتِ جمعہ سے غیر حاضر رہنے والوں پر شرعی عدالت کی طرف سے (مختلف ریاستوں میں) ۱۰ ڈالر سے لے کر ۲۵ ڈالر تک

---

[۱] اس نکتے کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: احمد فتحی بہنسی کی کتاب الجرائم فی الفقہ الاسلامی، طبع ثانی، قاہرہ، ۱۹۶۲ء۔

جرمانہ کیا جاتا ہے۔ ریاست پیرک میں تو جماعت کے علاوہ خطبے میں، اور اگر نماز کے بعد وعظ ہو رہا ہو تو اس میں بھی حاضری ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ان مواقع پر غیر حاضر رہتا ہے تو اس پر ۵ ڈالر تک جرمانہ ہوسکتا ہے۔ (ص - ۳۳۱) "مجلس" کی ہدایات کے بموجب یہ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے ہی محلے یا قصبے کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرے۔ اگر کسی وجہ سے وہ اپنے علاقے کی مسجد میں حاضر نہیں ہوسکتا تو اُسے اپنے علاقے کے امام کو پہلے سے مطلع کرنا پڑے گا، ورنہ وہ نماز جمعہ سے غیر حاضر سمجھا جائے گا۔

پنج وقتہ نماز کے بارے میں کوئی وضاحت ملایا کے اسلامی قوانین میں موجود نہیں ہے لیکن اگر ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ ہر علاقے اور قصبے میں مجلس کی طرف سے محتسب مقرر ہوتے ہیں جن کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے علاقے کے مسلمانوں کی "مذہبی زندگی" کے بارے میں باقاعدہ رپورٹ مجلس کے پاس بھیجتے رہیں تو پھر یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ سزاؤں کے عدم ذکر کے باوجود لوگ عام طور سے پنج وقتہ جماعت کی پابندی کرتے ہوں گے۔

رمضان کے روزے

ملایا میں اگر کوئی مسلمان رمضان کے دنوں میں کھاتا، پیتا، یا تمباکو نوشی کرتا ہوا نظر آئے گا تو اس پر اسلامی قوانین کے تحت ۲۵ ڈالر تک جرمانہ کیا جائے گا۔ کسی بھی ہوٹل والے کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کے ہاتھ رمضان کے دنوں میں اشیائے خوردنی فروخت کرے۔ اگر کوئی ہوٹل اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا پایا جائے گا تو نہ صرف یہ کہ کھانا کھلانے والے ملازم سے باز پرس ہوگی بلکہ ہوٹل کے مالک پر بھی ۲۵ ڈالر تک جرمانہ کیا جائے گا، اِلّا یہ کہ ہوٹل کا مالک عدالت میں یہ ثابت کردے کہ اس کی واضح ممانعت کے باوجود ملازم نے یہ حرکت کی ہے۔ (ص - ۳۴۳) بعض ریاستوں کے قوانین میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ اگر کوئی مسلمان روزہ نہ رکھنے کے جرم میں ایک بار سے زیادہ عدالت میں پیش کیا جائے گا تو پھر اس پر ۲۵ ڈالر کے بجائے ۵۰ ڈالر تک جرمانہ ہوگا۔ (ص - ۳۳۵)

زکوٰۃ

زکوٰۃ اور فطرے کا ادا نہ کرنا جرم قابلِ سزا ہے۔ جن لوگوں پر یہ رقمیں واجب ہوں گی اور وہ لوگ وقت پر ادائگی نہ کریں گے تو اُن پر جرمانہ ہوگا اور ان کی جائداد کو بحقِ سرکار ضبط کر کے اس سے مطالبہ وصول کیا جائے گا۔ (۳۲۵، مسلسل) اگرچہ دوسرے مذاہب فقہیہ کی طرح فقہ شافعی بھی فرد کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے ذمّہ کی زکوٰۃ یا فطرہ کو خود ہی مستحقین میں تقسیم کر دے، لیکن ملایا میں رائج قوانینِ شریعت کی رُو سے زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم صرف ریاستی بیت المال میں جمع کی جا سکتی ہے۔ رقم اگر بیت المال میں جمع نہ کرائی جائے تو حکومت مطالبے کو "ادا شدہ" تسلیم نہیں کرے گی۔

نشہ آور اشیا

ریاستہائے ملایا میں از رُوئے قوانینِ شریعت مسلمانوں کے لئے نشہ آور اشیا کی خرید و فروخت اور اس کا استعمال قطعاً ممنوع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو (مختلف ریاستوں میں) ۲۵ ڈالر سے لے کر ۱۰۰ ڈالر تک جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے۔ ایک ریاست میں نہ صرف یہ کہ خرید و فروخت اور اس کا استعمال ممنوع ہے بلکہ اپنے پاس نشہ آور اشیا رکھنا بھی جرم ہے۔ (ص۔ ۳۲۹) ریاست جوہور کے "اکسائز قوانین" میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ لائسنس یافتہ شراب فروخت کرنے والے دوکاندار اپنی دوکانوں میں کسی بھی مسلمان کو داخل نہ ہونے دیں گے، سوائے ان مسلمانوں کے جو اپنے سرکاری فرائضِ منصبی کو ادا کرنے کے لئے اس دوکان میں داخل ہونے کے قانونی طور سے مجاز ہیں۔ اگر کسی شراب خانے میں کوئی غیر مجاز مسلمان نظر آئے گا تو ملزم مسلمان اور دوکاندار دونوں قانون شکنی کے مرتکب سمجھے جائیں گے، سوائے اس کے کہ دوکاندار یہ ثابت کر دے کہ اسے اس شخص کے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا۔ (ص۔ ۳۳۰) چند ریاستوں نے اپنے یہاں کے شراب خانوں پر یہ پابندی بھی عائد کر رکھی ہے کہ وہ مسلم یا غیر مسلم کسی بھی عورت کو ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اگر کسی شراب خانے میں کوئی ملازم عورت پائی جائے گی تو اس شراب خانے کا لائسنس ضبط کر لیا جائے گا۔ (ص۔ ۳۳۰)

ناجائز جنسی تعلقات

باستثنائے سنگاپور (ص۔ ۳۲۹)، ریاستہائے ملایا میں مسلمانوں کو اپنی بیویوں کے علاوہ کسی بھی مرد یا عورت سے جنسی تعلقات

قائم کرنا جرم ہے، اور اس کی سزا دُرّے کے بجائے جیل یا جرمانہ ہے۔ بعض ریاستوں میں جیل اور جرمانہ دونوں قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ (ص ۳۲۱ مسلسل) نہ صرف یہ کہ باقاعدہ جنسی تعلقات ممنوع ہیں بلکہ ہر وہ ایسی حرکت ممنوع ہے جو نتیجتاً جنسی تعلقات میں ممد ہوتی ہو۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان مرد یا عورت کسی غیر محرم کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں پکڑا جائے تو اُسے "خلوت" کے جرم میں ۳ ماہ تک جیل یا ۲۰۰ ڈالر تک جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے۔ (ص ۳۲۳) ریاست پیرک میں رائج قانونِ شریعت کی رُو سے، اگر کوئی شخص کسی کنواری لڑکی کو اس کے والدین یا قانونی سرپرست کی نگرانی سے بہلا پھسلا کر بھگالے جائے تو اُسے، خواہ اُس نے اُس لڑکی سے جنسی تعلقات قائم کئے ہوں یا نہ کئے ہوں، ایک سال تک قید کی سزا دی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ جرمانے کے طور پر اس شخص سے لڑکی کے مہرِ مثل کی دُگنی رقم کے بقدر رقم وصول کی جائے گی۔ (ص ۳۲۵)

تبدیلِ مذہب

تبدیلِ مذہب کے سلسلے میں ملایا کی مختلف ریاستوں میں جو قانون رائج ہے اس کی رُو سے کسی مسلمان کو اسلام چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، ہاں دوسرے مذاہب کے لوگ اسلام میں داخل ہو سکتے ہیں۔ جس شخص کے ہاتھ پر کوئی شخص اسلام قبول کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی اطلاع "مجلس" کے دفتر میں کرے۔ اور اسلام لانے والے شخص کے بارے میں پوری تفصیلات درج کرائے۔ کسی بھی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ ایک نابالغ غیر مسلم کو مسلمان کرے۔ ایک نابالغ شخص (۱۸ سال کی عمر تک) اسی وقت مسلمان ہو سکتا ہے جب اس کے والدین یا قانونی سرپرست اسے مذہب تبدیل کرنے کی اجازت دے دیں۔ ہر نیا مسلمان ہونے والا شخص جس کی عمر ۱۴ ½ سال سے زیادہ ہوگی کم از کم ۳ ماہ تک "مجلس" کی زیرِ نگرانی رہے گا اور اس عرصے کے اس کے تمام اخراجات مجلس برداشت کرے گی۔ ۳ ماہ کی مدت گزر جانے کے بعد بھی اگر وہ شخص اسلام پر باقی رہنا چاہے گا تو اُسے باقاعدہ مسلمان تسلیم کر لیا جائے گا ورنہ "مجلس" اپنے خرچ سے اُسے اُس کے والدین کے پاس واپس پہنچا دے گی۔ اگر کسی نئے مسلمان کی عمر ۱۴ ½ سال سے کم ہے تو پھر قاضی اس کے اسلام کو تسلیم نہیں کرے گا اور اُسے مجلس

کے خرچ سے اس کے والدین کے پاس واپس کردے گا۔ (ص ۳۵۰ - ۳۵۳)

(۶)

اس طرح جب ہم ملایا میں رائج قوانینِ شریعت کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ملایا کے مسلم قانون سازوں کی نظر میں قانونِ شریعت کی اہمیت کسی طرح بھی ان کے اپنے "قانونِ عادت" سے کم نہیں ہے۔ ہر اس موقع پر جہاں قوانینِ شریعت اور قوانینِ عادت میں انھیں ٹکراؤ ہوتا نظر آیا ہے انھوں نے ایک ہاتھ میں "جامِ شریعت" اور دوسرے ہاتھ میں "سندانِ عشق" کو پوری طرح سنبھال کر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ہم تعددِ ازدواج کے مسئلے کو لے سکتے ہیں، جہاں ملایا کے مسلم قانون سازوں نے شریعت کی لفظ بہ لفظ پیروی کرتے ہوئے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت مردوں کو دے دی ہے وہاں اس سلسلے میں شوہروں پر لگی ہوئی سماجی پابندیوں کی بھی اس طرح ہمت افزائی کی ہے کہ ان کے لئے عملاً دوسری شادی ممکن ہی نہیں رہ گئی ہے۔

اس سلسلے میں اتنی بات اور ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ملایا میں شریعت سے متعلق تمام قوانین صرف مسلمانوں پر نافذ ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ملایا کی بعض ریاستوں کے دستور میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم، کسی مسلمان کو، اس علم کے باوجود کہ وہ مسلمان ہے، خلافِ شریعت کام کرنے کی ترغیب دے گا یا اس سلسلے میں کسی طرح سے بھی ممد و معاون ہوگا تو ایسا غیر مسلم بھی قانونِ شریعت کی رُو سے مجرم ہوگا اور اس پر شرعی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ (ص ۳۰۵) اسی کے ساتھ ساتھ ملایا کے دستور میں اس بات کی بھی ضمانت موجود ہے کہ مسلمانوں سے متعلق شرعی قوانین ملک کے دستور کا ناقابلِ تبدیل حصہ ہیں اور ان میں کوئی بھی (سیکولر) عدالت یا حکومت کسی قسم کی بھی تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ (ص ۳۲۹)

فریدہ بیگم

اردو زبان کی تمدنی اہمیت*

کسی قوم کا تہذیب و تمدن اس کے مخصوص مزاج، رسوم و عقائد اور طرز فکر سے عبارت ہوتا ہے۔ اس طرزِ فکر کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ایک مخصوص زبان ہوتی ہے۔ زبان ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم کسی تہذیب کو اس کے فطری روپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے کسی بھی قوم کے تمدنی ارتقا اور تہذیبی نشو و نما کی جھلکیاں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ زبان ایک ایسے شخص کی مانند ہے جو اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات سے خود کو بناتا، سنوارتا اور نکھارتا ہے اور جس طرح شخصیت کو بنانے میں لچک ایک لازمی عنصر ہے اسی طرح وہی زبان مقبول عام ہو سکے گی جس کی سرشت میں لچک ہو اور جو ضرورت، مقام اور وقت کے پیش نظر خود کو بدل سکے۔

زبان اور تہذیب کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی تہذیب کسی نئی زبان کی داغ بیل ڈالتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان اور تہذیب ایک دوسرے کو اس طرح متاثر کرتی ہیں کہ دونوں کی ترقی اور وسعت کی نئی راہیں نکل آتی ہیں۔

ان امور کی روشنی میں ہم یہ دیکھیں گے کہ آیا زبانِ اردو بھی کسی قوم یا تہذیب کا آئینہ بنی ہے۔ دوسرے

---

* فریدہ بیگم نے جامعہ میں تین سال تعلیم پائی، ۱۹۶۹ء میں انھوں نے بی اے کیا۔ اب مسلم یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) کی سال اول کی طالبہ ہیں۔ یہ مقالہ انھوں نے، جب وہ جامعہ کالج میں بی اے فائنل میں تھیں، انجمن اسلام بمبئی کے ایک انعامی مقابلے کے لئے لکھا تھا اور انجمن نے انھیں چھ سو روپے کا پہلا انعام دیا تھا۔ ہم انجمن اسلام بمبئی کی اجازت اور ان کے شکریہ کے ساتھ اسے شائع کرتے ہیں۔

الفاظ میں تہذیبی و تمدنی اعتبار سے اردو زبان کسی اہمیت کی حامل ہے یا نہیں ؟

کچھ لوگوں کے خیال میں ماضی ایک ویران صحرا ہوتا ہے جہاں ہر سُو تاریکی راج کرتی ہے۔ وہاں کوئی دیپ نہیں جھلملاتا جو ان کے حال کو روشنی کی ننھی کرن ہی دے سکے۔ لیکن بعض لوگوں کو بیتے دنوں کی ہر پگڈنڈی پر چراغاں کا سماں نظر آتا ہے۔ ماضی ان کے لئے روشن اور پرنور ہوتا ہے جس کی ضیا سے وہ حال کو تابناک اور مستقبل کے لئے مزید نور کے امکانات پیدا کر سکتے ہیں۔ اردو زبان کا ماضی بھی اتنا ہی پُرنور ہے۔ گذرے ہوئے دنوں کا ہر واقعہ اردو زبان کی موجودہ صورت کی ایک اہم کڑی ہے ۔

مسلمان فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے لیکن انھوں نے اسے ایک مفتوح ملک کی طرح نہیں دیکھا بلکہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھا اور یہیں کے ہو رہے۔ وہ مقامی لوگوں سے ربط قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ اجنبیت کی دیواریں گر جائیں اور وہ فاتح اور مفتوح کے بندھن میں بندھنے کی بجائے اخوت کے اٹوٹ رشتے میں منسلک ہو جائیں۔ قرائن کہتے ہیں کہ انھوں نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ جبراً اپنی زبان یا طرز معاشرت کو مقامی لوگوں پر ٹھونسیں اور نہ ہی وہ اس بات کے خواہش مند رہے کہ دیسی تہذیب کو ختم کر دیں مقامی زبان اور ادب کو مٹا دیں، ہندیوں کے خیالوں پر پہرے بٹھائیں اور ان کے عمل پر نظر رکھیں۔ وہ ہمیشہ باہمی اشتراک کے خواہاں رہے، خواہ وہ عملی اشتراک ہو یا فکری اتحاد۔ وہ ہمیشہ اس جستجو میں رہے کہ دوسری قوموں اور تہذیبوں کی اچھی باتیں اور خوبصورت چیزیں اپنائیں اور دوسری قومیں بھی ان کی خوبیوں کی تقلید میں عار نہ محسوس کریں۔ ہر وہ خیال جس کا کوئی تعمیری پہلو ہوتا ہے، جلد یا بدیر، پیدا ضرور ہوتا ہے۔ تخریبی خیال تو بارش کی ان بوندوں کی مانند ہوتے ہیں جو دھوپ میں کچھ دیر برستی تو ہیں لیکن پھر کچھ ہی لمحوں بعد وہی کڑی دھوپ ہوتی ہے۔ مسلمان فاتحین اور مقامی ہندوؤں نے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کے لئے پہلا تعمیری قدم یہ اٹھایا کہ معاشرتی ربط و ضبط اور ملکی و کاروباری ضرورتوں کے پیش نظر ایک دوسرے کی زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے شروع کئے۔ خلوصِ نیت سے اٹھایا گیا یہ پہلا قدم تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ دو اجنبی ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ خیال کیجیے، دو مختلف تہذیبیں۔ ایک کا دھرم اصنام پرستی، دوسرے کا ایمان توحید پر یقینِ کامل۔ ایک کی رسوم دوسرے سے قطعاً جدا، ایک کا طرز معاشرت دوسرے کے لئے بالکل نیا،

لیکن اتنا فرق ہونے کے باوجود اپنے خول میں مگن رہنے کی بجائے خارجی اثرات کو صدق دلی سے قبول کرلینا تعمیری پہلو اور اثباتی نقطۂ نگاہ تھا اور ہر تعمیر میں کوئی نئی شے پوشیدہ ضرور ہوتی ہے۔ اثبات کا کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہوتا ہے اور یہ حاصل وہ بولی تھی جسے آج ہم اردو زبان کے نام سے جانتے ہیں۔

یہ زبان ایک انوکھے طرزِ فکر کا نتیجہ تھی۔ اس سرزمین پر دو مختلف قوموں کے باہمی اشتراک سے ایک مخصوص طرزِ فکر کا پودا لگایا گیا تھا پھر اس پودے میں سے ایک کونپل پھوٹی تھی جس کی آبیاری دو مختلف تمدنوں کے علم بردار کر رہے تھے، اس کونپل میں مختلف رنگوں کا ایک حسین امتزاج تھا۔ یہ رنگ عربی، عجمی ہندی تھے۔ مختلف رنگوں کی ہم آہنگی نے ایک مسحور کر دینے والا تاثر بخشا۔ عربی، فارسی اور ملکی زبان کے اختلاط سے پیدا ہونے والی زبانِ اردو کی کونپل ان قوموں کے تہذیبی اور تمدنی اتحاد کا بے نظیر نمونہ بن گئی۔ یہ تمدنی اختلاط کسی جبر کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ ایک فطری عمل تھا اور اس فطری اصول پر زبانِ اردو از خود پنپتی، سنورتی اور حالات و ضروریات کے سانچے میں ڈھلتی اور پھیلتی رہی۔ مسلمان اپنے ملک کا طرزِ فکر و احساس لائے تھے وہ شیریں و فرہاد کے دیس کے باسی تھے اور کوہِ بے ستون اور وادیٔ نیل سے ان کو جذباتی لگاؤ تھا۔ وادیٔ گنگ و جمن میں انھوں نے اپنے دیس کی وادیوں اور اس میں بکھرے تہذیب و تمدن کے پھولوں کا پرتو دیکھا اور ایک نئی زبان میں انھوں نے نغمے بکھیرنا شروع کیے اور پھر کالیداس اور سعدیؔ شیراز کی روحیں ایک ہوگئیں۔

سیاہ راتیں روشن صبحیں بنتی گئیں، ماہ و سال گذرتے گئے، سلطنتیں بنتی اور بگڑتی گئیں۔ نئے فاتحین آتے رہے، پرانے نقش و نگار باقی رہ گئے اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔ حالات یوں ہوئے کہ زبانِ اردو کی ادھ کھلی کلی دکن کے حکمرانوں کے ایوانوں کے حسن کو دوبالا کرنے لگی۔ ان حکمرانوں کو ہندوستان سے جذباتی لگاؤ تھا اور ان کی وطن دوستی بے مثال تھی۔ انھوں نے سادگی اور معصومیت کے پانی سے اس پودے کی آبیاری کی۔ دکن نے زبانِ اردو کو حسنِ سادہ و معصوم کی تصویر بنا دیا۔ انھوں نے اپنے تمدن کے ہر پہلو کو سادہ زبان میں ادا کرنے کی سعی کی —— پھر جب اس پُر بہار معاشرے پر خزاں کی زردی چھا گئی اور سیاسی انتشار زیادہ ہوگیا تو یہ حسنِ سادہ بھی کمھلا گیا۔ انھیں اپنے طرزِ تمدن سے جذباتی لگاؤ تھا وہ جاگیردارانہ نظام کے حامی تھے

انھیں زندگی سے پیار تھا اور حوصلہ و ہمت ان کا ایمان تھا۔ لیکن سیاسی پراگندگی نے ان کی روحوں کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ وہ حسرت و یاس کا مجسمہ بن گئے۔ حال ان کے لئے بیزار کن تھا اور مستقبل سے وہ شاکی تھے وہ اب بھی نغمے بکھیر رہے تھے لیکن ان نغموں کی لَے افسردہ ہو گئی تھی۔ زبان وہی تھی لیکن اس میں ایک صحتمند تمدن کی بجائے بیمار تہذیب کی روح کا کرب تھا۔ وہ جذبات جیسے بھی تھے، وہ تہذیب جو بھی تھی، زبانِ اردو اس کے نقوش کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔

دم توڑتی ہوئی تہذیبوں اور سسکتے ہوئے معاشروں کی ترجمان زبانِ اردو تھی لیکن حقیقت کی ترجمانی میں بھی ہزاروں رنگوں کی میناکاری تھی۔ بگڑتے اجڑے ہوئے تمدنی سرمائے کا ماتم تو تھا لیکن باوقار اور باشعور انداز میں۔

زبانِ اردو کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے بنا رہا اور روزمرہ کی زندگی میں ہی کسی قوم کا تمدن نہاں ہوتا ہے ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ فارسی زبان درباری اور علمی زبان تھی اور اس کی اہمیت اتنی بڑھی تھی کہ اسے تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ دوسری جانب زبانِ اردو بے نمود ذرّے سے مہر منور بنتی رہی۔ اس کی کرنیں عوام کے دلوں کو منور کر رہی تھیں۔ کسی قوم کے تمدن کے بہترین گواہ وہ گلی کوچے ہوتے ہیں جہاں عوام بستے ہیں۔ میرؔ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے زبان کی سند لینے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہاں کی زبان ایک مخصوص تہذیب کی آئینہ دار تھی وہ تہذیب دلّی کی تہذیب تھی اور اس تہذیب کی تصویر کشی کرنے والی زبان ایک مخصوص زبان تھی جو دلّی کی ٹکسال میں ڈھلی تھی جس میں سادگی بھی تھی اور پُرکاری بھی۔ اور حسنِ سادہ کی دلکشی سے کون مسحور نہ ہوگا۔ یہ اس زبان کے حسن کا جادو ہی تھا جس نے نہ صرف عوام کے دلوں کو مسحور کیا تھا بلکہ خواص کو بھی اپنے حسن کی دلکشی سے پرچا لیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں قلعہ اور بیرونِ قلعہ کا فاصلہ کم سے کم تر ہوتا جاتا تھا اور یہ زبان تیغ ہندی تھی جس کے بادشاہ سے عوام تک سب یکساں طور پر گھائل ہوتے تھے۔ اس نے دلّی کے کاخ و کو، دونوں ہی کو اوراقِ مصوّر بنا دیا تھا۔ ہر شکل تصویر کی مانند نکھری ہوئی اجلی اجلی سی تھی اور ہر تصویر کو الفاظ کی سادگی نے نیا حسن بخش دیا تھا۔ دلّی کی تہذیب اردو کے روزمرہ اور محاوروں میں سمٹ آئی تھی۔ ہر لفظ تہذیب و تمدن کے خدوخال واضح کرنے کا ایک پُرکار ذریعہ بن گیا تھا۔ سب ہی

بے چین تھے کہ اس کی شیرینی اور رس کو اپنے اندر جذب کرلیں۔ کہیں شعراء کا ہجوم تھا کہیں ادیبوں کا مجمع اور دربار کے ایوان ہائے رنگین میں بھی اس نوخیز کلی نے بار پالیا تھا۔ اسی وجہ سے اردو کے ایک نامور ادیب کے الفاظ میں "اس میں بازار، خانقاہ اور دربار تینوں کی دھوپ چھاؤں دکھائی دیتی ہے"۔

عوام کی یہ زبان بادشاہ، صوفی اور تجارت پیشہ، تینوں کا ہی مشترکہ سرمایہ بنی ہوئی تھی۔ تجارت اور عام بول چال میں پابندیاں کم ہوتی ہیں، مذہب و اخلاق کی حد بندیاں بھی زیادہ حائل نہیں ہوتیں، یہاں آسانی اور سہولت کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ پابندیوں کی غیر موجودگی میں جو شے ارتقا پذیر ہوتی ہے اس میں خاص دل نشینی ہوتی ہے۔ اردو کی دل نشینی کا باعث بھی یہی ہے کہ بازار اور روزمرہ کی زبان بنی۔ اردو کے ارتقائی دور میں بازار پر دیسی عوام کا غلبہ تھا چنانچہ انھوں نے اردو زبان کی نشو ونما میں نمایاں کردار ادا کیا۔

صوفیوں اور عالموں نے ہمیشہ اس زبان کی سرپرستی کی ہے۔ اس کے خمیر میں جو طرفہ مٹھاس ہے وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کو مؤثر بنا دیتی ہے۔ صوفیاء کرام نے مذہب اور اخلاق کا درس دینے کے لئے زبانِ اردو کا سہارا لیا کیونکہ یہ عوام کی زبان تھی۔ انھوں نے اسے ایک نئی لے سے روشناس کیا لیکن یہ لے خالص اسلامی نہ رہی بلکہ اس میں اخلاق کا عنصر غالب رہا اور اس اخلاقی عنصر کی وجہ سے (جو کسی تمدن کی واضح خصوصیت ہوتی ہے) اردو زبان میں صرف اسلامی عقائد و نظریات کی تصویر کشی ہی نہیں کی گئی بلکہ دوسرے مذاہب اور خاص طور سے ہندوستانی مذاہب اور رسوم و عقائد کا احترام باقی رہا اور اس طرح مذہبی واعظوں کے پس پردہ بھی باہمی رواداری اور بالائے مذہب و ملت سوچنے کا انداز باقی رہا۔

اردو نے سادگی و پرکاری کو اپنا شعار بنا لیا اور تکلف و تصنع سے خود کو پاک رکھا۔ بوجھل پن اور ثقالت اس سے برداشت نہ ہو سکی۔ عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ اسی وجہ سے رواج نہ پا سکے کہ وہ عوام کی بولی ٹھولی کی خراد پر کھرے ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ثقیل الفاظ کو اردو نے اپنے قالب میں ڈھال لیا اور پھر ان میں اتنی مٹھاس پیدا ہوگئی کہ وہ عوام کا ذہنی سرمایہ بن گئے۔ یہ تراش خراش اسے مزید حسن بخشتی رہی اور اس حسن کی سادگی کو پُرکار بناتی رہی۔ مختلف زبانوں کے الفاظ اردو نے کچھ ایسے مربوط انداز میں اپنائے اور انھیں اپنے مزاج کے مطابق اس طرح ڈھالا کہ پھر ان کی اصل معلوم کرنا مشکل ہوگیا

دوسری تہذیبوں کی خصوصیات کو اپنانا ہی اس کی خوبی نہیں بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر پیکرِ نو وجود میں لانا اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ زبان صرف خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ جذبات کی مصوری بھی ہوتی ہے، قوموں کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور فکر و فن میں جذبات کی دھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں۔ اردو زبان نے مختلف تہذیبوں کی دھڑکنوں کو مخصوص جذبوں کے پردوں میں چھپایا ہے اور پھر ان رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جذبات کی عکاسی تصور اور تخیل کی معاونت سے ہوتی ہے اور اس کے لیے رمزیت سے بھرپور فضا کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن رمز و اشارہ میں ٹھوس حقائق پنہاں ہوتے ہیں اور حقائق کو پیدا کرنے میں تمدن کا خاص مقام ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجیے، میر دلّی کی بربادی کا ذکر آنے پر اس کے سو بار لوٹے جانے کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں۔ ایک سادہ سے شعر کے ہلکے سے رمز میں کئی گہری سماجی (جو تاریخی بھی ہے) واقعیت پنہاں ہے۔

زبانِ اردو قدم قدم پر نئے رنگوں میں ڈوبتی گئی۔ ہر جگہ نئے نئے روپ بدلتی رہی اور ہر مقام پر اس کی فضا کے موافق ڈھلتی رہی۔ وادیٔ جمن میں یہ ایسی لہروں کی مانند نظر آتی ہے جو بڑی آہستگی، وقار اور متانت کے ساتھ اٹھتی ہیں اور پھر ایسے ہی دھیمے پن سے واپس لوٹ جاتی ہیں۔ کہیں کوئی جھجک نہیں، کوئی رکاوٹ نہیں، صرف صاف و شفاف لہریں ہیں جو مخصوص دھیمی موسیقی کی سی تانوں پر سادہ و پُرکارانہ انداز میں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

اودھ کی رنگین فضاؤں میں یہ زبان مختلف رنگوں کو اپنے اندر جذب کیے نظر آتی ہے، یہ اس کا بالکل نرالا روپ ہے۔ کہاں وہ دلّی کی گلیوں کی سادگی و پُرکاری اور کہاں لکھنؤ کے کوچوں کی رنگینی و زیبائی! وہاں روزمرہ کی زبان تھی جس میں کوئی بناوٹ نہ تھی اور یہاں ہر لفظ ایوانِ مرصع پر تاج زرنگار لگا کر صدرنشین افروز نظر آتا ہے۔ ہر سو معنی کی منقش محرابیں ہیں جہاں سے قافلۂ خیال گذرتا ہے۔ ہر جگہ تکلف و اہتمام، ہر سو رنگینی و پُرکیفی اور بادۂ رنگیں کا خمار ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ زبانِ اردو کا یہ کون سا رخ ہے؟ اس کے پیکرِ آبی کو قبائے رنگیں کس نے پہنادی ہے؟ میر نے اس وادیٔ رنگ و بو میں خود کو اجنبی کیوں محسوس کیا تھا؟

یہ سب اس لیے ہے کہ زبانِ اردو اب ایسے آغوش میں ہے جس کا آنچل رنگین ہے۔ یہ آغوش

ایک ایسی تہذیب کا ہے جس کی روح میں رنگینی و پرکیفی رچ گئی ہے۔ یہ وہ تہذیب ہے جہاں ہر سو رنگ اٹھتے ہیں اور خوشبوؤں کے طوفان اٹھتے ہیں، تصنع اور بناوٹ کی میناکاری ہر جا نمایاں ہے۔ ظاہری حسن اور حسن آداب پر نظریں ہیں، ہر شخص حال سے بے نیاز، حقیقت سے رُخ موڑ کر، خیالوں کی رنگین وادیوں میں اتر کر خیالی بادۂ رنگینی کے سرور میں ڈوب کر خود کو فراموش کر دینے میں ہی خوش نظر آتا ہے، یہی لکھنوی تہذیب کی خصوصیت ہے۔ یہاں کے لوگوں کو صاف گوئی سے گریز اور سہل انداز اپنانے میں عار ہے کہ اس میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ انھیں انفرادیت سے پیار ہے اور تکلف اور آرائش و زیبائش سے محبت، یہاں کے باشندے آزاد منش ہیں انھیں آزادی سے رغبت ہے اور پابندیوں اور بندشوں سے نفرت! اخلاقی قدروں کو وہ پسند کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک اخلاقی قدروں کا تصور کچھ اور ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر حسن کی تصویریں بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں رنگ و بو کی دنیا ہے پھر کیوں نہ ہم اس رنگ و بو کے چمن میں زندگی کے ہر شگوفے کی خوشہ چینی کریں۔ انھوں نے اپنے گرد بکھری ہوئی خوبصورتی کو الفاظ کے سینے میں اتارا اور خارجی حسن کی نقاشی کی۔ خارجی حسن کا سحر پورے معاشرے پر طاری تھا اور لکھنوی تہذیب و تمدن شوق کی مثنویوں، سرور کی پُرتکلف نثری تحریروں اور جرأت کی غزلوں سے عبارت ہے۔

عورتیں پس پردہ رہ کر تہذیب و تمدن کو بہت سی نئی چیزیں عطا کرتی ہیں۔ وہ کسی نئے تمدن کی استقامت کی امین ہوتی ہیں۔ اردو نے جس جس مقام پر رواج پایا وہاں پردے کی رسم رائج رہی اور پردے کے پیچھے ایک نئی تہذیب ایک نیا طرزِ فکر پرورش پاتا رہا۔ عورتوں میں قوتِ مشاہدہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں باریک بینی کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ امورِ خانہ داری کے علاوہ رسم و رواج اور شادی بیاہ کے امور میں بھی ان کو زیادہ دخل رہتا ہے۔ ان کا اپنا اندازِ گفتگو ہوتا ہے جس میں لطافت و نزاکت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ بہت سی باتوں کے لئے ان کے اپنے الفاظ، رمز و کنایے اور مثالیں ہوتی ہیں۔ مشکل اور ثقیل الفاظ بھی ان کی "سہولت اور آسانی" کی خراد پر چڑھ کر رواں اور سڈول بن جاتے ہیں۔ اور پھر وہ بگڑے الفاظ اس طرح زبان زد ہوئے ہیں کہ ان کی اصل کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔

عورتوں کا یہ مخصوص انداز اور طرزِ فکر بھی اردو زبان کا ایک جزو بن گیا۔ اب نہ صرف یہ کہ دربار اور بازار کے طرزِ فکر کی تصاویر اردو میں ملتی ہیں بلکہ گھریلو معاشرت کے نقش بھی اس میں موجود ہیں۔ مولوی نذیر احمد، راشد الخیری اور حالی نے اس "پس پردہ جنت" کی تصویر کشی کر کے عورت کے نازک جذبات و احساسات اور اس کے اندازِ فکر کو لفظوں کا پیرہن دے کر اردو زبان کی تمدنی اہمیت کو واضح خدوخال عطا کر دیئے ہیں۔

کتنی ہی بہاروں نے خزاں کا زرد لبادہ اوڑھا۔ کتنے ہی سورج ڈوبے اور طلوع ہوئے اور پھر — ہندوستان کے افق پر فرنگیوں کا سورج طلوع ہوا۔ . . . بے حد روشن! نہایت تابناک! !

ہندوستان کی بساطِ تجارت پر نووارد فرنگیوں کا زور ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ان کے نام کا ڈنکا بجنے لگا اور ان کے اقبال کا پرچم لہرانے لگا۔ ان کی تجارت نے سیاست کا اور سیاست نے تجارت کا روپ لے لیا اور پھر انھوں نے بساطِ سیاست پر سیاسی تجارت کا کاروبار شروع کیا۔ "شہ" ان کا مقدر بن گئی اور "مات" معصوم ہندوستانیوں کی تقدیر!

لیکن جلد ہی انھیں احساس ہوا کہ وہ اس ماحول میں قطعی اجنبی ہیں۔ کوئی ان کا منشا نہیں سمجھتا، وہ کسی کے خیال کو نہیں پا سکتے۔ انھیں ایک ایسے ذریعے کی ضرورت تھی جو انھیں ہندوستانیوں کا قرب عطا کر سکے۔ ہندوستانیوں میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں شامل تھیں۔ ان کے لئے انگریزی طرزِ تمدن عجیب و غریب تھا۔ انھیں اپنی اپنی طرزِ معاشرت سے انس تھا جو ان کا مشترکہ سرمایہ تھا جس میں حد بندیاں اور پابندیاں تھیں لیکن ہر حال میں وہ ان کا قیمتی طرزِ فکر تھا جس پر وہ کسی غیر کا سایہ بھی نہ ڈالنا چاہتے تھے۔ لیکن اب اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ہندوستانی جس قدر ان سے دور رہنا چاہتے تھے فرنگی اسی قدر ان کے قرب کے مواقع فراہم کرنے میں مصروف تھے۔ ان کا اولین مقصد ہندوستان کی دولت بہ تدبیر کھینچ لینا اور اپنی حکومت کی بنیاد ڈالنا تھا۔ ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب ان کے لئے باعثِ کشش تھی۔ یہاں کے لوگوں کی باہمی رواداری اور ایک ہی طرزِ معاشرت کا اختیار کئے رہنا ان کے لئے موجبِ حیرت تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ ملک جو رنگ برنگی قوموں کا چمن ہے۔ انواع و اقسام کے تمدنوں کا خرمن ہے۔ اس خرمن کے تنکوں کو یکجا کئے رکھنے والا ایک اہم بندھن زبانِ اردو ہے۔ ہندوستانیوں کا یہ مشترک سرمایہ ہے اور ان تک پہونچنے کا

سب سے کارآمد ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کا ہی خونِ جگر شامل ہے۔ چنانچہ فرنگیوں نے طے کیا کہ وہ ہندوستانی معاشرے اور اس کے طرزِ احساس کو سمجھنے کے لئے اسی ذریعہ کو بروئے کار لائیں گے۔ اسے سیکھیں گے اور پھر اس کے ذریعے اپنے جذبات، خیالات اور اپنا طرزِ فکر ہندوستانیوں تک بہ آسانی پہونچا سکیں گے۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ زبانِ اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے تھوڑی ہی مدت میں ایک طرف تو مقامی بولیوں کو پیچھے ہٹا دیا اور دوسری طرف اس کی قدر و اہمیت اتنی بڑھی کہ اس نے سرکاری و تہذیبی زبان یعنی فارسی کی جگہ حاصل کرلی۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کا اردو شعری سرمایہ اسی دور کے فارسی شعری سرمائے سے کہیں زیادہ پُر وقعت ہے۔ یہ ایک اور واضح مثال تھی اردو کی اہمیت اور روزافزوں ترقی کی۔ اور صرف یہی نہیں کہ اردو شعری سرمائے میں اضافہ ہوا بلکہ اس پر یعنی اردو شعر و ادب پر ہندوستانی فضا کی گہری چھاپ اور ہندوستانی تمدن کے واضح نقوش ملتے ہیں۔

انہی امور کے پیشِ نظر انگریزوں نے ایک درسگاہ "فورٹ ولیم کالج" کے نام سے قائم کی جہاں نو وارد فرنگیوں کو اردو زبان کا درس دیا جاتا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایسی کتابوں کا ترجمہ آسان زبان میں ہو سکے جن سے ہندوستان کے تمدن پر کوئی روشنی پڑ سکے۔ کالج کے پرنسپل اور معلمِ اول جان گلکرائسٹ نے اردو زبان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> "ہندوستانی زبان کا علم برٹش انڈیا میں نہ صرف ایک ایسے اجنبی کے لئے لازم و لابد ہے جو عام طور پر اہلِ ملک سے ذاتی تعلقات رکھتا ہے بلکہ اس سے فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کی تحصیل کا رستہ بھی کھل جاتا ہے جہاں وہ ہندوستانی کے ذریعے سے جو ہندوستان کے باشندوں اور خصوصاً منشیوں یا دیسی سوداگروں کی دیسی زبان ہے، ان مقامی قدیم زبانوں کو بہت جلد سیکھ لیتا ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> "علاوہ اس کے یہ ایک مشترک ذریعہ ہے جس کے توسط سے اہلِ ملک عموماً اور متعدد غیر ملکوں کے اکثر باشندے جو اس ملک میں بس گئے ہیں اپنی ضرورتوں اور خیالات کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں۔ اس بیان کی صداقت میں ہم خود ایک شہادت ہیں۔"

انگریزوں کے گہرے مشاہدے سے کون انکار کرسکتا ہے۔ وہ ہر بات کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کا فن جانتے ہیں۔ اور اردو زبان کی قدر و قیمت اور ہندوستان میں اس کی اہمیت' زندگی کے ہر میدان میں وہ ان سے بھی زیادہ واضح طور پر جان چکے تھے جن کا اوڑھنا بچھونا ہی زبان اردو تھی۔ گارساں دتاسی ۱۸۶۸ء کے خطبے میں کہتے ہیں:

"ہر چند لوگوں کا خیال ہندوستانی کی نسبت کچھ ہی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ دن بدن جو اس کی ترقی ہورہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان بھی جا سکتی ہے۔ اس مسئلے کی نسبت کپتان ایچ مور نے جو مرکزی حکومت میں ترجمان کی خدمت پر فائز ہیں اپنی رائے سے مجھے ان الفاظ میں مطلع کیا ہے۔ "بلاشبہ کچھ عرصے بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرلے گی۔ اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے جو اندرونِ ملک میں ہزارہا میل کی مسافت میں پھیل گئی ہے، ہندوستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو اور بھی ملنے جلنے کا موقع ملا ہے، چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستانی زبان اس مقصد کو بطریقِ احسن پورا کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی ساخت میں فارسی، ہندی اور عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد پورے کرے۔ میرے خیال میں ہندوستان کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات ہیں اسی قدر ہندوستانی زبان کو فروغ حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں۔"

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب ملک کا نظم ونسق ایسٹ انڈیا کمپنی سے براہ راست تاج برطانیہ کے تحویل میں آگیا اور مغربی طرزِ تمدن اپنے واضح نقوش کے ساتھ ہمارے سامنے آیا اور ساتھ ہی انگریزی افکار و خیالات بھی یہاں پہونچے تو مشرق و مغرب کے طرزِ فکر اور خیالات و احساسات کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ دونوں کی تہذیبیں جدا تھیں، تمدن مختلف تھے اور سوچ بچار کے دھارے الگ تھے۔ مغربی ادب کے دروازے ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کے لئے وا ہوئے اور غور و فکر طرز و انداز

کی نئی وادیوں کی طرف بڑھنے کی دعوت دینے لگے۔ ایسے میں زبان اردو پھر پیش پیش تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے کشادہ دلی کا ثبوت دیا اور افکارِ نو کا نور اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اردو زبان کی ربط آمیزی کی صلاحیت نے یہاں بھی معاونت کی۔ اس سے پہلے بھی اس نے اپنے اندر عربی، عجمی اور علاقائی تمدنوں کے مزاج کو سمو لیا تھا۔ ان کی زبانوں کے الفاظ، ان کے ادب کی اصطلاحات اپنے اندر اس انداز سے جذب کی تھیں کہ یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کون سا لفظ، کون سا خیال کس زبان کا ہے۔ اردو شعراء نے ایک ایسا ہندی چمن کھلایا تھا جس میں ساون کی پھواریں پھولوں کو تازگی بخشتی تھیں اور بلبلِ عجمی ان پھولوں کے حسن میں ڈوب کر عشق و محبت کا ازلی راگ الاپتا تھا۔ فارسی اور عربی فضائیں لالہ زار بنی ہوئی تھیں، اردو زبان نے اس لالہ زار سے خوشہ چینی کر لی تھی اور اردو زبان کا ادبی سرمایہ رنگ برنگی تہذیب کا مہکتا ہوا گلشن بن گیا تھا۔ مرثیہ، غزل اور قصیدہ جو خالص عربی اور عجمی اصنافِ سخن تھے، انھوں نے اردو کا پیرہن پہنا لیکن اس پیرہن پر عربی و عجمی تہذیب و تمدن کے ستارے چمک رہے تھے۔ محفلِ رقص و سرود میں ایک نوعمر خوبصورت لڑکے کا ساقی ہونا اور اہلِ محفل کا اپنی ہی جنس کے حسن میں صنفِ نازک کی خوبصورتی کا تصور کر کے اس کے حسن کے نغمے گانا، خم کاکل کی تعریفیں، خمیدہ ابرو کے تذکرے اور ساقی کی موجودگی سے محفلِ رنگ و بو کے دو آتشہ ہونے کا تصور اردو شعرا میں بھی باقی رہا۔ ساقی کا یہ تصور عجم کے اس تمدن کی طرف اشارہ ہے جس میں صنفِ نازک دبیز پردوں کے پیچھے رہتی تھی اور ان کے حسن کو شعر کے قالب میں براہِ راست ڈھالنا تہذیب و شرافت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

قصیدے میں جشنِ نوروز اور جشنِ بہاراں کا تصور بھی فارسی زبان کی شاعری نے ہی دیا۔ ہندوستان کا موسمِ بہار ساون کا مہینہ ہوتا ہے جس میں کوئل کی "کوکو" صبر و سکون کے شیرازے کو منتشر کرتی ہے اور کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو غزل کی بلبل کی نوا سنجیوں نے بھی ایک طرفہ بہار کی کیفیت پیدا کی۔

مرثیہ پر اولاً ایرانی و عربی تمدن کی چھاپ رہی لیکن رفتہ رفتہ ہندوستانی فضا اس پر اپنا اثر ڈالتی رہی۔ دو مختلف تہذیبوں کے عناصر کے امتزاج سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ ایک جانب اگر دجلہ و فرات کی کشش برقرار رہی تو دوسری طرف آبِ رودِ گنگا کا سحر طاری ہوتا گیا، یہاں تک کہ کرداروں کے نام تو

کربلا ہی کے رہ گئے مگر مرثیہ کی فضا تمام تر ہندوستانی ہی بن گئی ۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد زمانے نے ایک اور کروٹ لی تھی ۔ ایک نیا تمدن، ایک نیا طرزِ فکر ہندی اردو تہذیب کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ انگریزی تہذیب تھی جس میں چہار سو روشنیاں تھیں جنھیں جدید علوم کی روشنی نے مزید درخشندہ کر دیا تھا۔ ہر بات اور ہر خیال کو انھوں نے عقل کی کسوٹی پر کسا تھا۔ دل و دماغ کی یہ ہم آہنگی زیادہ دیرپا اور پائدار تھی ۔ انھوں نے رسوم و عقائد کی پابندیوں کو ڈھیلا کیا تھا، اپنے احساس کی حدود کو مزید وسعت دی تھی، اور اس وسعت نے انھیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اپنی تہذیب کو نئی آب دے سکیں، نئی رونق بخش سکیں ۔ انھوں نے جہانِ معنی کے طلسمی ذخیرے میں سے نئی نئی چیزوں کو نکالا اور ایک ایسے تمدن کی بنیادیں کھڑی کیں جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے لئے ایک مثال بن گیا ۔

جب انگریز ہندوستان آئے تو اپنے طرزِ فکر اور خیالات و علوم کا بیش قیمت سرمایہ بھی ساتھ لے آئے تھے ۔ ایک جانب وہ ہندوستانی تمدن کے بنیادی عناصر کی جستجو میں رہے اور دوسری جانب ہندوستانی ان کے خیال و افکار سے دلچسپی لیتے رہے ۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ انگریز محض خیال کی طلسمی وادیوں کی جانب ہی پرواز نہیں کرتا بلکہ زمین پر اتر کر حقائق کے رازہائے سربستہ کی تلاش و جستجو میں بھی سرگرداں رہتا ہے ۔ اس کی زبان محض خیال آرائی اور تخیلی اصنام پرستی کا نام نہیں بلکہ اس میں زندگی کی دھڑکنیں ہیں ۔

ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی حالات نے سبھی کو پژمردہ کیا ہوا تھا ۔ سبھی پر یاس طاری تھی اردو شعراء اسی دھن میں ساقی و میکدہ اور گل و بلبل کے نغمے گا رہے تھے لیکن اس میں نشاط کی کیفیت نہ تھی بلکہ قنوطیت کا عنصر غالب تھا۔ پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں اب اردو ادب ایک فارغ البال طبقے کی ذہنی عیاشی یا تفریح ہی نہیں رہا تھا بلکہ متوسط طبقے کی محرومی و سرشاری، دکھ درد، رنج و راحت اور نغمہ و نالہ کی داستان بن گیا تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے رنج و الم، دکھ درد اور پریشانیوں کے یہ تذکرے تو تھے لیکن ان

پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کی سچی کوشش نہ تھی۔ معاشرتی نظم ونسق کے منتشر ہونے اور طرزِ تمدن کے خستہ ہونے کا سب کو احساس تھا لیکن اس کی درستگی کے لئے ٹھوس عملی قدم کسی نے نہیں اٹھایا تھا۔ ایسے حالات میں مغربی طرزِ فکر اندھیرے میں ایک روشن کرن بن کر ابھرا۔ مغرب سے نئے افکار اور نئے انداز آئے۔ کچھ روشن خیال ہندوستانیوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی زوال آمادہ تہذیب کو اگر بچایا جا سکتا ہے تو صرف مغربی طرزِ فکر کو بروئے کار لاکر۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ساغر و بادہ کی دنیا سے باہر نکل کر حقائق کی دنیا میں قدم رکھنا ہوگا اور اس ذریعہ سے جو ابھی تک نشاطِ روح کا سامان بہم پہونچاتا تھا، خارجی ماحول کی اصلاح کا کام بھی لینا ہوگا۔ شعر و ادب کے متعلق سوچنے سمجھنے کا انداز بدل گیا تھا اور اب اس کو ایسا ذریعہ بنانے کی سعی جاری تھی جو سماجی اصلاح کر سکے۔ انہی روشن دماغ ہندوستانیوں نے یہاں کی سماجی بدحالی کی وجہ اس حقیقت میں تلاش کی کہ ہندوستانی پرانی قدروں کے دلدادہ ہیں، انھیں اپنے ماضی سے پیار ہے اور ماضی کو چھوڑ کر حال کی کسی بھی صحت مند قدر یا مفید جذبے کو اپنانے کے لئے وہ قطعی تیار نہ تھے۔ انھیں اپنے رسوم و عقائد سے جذباتی لگاؤ تھا اور مذہبی اقدار ان کے لئے نور کا مینار تھیں۔ ایک ایسے معاشرے کو جس کا ذہن دماغ اسی ڈھب کا بن چکا ہو ایک سرے سے بدل دینا ایک لاحاصل کوشش نظر آتی تھی لیکن لوگوں کی ہمتیں بلند اور ارادے پختہ رہے۔

غزل اب بے وقت کی راگنی تھی، اور ذکر شاہدِ رعنا فضول بحث۔ اب اردو زبان کو سماجی اصلاح کا ذریعہ بننا تھا۔ اردو کے مہوشوں نے پھولوں کے حسن کی بجائے اس کیچڑ کو دیکھا جس میں ایک نوعمر تمدن لت پت تھا۔ حالی نے نظموں کے سہارے، سرسید نے اپنے مضامین کے ذریعے اور نذیر احمد نے اصلاحی قصوں کے ذریعے زبانِ اردو کو ایک نیا رنگ بخشا۔ ان لوگوں نے ان حقائق کو اپنا موضوع بنایا جن سے کسی تہذیب و تمدن کے نقش و نگار بنتے اور سنورتے ہیں۔

اب تاریخ کا ایک نیا باب کھلتا ہے جس کی ابتدا سماجی شعور کی بیداری تھی اور انتہا خودی کا مکمل اعلان، جب آزادی کے رجحانات عام ہوئے تو اردو نے ہی پیش روی کی اور ملک کو "انقلاب زندہ باد" جیسا نعرہ عطا کیا۔ اس کے الفاظ میں حب وطن کا ایسا درد بھر گیا تھا کہ ہر کس و ناکس وطن پرستی کے جذبے میں

ڈوب گیا۔

اردو زبان نے ملک و وطن کی محبت کے ایسے دلکش گیت گائے کہ ہندوستانی مادرِ وطن کی حفظ و بقا کے لئے اپنے خون کی بے دریغ قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔ وطن پرستی کی آگ لوگوں کے سینے میں جل اٹھی اور عرصے تک اس کا دھواں سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لئے رہا۔ آخر کار اس دھوئیں کے بادل چھٹے اور ہم نے دیکھا کہ ہندوستان کے افق پر آزادی کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اٹھا۔ ہر سو بہار رقصاں تھی لیکن اس بہار کے پھولوں کا سینہ داغدار ہو گیا تھا۔ ایک ذہن، ایک تمدن اور ایک معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی یہ تقسیم کچھ ذہنوں کی جودت خیال کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے ایک مشترکہ قوم اور اس کے سرمائے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

زبانِ اردو جو ہندوستان کی مکمل داستان ہے — کبھی کیف آگیں کبھی کرب — جس کا ارتقا اسی خمیر میں ہوا جو ہندوستانی کہلاتا ہے ——— لیکن آج کچھ لوگوں کے تعصب اور تنگ نظری نے شاخ کو اس کے پودے سے جدا کرنا چاہا تھا ——— کچھ لوگوں نے پرجوش الفاظ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو کا تعلق ہندوستان یا ہندوستانیوں سے قطعی نہیں ہے۔ اور مباحثے ہوتے رہے، تقریریں جاری رہیں اور یہ اردو کی خوش اقبالی تھی کہ اردو کی مخالفت خود اردو زبان ہی کے ذریعہ کی جا رہی تھی۔ اردو زبان کے پھول کو اس کی شاخ سے جدا کیا جا رہا تھا لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ اس پھول کی ہر پتی اور ہر پتی کا ہر رنگ ہندوستانیوں کے دلوں میں اتر کر ایک توانا درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا اور کسی شاخ سے پھول کو نوچ کر پھینک دینا تو آسان ہے، کسی پودے کو زمین سے اکھاڑ کر پھینک دینے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن تناور درخت کو اس کی جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکنا دقت طلب مسئلہ ہے ——— اردو ہندوستانیوں کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی ہے وہ ان کا مزاج بن گئی ہے۔ ان کے طرزِ فکر کا ایک جزو لاینفک بن چکی ہے ——— اردو زبان کا پھول جب تک ہندوستانی عوام کے زیب گلو رہے گا کوئی نہ مٹا سکے گا اور اگر یہ مٹا بھی تو اس کی پتیاں خاک میں مل کر کبھی نہ کبھی دوبارہ خوشبو پھیلا دیں گی ابھر کر تمدن کا آئینہ بنیں گی۔ کیونکہ زندہ زبانیں کبھی نہیں مرتیں !!

علی عباس اُمید

خوشبوؤں کے رشتے

روز کی طرح اس کے قدم ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑ گئے۔

سورج نکلنے سے قبل چہل قدمی کرنے کا وہ شروع سے عادی تھا۔ جب سے اس کا تبادلہ یہاں ہوا تھا وہ ہر روز علی الصباح اٹھتا اور چھ بجے والی پسنجر ٹرین میں بڑی بے چینی سے آشنا چہروں کی تلاش کرتا اور پھر ٹرین کے جانے کے بعد واپس ہو جاتا۔ اب تک اس کے اس معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

آج بھی وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلیٹ فارم پر پہنچا۔ اسٹیشن کی عمارت نے خاموشی سے اس کا خیر مقدم کیا، آشنا لوگوں کا وہی جانا پہچانا تبسم، قلیوں کے نیند سے السائے ہوئے وہی چہرے اور پلیٹ فارم پر بکھرے مسافروں کے ویسے ہی چھٹ پٹ جھنڈ۔ کرنج کا وہی پیڑ اور اس کے نیچے بکھرے ہوئے پیلے پیلے دلکش پھول ـــــ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان پھولوں میں کھو جائے۔ اس درخت کے نیچے پہنچ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھولوں سے بھر لئے اور ان پر اپنا داہنا گال رکھ دیا۔ ان پھولوں کا مہکتا ہوا ملائم لمس ہمیشہ ہی اسے مسحور کر دیتا تھا، وہ تصورات میں کھو جاتا...... آج بھی اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس کے تصورات نہ جانے کن گہرائیوں میں اترتے چلے گئے اور وہ بے چین ہو کر اپنی مخصوص بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے چاروں طرف پیلے پیلے پھول بکھرے ہوئے تھے۔

ٹرین کی کرخت سیٹی نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ وہ چونک کر اٹھا اور حسب عادت ایک ایک ڈبہ میں جھانکنے کے بعد اترنے والے مسافروں کا جائزہ لینے لگا...... کوئی نہیں تھا اس کا اپنا۔ ٹرین نے پھر سیٹی دی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ ایک ایک کر کے سارے ڈبے اس کی آنکھوں کے

سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ وہ جاتی ہوئی ٹرین کو دیکھتا رہا.... دیکھتا رہا، جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

اس کا یہ روز کا معمول تھا۔ اسے ٹرین کا اس طرح آنا، کچھ دیر ٹھہرنا اور پھر آہستہ آہستہ سامنے سے گزر جانا بہت پسند تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اسٹیشن بھی ایک دل ہے جس میں کوئی آکر کچھ دیر ٹھہرتا ہے، کچھ بکھیرتا ہے، کچھ سمیٹتا ہے اور چونکہ پابندیاں اسے وہاں رکنے نہیں دیتیں اس لئے بے بسی کے عالم میں آہیں بھرتے ہوئے سینے میں آگ دبائے آگے بڑھ جاتا ہے... شاید حرکت سے ہی زندگی عبارت ہے۔ رکنا ممکن نہیں اور..... اسٹیشن پر پھر وہی اداسی پھیل جاتی ہے۔ رہ جاتی ہیں یادیں اور امید کی وہ موہوم کرن جو وقت کی تاریک پگڈنڈی کو روشن کرنے کی انتھک سعی کرتی ہے اور بکھرے ہوئے سناٹے میں ملن کے لمحوں کی خمار بھری یاد کے سہارے آنے والے پرکیف لمحوں کے انتظار کا حوصلہ دیتی ہے....

انتظار..... ان خوشگوار لمحوں کا جب کہ پھر اسی طرح ہولے سے کوئی آئے گا.... آئے گا!

ایسے ہی ایک دن اس کی زندگی میں وہ بھی تو خاموشی سے آئی تھی۔ کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی، کہیں کچھ بھی خلاف معمول نہ تھا۔ سویرے کی وہی خمار آلود ہوا تھی، وہی مسکراتے ہوئے السائے چہرے تھے، وہی پھولوں سے لدا ہوا کرنچ کا درخت تھا اور وہی اس کے نیچے بچھے ہوئے ملائم اور خوبصورت پیلے پیلے پھول ـــــ پیلے، جیسے پگھلا ہوا سونا زمین پر بکھیر دیا گیا ہو۔ بس اگر کوئی نیاپن تھا تو اتنا کہ..... اس کی پرچھائیں دو نیلی نیلی جھیلوں میں تیر رہی تھی، اس دن اس کی شبیہہ نیلے آسمان کی رومانی وسعتوں میں منعکس ہو رہی تھی۔ پیلی ساڑی میں وہ بھی انھیں پھولوں کا ایک جزو معلوم ہو رہی تھی۔ سورج کی شوخ کرنوں نے پھولوں کے علاوہ اسے بھی سنہرا کر دیا تھا۔ وہ کرنچ کے سہارے ٹکی ہوئی ان بھوری بھوری پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن کے پیچھے سے سورج کا گولہ دھیرے دھیرے ابھر رہا تھا۔ پگھلا ہوا چمکدار سونا ساری کائنات میں بکھرنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ سنہرے رنگ سے یوں دمک اٹھا تھا جیسے کسی نے بالائی میں سیندور حل کر دیا۔ اس نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے ہوش وحواس کھو گئے، قوتیں جواب دے گئیں۔ وہ دم بخود اسے دیکھتا رہا اور اس وقت چونکا جب وہ واپس جا رہی تھی۔

اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے اس نے مڑ کر اسے دیکھا، لمحہ بھر کو ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھ گئی۔

اس رات وہ سو نہ سکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایک کر کے کمرے کی دیواریں غائب ہوتی جارہی ہیں اور کمرہ پلیٹ فارم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس نے دیکھا بالکل وہی، سب کچھ ویسا ہی ..... وہی کرنچ کا پیڑ اس کے نیچے بچھے ہوئے وہی پیلے پیلے پھول اور اس کے سہارے ٹکا ہوا وہ سائیکل کا مجسمہ! وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے ذہن میں اس پورے منظر کا عکس اتنا واضح کیوں ہے اور وہ شعوری طور پر اسے بار بار دیکھنے کی کوشش کیوں کرتا ہے!

دوسرے دن پھر وہ حسب معمول چل پڑا۔ سب کچھ وہی تھا جیسے کسی کو کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ اس نے درخت کی طرف دیکھا۔ جانے کیوں اس کی آنکھوں نے ایک سونا پن محسوس کیا۔ اس کا کھویا ہوا ذہن یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ جس منظر، جس ماحول سے وہ ایک عرصے سے مانوس ہے اس میں آج سونے پن کی آمیزش کہاں سے ہو گئی۔ اس کے خیالات کا تانا بانا جلد ہی بکھر گیا۔ وہ آرہی تھی فضا میں تیرتی ہوئی، ہلکورے لیتی ہوئی جیسے موجوں کے زیر و بم کے ساتھ کنول کا پھول بہتا جا رہا ہو۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن آنکھیں ایک جگہ ٹھہر گئیں۔

وہ اسی پیڑ کے نیچے آکر کھڑی ہو چکی تھی۔ پھر ویسا ہی سورج طلوع ہو رہا تھا، آسمان کی خاموش بلندیوں میں پھر ایک گونج بھر رہی تھی، ان بھوری پہاڑیوں سے پھر دھواں سا اٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں پھر اسی کی طرف لوٹ آئیں۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں تک پلکوں کا ساتھ رہا پھر ..... پھر کسی کی نظریں جھک گئیں اور کسی کی انوکھے تخیل کی دنیا میں کھو گئیں۔ ایک بار پھر اس نے اسے دیکھا اور کہیں کوئی طوفان سا اٹھنے لگا ... کتنا خوبصورت تھا وہ طوفان بھی ... اس میں بہہ کر اسے کس قدر مسرت کا احساس ہوا تھا! ذرا بھی تو ہوش نہیں رہا اسے ..... جانے کیسے وہ اس کے نزدیک گیا، جانے کیسے اس نے اپنی ہتھیلیوں کے پھول اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے .... جانے کیسے یہ سب کچھ ہو گیا، وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ فوراً ہی مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا واپس ہو گیا۔ آج اس نے ٹرین کا

انتظار نہ کیا، شناسا نظروں کو فراموش کر کے آگے بڑھ گیا ــــ آج اس کے معمول میں فرق آگیا تھا، آج جیسے وہ امنڈ پڑا تھا.... سمندر کے ساکن سینے میں طلاطم برپا ہو گیا تھا اور آسمان کی وسعتیں اس سے بے نیاز تھیں۔

تیسرے دن کا سورج مغرب کے نیلے کینوس کو چیر کر باہر آیا، پھر وہی سنہرا چشمہ بہا اور وہ پھر اپنے معمول کے مطابق چل پڑا۔ آج اسے جانی پہچانی مسکراہٹیں نہیں دکھائی دیں، نیند سے بوجھل قلیوں کے چہرے اپنی جانب متوجہ کرنے میں ناکام رہے، وہ مسافروں کے چھٹ پٹ جھنڈ بھی نہ دیکھ سکا... اسے صرف وہ پیلے پیلے پھول دکھائی دیئے جنھوں نے اس کی زندگی میں ایک خاص اہمیت اختیار کر لی تھی۔ آج وہ منتظر تھا: انتظار میں ایک تجسس تھا، وہ کون ہے، کہاں ہے، اب تک کیوں نہیں آئی... اس کا ذہن ایسے ہی کتنے سوالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں پیلے پھولوں پر جمی ہوئی تھیں اور تصور میں تھی وہ دودھیا مورت۔ پھول دیتے وقت اس کی آنکھوں کی معصوم حیرانی، نئی کونپلوں جیسا اس کی مخروطی انگلیوں کا ملائم لمس... وارفتگی میں اس نے پھولوں سے اپنے ہاتھوں کے کشکول بھر لئے اور طمانیت کے احساس سے اس کی روح سرشار ہو اٹھی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں... کہ دفعتاً اس نے دیکھا، وہ چلی آرہی ہے.... لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ آج اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر بزرگ تھے اور ایک چھوٹی بچی بھی تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ ادھیڑ عمر شخص اس کے باپ ہیں اور بچی اس کی بہن۔ آج وہ درخت کے نیچے نہیں آئی بلکہ ٹہلتی ہوئی پلیٹ فارم کے دوسرے سرے تک چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس ہوئی۔ تینوں ایک ساتھ چل رہے تھے وہ پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا رہا۔ وہ لوگ سامنے سے گزر گئے۔ پپیہا سیوانی کی ایک بوند کے لئے ترستا رہا لیکن چنچل بادلوں کا دل نہ پسیجا۔ وہ ہوا کے دوش پر ڈولتے ہی رہے۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ پھر واپس لوٹے۔ اب کی بار وہ کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ اس کے باپ اس کے پاس سے گزرے، بچی نکلی اور آخر میں وہ آئی۔ اس پر وارفتگی کا نشہ سا چھا گیا، آنکھوں کی کوریں بھیگ گئیں، اور وہ تھوڑا لڑکھڑا گیا لیکن کچھ فیصلہ نہ کر سکا ــ اور.... اپنے ہاتھوں کے پھول اس کے راستے میں بکھیر دیئے۔ وہ آئی، ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی پھر پلک جھپکنے کے وقفے میں ایسی بات ہو گئی جس کا اس نے تصور

بھی نہیں کیا تھا اور جس نے اس کی شخصیت کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا، اس کی تنہائیوں میں جھاگ دیتی ہوئی پرانی شراب گھول دی اور ٹیسو کے سرخ پھولوں سے بھرے جنگلوں کو ایک ایسی وحشیانہ خوشبو سے شرابور کر دیا جس کی تندی ایک تیکھی لکیر بن کر اس کی رگ رگ میں اترتی چلی گئی۔ وہ اس کے پاس رکی اس کے ہاتھوں میں کچھ دیا اور پھر راستے میں بکھرے ہوئے پھولوں کو آنچل میں سمیٹ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ مسحور سا اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں کی حدود سے باہر ہو گئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی ہتھیلیوں میں کچھ کسمسا رہا ہے۔ اس نے مٹھیاں کھول کر دیکھا ـــــ پھول تھے، پیلے پیلے، کچھ تازے کچھ مرجھائے ہوئے۔ وہ بہت دیر تک انھیں دیکھتا رہا پھر بے تحاشہ چومنے لگا۔

اندر اٹھتے ہوئے طوفان کو سنبھال نہ پانے کی وجہ سے وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔ آج وہ بہت غمگین ہو گیا تھا، یادوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ کسی طرح وہ اپنے کمرے میں پہنچا اور پلنگ پر پڑ گیا۔ تکیہ کو اس نے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اوہ ـــــ آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے اپنے دل کی آواز کیوں نہیں سنی؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں..... ! وہ اپنے بالوں کو نوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر تھا۔ ساری پچھلی باتیں اس کے ذہن میں مجسم ہو اٹھی تھیں۔

وہ رات اس دیہی علاقہ پر بڑے پراسرار انداز میں طلوع ہوئی تھی، ایسی رات جو بیک وقت کئی متضاد کیفیتوں کی حامل ہوتی ہے..... اسے یاد آ رہی تھیں وہ باتیں جو طلعت کے والد طاہر صاحب نے اس سے کی تھیں۔ ہاں! طلعت ہی تو تھا اس کا نام۔ طاہر صاحب سے اس کا تعارف ہو گیا تھا، وہ بہت ملنسار آدمی تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ اپنے ایک عزیز سے ملنے وہاں آئے تھے اور چند دن قیام کر کے چلے جائیں گے۔ وہ ان سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔

اس شام بھورے آسمان پر نیلا صحرائی چاند چمک رہا تھا۔ نشے میں سرشار ہوا ادھ کھلی گلاب کی کلیوں کو چوم رہی تھی اور وہ حیا سے بار بار پتیوں کی اوٹ میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ فضا میں گیت بکھرے ہوئے تھے۔ وہ لان میں بیٹھا چنبیلی کے پودوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ پتھریلی پگڈنڈی پر وہ چھوٹا سا قافلہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ خیر مقدم کو بڑھا تو اس نے صندلی ہاتھ سلام کے لئے اٹھا دیا،

زیرلب مسکراہٹ نے اس کے معصوم چہرے کو اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ لوگ بیٹھے رہے۔ کافی کا دور چلتا رہا، موضوع بدلتے رہے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ یہ لمحے جاوداں ہو جائیں، کبھی نہ ختم ہوں لیکن جب ہولے ہولے ڈولتا ہوا چاند آموں کے جھنڈ کے اوپر آیا تو طاہر صاحب نے کہا "اچھا بھئی، اب چلنا چاہیئے۔" اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے خوشگوار خواب میں جھنجوڑ دیا ہو۔ اٹھتے ہوئے طاہر صاحب نے بتایا کہ وہ لوگ دوسرے دن شام کی ٹرین سے دہلی جا رہے ہیں۔ نہ جانے کیسے وہ بول اٹھا کہ اس کی بھی چھٹیاں کل سے منظور ہو گئی ہیں اور وہ بھی کہیں باہر جانے کی سوچ رہا ہے۔

"واہ پھر تو بہت ہی اچھا ہے، آپ چلیئے نہ ہمارے ساتھ۔ آگرہ رکتے ہوئے چلیں گے۔ بہت عمدہ رہے گا۔ میں تو خود ہی آپ سے کہنا چاہتا تھا۔ بس تو باندھیے بستر۔۔" طاہر صاحب ایک ہی سانس میں کہہ گئے اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ طلعت نے اپنی بڑی بڑی پلکوں کو اٹھا کر التجا بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی اور گلاب کی پنکھڑیاں جیسے کچھ کہنے کو بے چین تھیں۔ اس نے صاف دیکھا تھا ان ہونٹوں کی کپکپاہٹ، ان کا رہ رہ کر پھڑک اٹھنا۔

شام کو وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔

مشینی انداز میں وہ سارے کام کئے جا رہا تھا، جیسے اپنے آپ میں نہ ہو۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کیسے اس نے بستر باندھا، کیسے اسٹیشن تک پہنچا! وہ لوگ پہلے ہی سے موجود تھے۔ طاہر صاحب سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے، طلعت اسی درخت کے نیچے کھڑی تھی اور شبنم اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔

"آئیے۔ آئیے احسان صاحب!" وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انھیں بٹھاتے ہوئے اس نے کہا تھا "آپ بیٹھیے نہ، کیوں تکلیف کرتے ہیں!"

"ہم نے آپ کا ٹکٹ لے لیا ہے احسان صاحب، آپ اور نہ لے لیجئے گا۔ یہ دیکھئے۔" انھوں نے جیب سے لال رنگ کے ٹکٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا "یہ دیکھئے میرا ٹکٹ، یہ طلعت کا، یہ آپ کا اور یہ آدھا بابی شبنم کا۔" انھوں نے ٹکٹ جیب میں ڈال لئے۔

"آپ نے میرا بھی ٹکٹ خرید لیا!" اس نے پوچھا "یہ کیوں؟"

طاہر صاحب بولے "اس سے آپ کو کیا! اچھا آپ ہمارے پیسے سے سیر نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے.... آپ..... ہم کو تاج محل کے ٹکٹ خرید دیجئے گا۔" اور وہ ہنس پڑے تھے۔ ہنستے ہی ہنستے انھوں نے طلعت سے کہا تھا "دیکھتی ہو طلعت، احسان صاحب تو یوں دور بھاگ رہے ہیں جیسے کوئی اجنبی ہوں، ہمارا ان سے کوئی تعلق ہی نہ ہو......" اور اس کے بعد کی آواز ٹرین کی گڑگڑاہٹ میں کھو گئی تھی۔

ڈھیر سارا کالا کالا دھواں اگلتا ہوا انجن کھڑا ہو گیا، تمام ڈبے بھی ایک دھیمے جھٹکے کے ساتھ رک گئے۔ سیکنڈ کلاس کا ایک ڈبہ پورا خالی تھا۔ وہ سب سوار ہو گئے۔ سامان اوپر کی برتھ پر رکھ دیا گیا۔ طاہر صاحب نے اوپر ہی کی ایک برتھ پر اپنا بستر لگایا اور بولے "بھائی میں تو ہاتھ پاؤں پھیلا کر سفر کرنے کا عادی ہوں۔" اور وہ آرام سے لیٹ گئے۔ طلعت کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی، اس کے پاس ہی شبنم بھی بیٹھی۔ وہ کھڑا رہا اور باہر دیکھتا رہا۔ طلعت بھی باہر ہی دیکھ رہی تھی ـــــ کرنج کا پیڑ خاموش کھڑا تھا۔ اس کے نیچے پیلے پیلے ملائم پھولوں کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک بار اس کی نگاہیں طلعت کی طرف گھومیں، اس نے پایا کہ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کی نگاہیں ملیں اور پھر ملی ہی رہیں، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دونوں کے جذبات کا سنگم ایک ناقابل تشریح، نامعلوم نقطے پر ہو رہا ہے، اس سے اٹھتی ہوئی لاتعداد لہروں کے زیر و بم میں وہ دونوں ڈوب رہے ہوں، ڈوبتے جا رہے ہوں گہرے اور گہرے۔

انجن نے زوروں سے سیٹی دی اور ایک جھٹکے کے ساتھ پلیٹ فارم کی خاموشی بکھر گئی۔ ٹرین دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ طاہر صاحب بستر میں کوئی کتاب ٹٹول رہے تھے۔ طلعت کی نظریں جب باہر سے گھوم کر واپس آئیں تو ایک لمحے کے لئے دوبارہ اس کی نظروں سے الجھ گئیں۔ شبنم کسی کو ہاتھ دکھا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "دیکھو ہم تو گاڑی میں بیٹھے ہیں"۔ وہ بھی بیٹھا ہی رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہوا اور یکایک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی ہتھیلیوں میں سے کچھ پھول طلعت کی گود میں ڈال دئے اور لمحہ بھر کو اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبائے رکھا اور پلک جھپکائے بغیر اس کی حیران حیران غزالی آنکھوں

میں جھانکتا رہا اور پھر جھپٹ کر چلتی ٹرین سے نیچے اتر گیا۔

اس کے لاشعور میں طلعت کی جھکی ہوئی لانبی پلکوں پر کتنی ہی صبحوں کی شبنم تھرتھرا رہی تھی۔ رات بہت گہری ہو چکی ہے۔ تکیہ بھینچ کر بے ڈول ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں کی نمی بڑھتی جا رہی ہے، کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ سانس تیزی سے چل رہی ہے اور وہ سوچ رہا ہے آج کی رات گزرنی کتنی مشکل ہے؛ جب وہ زیادہ دیر تک لیٹا نہ رہ سکا تو اٹھا، قلم نکالی اور اپنے ہیڈ آفس کو درخواست لکھی تھی ـــــ میں اب اور زیادہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ مہربانی کر کے میرا تبادلہ کہیں دور کر دیا جائے ـــــ "

دھیرے دھیرے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ غیر شعوری طور پر اس کے قدم اُس جانب مڑ گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہ کرنج کے پیڑ کے نیچے کھڑا تھا۔ پیلے پیلے پھول ـــ اب بھی بچھے ہوئے تھے۔ چاندنی نے انھیں کچھ عجیب سے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ ان پھولوں کے کینوس پر اسے ایک چہرہ دکھائی دے رہا تھا اور اس چہرے پر طلوع ہو رہی تھی وہی جانی پہچانی غم سے بھرپور مسکراہٹ ...... اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں میں پھول بھر لئے اور دیوانہ وار انھیں چومنے لگا۔

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

نئے اور پرانے چراغ — از ڈاکٹر عابد رضا بیدار

سائز ۲۰×۳۰/۸، حجم ۲۶۵ صفحات، مجلد مع گرد پوش، سنہ طباعت: ۱۹۶۸ء

قیمت: دس روپے ۔ ناشر: رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۸۰۶ کلاں محل، دہلی ۶

پیش نظر کتاب میں، میر تقی میر، ربیت قلی خاں حسرت، مصحفی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی کی شخصیت اور ان کے کلام پر بحث کی گئی ہے، نیز روش صدیقی اور شاد عارفی کی شاعری کی خصوصیات اور انفرادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، چار عنوان اور ہیں، جدید اردو شاعری کی منفرد آوازیں، شرر کے خطوط، آندھی میں چراغ اور اداس نسلیں۔

کتاب کے نام اور فہرست مضامین سے کتاب کے مباحث کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے، صرف چند باتوں کی وضاحت کی ضرورت ہے ۔پہلی یہ کہ "جدید اردو شاعری کی منفرد آوازیں" کے عنوان کے تحت فاضل مؤلف نے جذبی، اختر الایمان، خورشید الاسلام، عبدالمجید حیرت، شاد عارفی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، عدم اور آل احمد سرور کے کلام کا ایسا انتخاب دیا ہے، جس میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے، یہ نام آخر میں دئے ہیں، اس سے پہلے پڑھنے والوں سے فرمائش کی ہے کہ:

"آپ آپ کو مندرجہ بالا چھ الگ الگ انتخابات میں چھ شاعروں کو پہچاننا ہے، جن کے بارے میں میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ سب کسی نہ کسی سبب سے اپنے عہد کے تمام

شاعروں کی بہ نسبت سب سے زیادہ پہچان میں آجانے والے ہیں، کیا آپ بھی ان سب کو ایسی آسانی سے اور اتنے ہی ممتاز انداز میں پہچان لیتے ہیں، جیسے انھیں میں نے پہچان لیا لیا ہے، یا اس میں میری ذاتی وابستگی کو دخل رہا ہے۔"

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر بنیادی طور پر ایک ناول نگار ہیں، مگر اس کتاب میں ان کے خطوط پر بحث کی گئی ہے۔ شاید ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کے خطوط سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہیں، اس لیے فاضل مؤلف کو ان کے چھ خطوط ملے تو ان کو یہاں درج کر دیا، ورنہ شروع میں ان کی ناول نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ ان خطوط کے بارے میں بھی فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ "ان خطوط میں مولوی عبدالحلیم شرر نہیں صرف ناول نگار شرر ملے گا، یہ خط پڑھنے کے بعد "بدر النسا کی مصیبت" کے مصنف کا ذہنی پس منظر سمجھ میں آجاتا ہے اور اس کے بعد کے ناولوں کے اجزائے ترکیبی کا ایک جز مل جاتا ہے۔" (صفحہ ۲۱۹)

"آندھی میں چراغ" خواجہ غلام السیدین صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے، جسے اس کتاب کا موضوع بحث بنانے کا جواز شاید فاضل مولف کی یہ رائے ہے کہ "اردو میں یہ پہلی کتاب آئی ہے جس پر میں فخر کر سکتا ہوں کہ میری زبان میں آزادی کے بعد ایک ایسی کتاب بھی وجود میں آئی جو دل کے خون سے لکھی گئی ہے۔" (صفحہ ۲۳۷)

"اداس نسلیں" عبداللہ حسین صاحب کا لکھا ہوا ایک پاکستانی ناول ہے، جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا، اور جسے پانچ ہزار کا آدم جی انعام ملا ہے۔ اس ناول کا موضوع وہ نسل ہے "جس نے جلیان والا باغ اور نمک سازی کی تحریک دیکھی، جس نے ہندوستان میں صنعتی دور کو اور پھر اس کی برکتوں اور لعنتوں کو پھیلتے ہوئے دیکھا، کالخانہ اور کارخانہ دار کو دیکھا۔ اور وہ نسل جو تقسیم ہند کے بعد ہندوستان سے جانے والے قافلوں کے ساتھ ہلکا سا شعور لے کر گئی اور پھر پاکستان جاکر اس کا پورا شعور پروان چڑھا، جوان ہوا اور ادھیڑ ہونے لگا۔" (صفحہ ۲۵۵) فاضل مولف نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ:

"یہ نسلیں جو اداس ہیں، ان کی اداسی اسی لئے ہے کہ ان کی محبت کا تصور "پہلی نظر کا تیر" بدل گیا

ہے، اس میں گہرائی اور گیرائی آگئی ہے، جو نتیجہ میں اپنے ساتھ اداسی لائی ہے، ان کا زندگی کا تصور سب میں تشکیک ہے، کوئی بنیاد نہیں، کوئی عقیدہ نہیں، جو ان کے دلوں کو تقویت دے سکے، مذہب پر عقیدہ یا کم سے کم تہذیب کے جزو کی حیثیت سے مذہبی اقدار و روایات کی تحسین کوئی بنیاد مہیا کر سکتے تھے، سو یہاں یہ بھی نہیں۔" (صفحہ ۲۵۹)

انسانوں کی دنیا میں تو ناموں کی اکسانیت بہت ملتی ہے، مگر کتابوں کی دنیا میں اکسانیت اور مشابہت اتفاقی ہوتی ہے، لیکن بیدار صاحب نے اپنی اس کتاب کا نام جان بوجھ کر وہ رکھا ہے جو ایک مشہور ادیب کی مقبول کتاب کا نام ہے۔ بیدار صاحب اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں جسے آپ چاہیں تو شاعرانہ بھی کہہ سکتے ہیں: "ہمارے یہاں اردو میں یہ کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی کہ دو چار سال میں یا دس بیس برس بعد کسی پیش رو کتاب کا نام چرا لیا جائے، اسی طرح کی یہ چوری میں نے بھی کی ہے، مگر ایک فرق کے ساتھ یہ دراصل اعتراف ہے اس فیضان کا جو اردو تنقید کی ایک کتاب "نئے اور پرانے چراغ" سے مجھے پہنچا ہے۔ کتاب کو پڑھے اٹھارہ بیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے، مگر اس کے مضامین نے ذہن کو اس درجہ سحر زدہ سا کر دیا تھا کہ جب سے یہ نام برابر مجھے ہانٹ کرتا رہا ہے جیسے کوئی دلآویز خوشبو، کوئی خوبصورت یاد، کوئی بے غرض نیکی، کوئی بے میل خلوص۔ اور میں یہ نام اس کتاب پر ثبت کر کے اپنے ذہن کو اس کی مستقل زد میں رہنے سے بچا لے جانا چاہتا ہوں۔" اخباروں اور رسالوں کے ناموں کی اکسانیت اور مشابہت سے بچنے کے لیے حکومت کو قانون بنانا پڑا اور نئے اخبارات اور رسائل نکالتے وقت حکومت سے ناموں کی منظوری لینی پڑتی ہے، جس میں بسا اوقات مہینوں وقت لگ جاتا ہے۔ اگر بیدار صاحب کی طرح دوسرے ادیبوں کو بھی دوسری کتابوں کے نام پسند آ گئے اور انھوں نے مشہور اور مقبول کتابوں کے نام رکھنا شروع کر دئے تو حکومت کو کتابوں کے ناموں کے لیے بھی ممکن ہے کہ قانون بنانا پڑے، اس لیے اچھا ہے اس "چوری" کو نظیر نہ بنایا جائے۔

نوائے سرور   مرتبہ: ڈاکٹر حکم چند نیّر

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۴۰ صفحات (مع پیش لفظ)، مجلد مع گرد پوش، سالِ اشاعت: ۱۹۹۲ء

قیمت: چھ روپے   ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

درگا سہائے سرور جہان آبادی، اردو کے خوش گو اور خوش فکر شاعروں میں سے ہیں، ان کی قومی اور وطنی نظمیں بے لوث اور مخلصانہ جذبات و خیالات کی حامل ہیں اور بقول نیاز فتحپوری "سرور ان شاعروں میں سے تھے جنھوں نے موجودہ دور شاعری کی طرح ڈالنے میں حصہ لیا تھا اور جن کی خدمات کو اردو زبان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔" افسوس کہ سرور اردو کے ان ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں جن کی زمانے نے کما حقہ قدر نہیں کی اور وہ بڑی حد تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر حکم چند نیّر ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سرور کے کلام کا انتخاب کر کے اور ایک طویل اور مبسوط پیش لفظ لکھ کر "نوائے سرور" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ فاضل مرتب نے پیش لفظ میں سرور کی شاعری پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اختصار کے ساتھ ان کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حالات زندگی کے سلسلے میں لکھا ہے:

"درگا سہائے سرور دسمبر ۱۸۷۳ء میں جہان آباد کے ایک معزز کائستھ سکسینہ خاندان میں پیدا ہوئے جو شاہجہاں کے عہد میں دلّی سے یہاں آ کر آباد تھا۔۔۔ ۱۸۹۹ء میں ان کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا۔۔۔ اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ (پائے) تھے کہ ۱۹۰۵ء میں ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا اور ۱۹۰۶ء میں ان کا اکلوتا بیٹا بھی انھیں داغ مفارقت دے گیا۔ سرور پر رنج وغم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، (اس کی تاب نہ لا کر) ایک عظیم شاعر طبعی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے سینتیس سال کی عمر میں ۳؍ دسمبر ۱۹۱۰ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا" (صفحہ ۱۰ اور ۱۱)

فاضل مرتب نے سرور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

سرور کی شخصیت اور شاعری میں غیر معمولی عظمت اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ وہ گنتی کے ان شاعروں میں سے تھے، جنھیں اپنی زندگی میں کبھی معاصرانہ چشمکوں اور رقابتوں سے واسطہ پڑا اور نہ انھیں بدگوئی، فرقہ پرستی اور فسطائیت کے طعنے سننے پڑے۔۔۔۔ سرور کے کلام کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی، خواص ان کے فن کی قدر کرتے تھے، معاصر شعراء ان کی سخن گوئی اور

شیوہ بیان کے قائل تھے، اگر قبول عام کو کسی شاعر کی عظمت کا معیار ٹھہرایا جا سکتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سرور کو اپنی زندگی میں ایسی مقبولیت حاصل تھی جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے"۔ (صفحہ ۷)

سرور نے حالات سے مجبور ہو کر اپنا بہت سا کلام شاکر میرٹھی کو حقیر معاوضہ پر دیدیا تھا۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل ہے، جس میں تفصیل سے اس مسئلے پر بحث کی گئی ہے اور ان نظموں کا انتخاب دیا گیا ہے جو شاکر میرٹھی کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔

نمونے کے طور پر چند اشعار ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک نظم کا عنوان ہے "عروس حب وطن" شاعر کے جذبات ملاحظہ ہوں:

ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو نہ تیری تلاش ہو — پھوٹے وہ آنکھ جس کو نہ ہو تیری جستجو
وہ گھر ہو بے چراغ جہاں تیری ضو نہ ہو — وہ دل ہو داغ جس میں نہ ہو تیری آرزو
دنیا و آخرت میں نہ انجام ہو بخیر — تیرے سوا جو غیر کی ہو مجھ کو جستجو
حوروں پہ میں مروں تو جہنم رسید ہوں — کافر ہوں میں جو مجھکو بتوں کی ہو آرزو
ناقوس اور اذاں میں نہیں قید کفر و دیں — اُس کے لیے کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو
گنگا نہائے شیخ اگر تیرا اذن ہو — تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو

جلوہ نہ ہو کسی بت رعنا کے سامنے
وہ دن خدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو

"شہر آشوب" کا ایک بند ہے:

ہوائے دہر کی بگڑی ہے کچھ عجب تاثیر — ریاض قوم ہے اب انقلاب کی تصویر
وہ طائران چمن زاد تھے جو خوش تقریر — ترانہ سنجی کے باعث ہوئے قفس میں اسیر

غریب قید میں شام و سحر تڑپتے ہیں
قفس میں بند ہیں بے بال و پر تڑپتے ہیں

سرور نے اپنے وطن کے مستقبل کی بڑی شاندار تصویر بنائی تھی۔ کہتے ہیں:

پھولوں کا گنج دل کش بھارت میں اک بنائیں
حبِ وطن کے اس میں پودے نئے لگائیں
خونِ جگر سے سینچیں ہر نخلِ آرزو کو
اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں
ایک ایک گل میں پھونکیں روحِ شمیمِ وحدت
اِک اِک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں
فردوس کا نمونہ ہو اپنا گنج دل کش
سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں

پھولوں کا دل ربا ہو منظر ہر اک روش پر
گلچیں نہ ہو چمن میں کانٹے نہ ہوں غلش پر

(عبداللطیف اعظمی

egd. No. D - 768 January, 1970

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

سالانہ چندہ
چھ روپے

شمارہ ۲	بابت ماہ فروری ۱۹۷۰ء	جلد ۶۱

فہرست مضامین

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون: اڈیٹر: ۷۴۲۵۸
منیجر: ۷۷۴۷۰

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی

مطبوعہ: یونین پریس دہلی

ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

دسمبر کی آخری تاریخوں میں بمبئی میں جو اردو کنونشن ہوا وہ اس لحاظ سے کامیاب کنونشن کہا جا سکتا ہے کہ پہلی بار ہندوستان کی سبھی زبانوں کے ادیبوں اور مصنفوں نے ایک آواز ہو کر اردو زبان کے جائز حقوق کی حمایت کی ۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں جو میمورنڈم پیش کیا گیا اس پر سبھی زبانوں کے نمائندوں کے دستخط تھے، میمورنڈم پیش کرنے سے پہلے کنونشن کے صدر اور اردو اور ہندی کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے اپنے مخصوص انداز میں اردو کی کہانی اور اردو کی بپتا اردو ہی کی زبان سے سنائی، سارے مجمع پر اس کا اثر ہوا اور محترمہ وزیر اعظم صاحبہ بہت زیادہ متاثر نظر آئیں ،لوگوں کا خیال تھا کہ اپنی تقریر میں وہ صاف صاف لفظوں میں اردو زبان کو اس کا جائز حق دلانے اور دینے کا کوئی وعدہ کریں گی لیکن مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے بہت سے مندوبین کو مایوسی ہوئی جب انھوں نے اس طرح کا کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی یقین دلایا۔ لیکن جو لوگ سمجھ دار تھے انھوں نے ان کی تقریر کو بہت پسند کیا ظاہر ہے کہ مسز اندرا گاندھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ کوئی میمورنڈم پاتے ہی اس سے متعلق کوئی وعدہ کر لیں ہمیں اس کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔

مسز اندرا گاندھی نے پہلے تو افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ وہ اردو پڑھ لکھ نہیں سکتیں۔ انھوں نے ایک بار جیل میں اردو سیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن انتظامیہ کی طرف سے جو صاحب انھیں اردو سکھانے پر مقرر ہوئے وہ خود اردو نہیں جانتے تھے ، پھر اس کا موقع نہیں ملا ۔ انھوں نے اردو زبان کی تعریف کی اور اسے برملا کہا کہ یہ ملک کے کروڑوں انسانوں کی زبان ہے اور اسے اس کا جائز حق

ملنا چاہیئے، لیکن اس کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی، اردو والے اپنی کوشش کریں اور اس جدوجہد کو ایک عوامی تحریک بنا دیں، میں اپنے طور پر پوری کوشش کروں گی۔ مجموعی طور پر ان کی تقریر اچھی اور حقیقت پسندانہ تھی اس لئے سنجیدہ طبقہ میں پسند کی گئی۔

مسز اندرا گاندھی نے اپنی تقریر میں عوامی تحریک کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس بات نے پنڈت آنند نرائن ملّا کو حیرت میں ڈال دیا جنھوں نے میمورنڈم کا پہلا مسودہ تیار کیا تھا اور ایک روز قبل مندوبین کے اجلاس میں اس مسودہ کو پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہمیں اردو کے حق کی لڑائی میز پر لڑنی ہے، میدان میں نہیں، مندوبین کی خاصی بڑی تعداد نے ملّا صاحب کے اس موقف کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ میز کی لڑائی لڑی جا چکی، اب تو میدان میں اترنا ہوگا، ان لوگوں نے مسز گاندھی کی تقریر کو اپنی جیت تصور کیا اور بعض لوگوں نے تو اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا۔ لیکن جیسا کہ معلوم ہے اُردو والے نہ تو میز کی لڑائی لڑیں گے اور نہ میدان کی، کیونکہ وہ عمل کے بجائے ردعمل کے زیادہ قائل ہیں اور وہ بھی وقتی اور زبانی۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ کنونشن کے بعد کسی ایسے گروپ یا کمیٹی کے قیام کی اطلاع نہیں ملی جو کنونشن کے مقاصد کو آگے بڑھانے اور اردو کا حق دلانے کی مسلسل جدوجہد کرتی رہے۔

اس کنونشن میں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، جناب عبدالحق خاں صاحب پرنسپل جامعہ ہائر سکنڈری اسکول اور راقم الحروف نے شرکت کی، کنونشن کے بعد ہم لوگ جامعہ کے جشن زریں کے کام کے سلسلہ میں جو انشاء اللہ آئندہ اکتوبر میں منایا جائے گا، بمبئی میں رُک گئے، یہ جان کر خوشی ہوئی کہ شہر بمبئی نے جس نے جامعہ کی سلور جوبلی (۱۹۴۶ء) کے موقع پر ذاکر صاحب مرحوم کی بہت مدد کی تھی، جامعہ کو فراموش نہیں کیا ہے، یہاں کے تعلیمی و صنعتی حلقے، مسلم اور غیر مسلم اسے ایک اچھا ادارہ سمجھتے ہیں اور اس کی مدد کے لئے آمادہ ہیں، اب بمبئی میں جامعہ کے قدیم طالب علموں کی تعداد خاصی ہے، سلور جوبلی کے موقع پر اتنی نہیں تھی، پہلے کی طرح اس بار بھی جناب معین الدین حارث کا مکان اور دفتر (دفتر روزنامہ اجمل) ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اُن کی قوت عمل اور شہر بمبئی سے متعلق ان کی

بے پناہ واقفیت اور اہل بمبئی میں اُن کی قابل رشک مقبولیت ـــــ یہ سب ہمارے لئے وقف تھی اور وقف رہے گی، جامعہ کے ایک اور قدیم طالب علم سید معین سیف اللہ اس وقت بمبئی میں ہیں، وہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک جامعہ کالج کے طالب علم تھے، انھوں نے اپنی محنت، صلاحیت اور دلکش شخصیت کی بنا پر اپنے لئے ایک نمایاں جگہ بنالی ہے، انشاء اللہ وہ اور ترقی کریں گے۔ انھوں نے ہماری بہت مدد کی اور مادر علمی کی بے لوث خدمت کا حق ادا کردیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ ان کے علاوہ مدرسۂ ثانوی کے دو قدیم طالب علم مرزا شفیق بیگ اور نواز محمد نے بھی بہت مدد کی، یہ دونوں نوجوان اپنا کاروبار کر رہے ہیں اور کامیاب ہیں۔ بزرگوں میں جناب مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی، صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل جناب شہاب الدین دسنوی صاحب، جناب عبدالرزاق صاحب جامعی اور جناب مبارک حسین صاحب نے جن کے دو بچے اس وقت جامعہ میں زیر تعلیم ہیں، ہمارا ہاتھ بٹایا، ہمت بندھائی اور مفید مشورے دئے، شیخ الجامعہ صاحب تو حارث صاحب کے یہاں مقیم تھے اور ہمارا قیام صابو صدیق میں تھا، وہاں کے عملے نے خاص طور سے لائبریرین خواجہ معین الدین صاحب اور عبدالودود صاحب اور عبدالقیوم صاحب نے ہر لحاظ سے ہمارے آرام کا خیال رکھا، ہم ان کے ممنون ہیں۔ بمبئی کے قیام کے زمانے ہی میں دو تین روز کے لئے میں اور عبدالحق صاحب مالیگاؤں گئے، وہاں بھی جامعہ کے پڑھے ہوئے کئی طالب علم اور جامعہ کے ایک قدیم بہی خواہ اور مددگار جناب مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب ہیں۔ جامعہ کے پرانے طالب علموں نے ہمارا خیال رکھا، اُن کے ذریعہ فراہمی چندہ میں کافی مدد ملی، مولانا النعمانی صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ مالیگاؤں سے جامعہ کے لئے بہت کچھ کریں گے۔ مالیگاؤں میں مسلمانوں کی خوشحالی سے بڑا اطمینان ہوا لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ لوگ اس طرح کاروبار میں الجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم و تہذیب کے کاموں کی طرف بہت کم توجہ ہے، ایک حلقہ ہے جس میں بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن یہ بہت چھوٹا حلقہ ہے، پھر بھی امید ہے کہ جلد ہی وہاں تعلیمی کام خاصے پیمانے پر ہوگا۔ مالیگاؤں میں جامعہ کے سبھی طالب علموں اور خاص طور سے محمد غفران، عبداللطیف اور عبدالقدوس وغیرہ نے ہماری ہر طرح مدد کی، انھوں نے ہمیں ایک بار پھر آنے کی دعوت دی ہے۔

بمبئی میں جامعہ کے قرنِ اول کے ایک استاد، مربی اور ہمدرد رہتے ہیں، اُن سے پورا ہندوستان ہی نہیں بلکہ باہر کی دنیا بھی واقف ہے، ذاکر صاحب مرحوم کے اُن چند دوستوں میں ہیں جو باقی ہیں اور ہمارے لئے تقویت اور ہمت کا باعث ہیں ــــــ وہ ہیں ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید (سپلا لیبوریٹریز کے مالک اور رُوحِ رواں)، ہماری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور انھوں نے فراہمی عطیات کے سلسلہ میں بہت مفید مشورے دئے، سپلا کی طرف سے مدد کا وعدہ کیا اور دوسرے ذرائع سے فنڈ جمع کرنے کا یقین دلایا۔

ہماری خوش قسمتی سے وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ۱۶ جنوری کو جامعہ تشریف لائے، اُن کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا جس میں جامعہ کے سارے استاد اور کارکن جمع تھے۔ اس موقع پر انھوں نے ایک مختصر لیکن بہت اچھی تقریر کی۔ جامعہ سے اپنے قدیم تعلق کا ذکر کیا اور ہم سب کو زندہ رہنے، جامعہ کے کام کو ترقی دینے اور اس کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے گُر بتائے، ان کی تقریر میں بڑی رجائیت تھی، تعجب ہوتا تھا کہ ستر سال کا ایک بوڑھا شخص کس قدر توانائی رکھتا ہے کہ ملکی حالات کی ناسازگاری اسے مایوس نہیں کر پاتی اور وہ ایک روشن مستقبل کا یقین رکھتا ہے، ایک عرصہ کے بعد وہ جامعہ کے استادوں اور کارکنوں سے اس طرح ملے تھے، بات بات سے خوشی ٹپکی پڑتی تھی جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ ہم سب بھی بہت خوش ہیں کہ خواجہ صاحب جامعہ تشریف لائے اور اپنی حکیمانہ باتوں سے ہمارے دامن کو عزم اور ارادہ کی دولت سے مالا مال کر گئے۔

پروفیسر محمد مجیب

گرونانک

بزرگوں کے ذکر میں شریک ہونا بڑی خوش قسمتی، بڑی سعادت ہے، اور میں اس جلسے کے منتظموں کا بہت شکرگذار ہوں کہ ان کی بدولت مجھے اس کا ایک اور موقع ملا۔ مجھے سب سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے گرونانک کے بارے میں پڑھنے کی ہدایت کی، اور پھر میں گروجی کی پانچ سو سالگرہ کی تقریبوں کے دوران میں جو کچھ معلوم کرسکا تھا بیان کرتا رہا۔ اب دیکھتا ہوں کہ اس بیان اور فکر کی وجہ سے دل اور دماغ کو ایک آزادی، ایک فرحت ملی ہے جو پہلے نصیب نہ تھی، اور توحید الٰہی جو گرونانک کی تعلیمات میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور جس سے جستجو کی ابتدا ہوتی ہے دل میں نئی نئی کیفیتیں پیدا کرتی رہی ہے۔

ہمارے یہاں اب دل کا اور دل کی باتوں کا چرچا بہت کم ہو گیا ہے، عاشق بہت ہیں، معشوق بہت مگر عشق اور اس کی لذتوں کے قدرشناس ڈھونڈھے نہیں ملتے، بتوں اور بت پرستوں کے ہجوم ہر طرف نظر آتے ہیں، پرستش اور عبادت کے آداب بھلا دئے گئے ہیں۔ بزرگوں کا ذکر بھی ایک رسم ہے جسے ادا کرنے میں بہت سے لوگ شریک ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ انھیں رسموں کو ادا کرنے کا شوق ہے یا اس میں کوئی فائدہ ہے، یا ان کے خیال میں اس سے قومی یک جہتی بڑھتی ہے۔ گھروں میں مذہب کی تعلیم نہیں دی جاتی، بچوں کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ہندو ہیں یا سکھ یا مسلمان یا عیسائی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبوں کا فرق تو باقی رہتا ہے مگر کوئی اپنے مذہب کو بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم نے یہ خیال پھیلا دیا ہے کہ مذہب صرف مذہبی لوگوں کے لئے ہوتا ہے، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے نہیں ہوتا۔ اب ہمارے پڑھے لکھے مذہبی رسمیں ادا بھی کرتے ہیں تو اس میں جو خلوص اور سچائی ہونی

چاہییے وہ نہیں ہوتی، اور تعلیم کا ہماری مذہبی زندگی پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔ دوسری طرف وہ لوگ جو دل سے مذہبی ہیں آج کل کی دنیا کے حالات اور نئے زمانے کی ضرورتوں سے واقف نہیں ہیں، لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں، اور علم اور مذہب آج کل کی زندگی میں کسی قسم کا ربط یا سمبندھ قائم نہیں کر سکتے۔ مگر شاید یہی زمانہ جب ہر ایک اپنے طور پر گمراہ ہے، گرونانک کی تعلیمات کا پرچار کرنے کے لئے مناسب بھی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے مذہبی لوگ اسے مانیں یا نہ مانیں، کہ اب علم کا، سائنس کا راج ہے، اور کوئی بات جو عقل کے خلاف ہو اب جی پر نہیں پڑتی۔ گرونانک بھی اپنے زمانے میں ان عقیدوں اور رسموں کی تردید کرتے رہے جو عقل کے خلاف تھیں۔ آپ کو یاد ہوگا وہ دورہ کرتے ہوئے ہردوار تشریف لے گئے تھے اور ایک روز صبح کو انھوں نے دیکھا کہ لوگ دریا میں کھڑے منتر پڑھتے ہوئے سورج کی طرف سیدھے ہاتھ سے پانی اچھال کر پھینک رہے ہیں۔ گرونانک نے جا کر بائیں ہاتھ سے پچھم کی طرف پانی پھینکنا شروع کر دیا۔ ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں وہی کر رہا ہوں جو تم کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ ہم تو اپنے بزرگوں کی روحوں کی پیاس بجھانے کے لئے پانی دے رہے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر ایسا ہے تو میں اپنے کھیت کو سینچ رہا ہوں۔ اس نے ہنس کر کہا کہ یہاں سے پنجاب تک پانی کیسے پہنچ سکتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر یہ پانی میرے کھیت تک نہیں پہنچ سکتا جو کہ اس دھرتی پر ہے تو تمھارا پھینکا ہوا پانی تمھارے بزرگوں تک کیسے پہنچ سکتا ہے جو اس دنیا میں نہیں ہیں اور جنھیں اب بھوک اور پیاس کی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور پھر انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ خدا کو بھول جانا اور بے فائدہ رسموں میں پڑ جانا گمراہی ہے۔ یہ صرف گرونانک کی زندگی کا ایک واقعہ نہیں ہے، ہر وقت کام آنے والی ہے، چاہے ہم کوئی مذہبی رسم ادا کر رہے ہوں، چاہے دفتر میں بیٹھ کر تعلیم کے اور ترقی کے پلین بنا رہے ہوں، چاہے کتابیں پڑھ کر اپنا علم بڑھانے کی فکر میں ہوں۔ جو بات عقل کے خلاف ہو، قدرت کے قانون کے خلاف ہو، وہ غلط ہے۔

یہی بات ہمیں مذہبوں کی تاریخ پڑھ کر معلوم ہوتی ہے۔ مذہبوں کی ترقی کا مطلب یہ ہے کہ عقل کے خلاف، پیچیدہ اور الجھی ہوئی بات کو چھوڑ کر سادہ، صاف، سلجھی ہوئی بات کہی جائے، جسے عقل فوراً مان لے، صحیح اخلاقی تعلیم دی جائے اور خوف کی فضا پیدا کرنے کے بجائے انسان کے اپنے دل کو اور دل

کی ان کیفیتوں اور حالتوں کو جنھیں واردات قلبی کہا جاتا تھا زندگی کے سدھار کا ذریعہ بنایا جائے۔ گرونانک کی عظمت، ان کی خوبیوں، ان کی شخصیت کے حسن کو بیان کرنے کے لئے کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، لیکن ہمارے زمانے کی مناسبت سے خاص طور پر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ان کی تعلیمات میں مذہب اور صحیح انسانی زندگی دونوں اس طرح مل جاتے ہیں کہ انھیں الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک بدھ سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ وہ اندرونی تبدیلی، وہ سچی شدھی جو ہمارا مقصد ہے کسی جگہ بھی حاصل ہو سکتی ہے، پر زیادہ امکان اس کا ہے کہ یہ تبدیلی سنیاس لینے والے میں نہ ہو بلکہ اس میں جو گرہست ہے، گھر بار کی پریشانیوں اور ذمہ داریوں میں مبتلا رہتا ہے اور ہر وقت گھر والوں کی خاطر اپنی خواہشوں کو دباتا اور اپنی ضرورتوں کو نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ آج کل سنیاس لینے والے بہت کم ہیں اور گرہست قریب قریب سب ہی ہیں، آج کل کوئی کہے کہ صحیح مذہبی زندگی گرہست کی ہوتی ہے تو یہ خیال نہ ہوگا کہ کوئی نئی بات کہی گئی ہے۔ مگر دوسری طرح سے دیکھئے تو یہ ایک نئی بات، اور ایسی کہ جسے ہم بہت آسانی سے بھلا سکتے ہیں۔ آج کل آدمی خود بخود گرہست بن جاتا ہے، اس لئے کہ زندگی کا عام قاعدہ یہی ہے، اور سب کے خیال میں مناسب بھی یہی ہے۔ مگر وہ شخص جو سوچ سمجھ کر اسے ایک مذہبی فرض ہی نہیں بلکہ نجات کا صحیح راستہ سمجھ کر گرہست کی زندگی اختیار کرے وہ گرونانک کی پیروی کرتا ہے اور اس کی حیثیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

اسی طرح گرونانک کی تعلیمات میں انسان کی فطرت کو بھی اس کا حق دیا گیا ہے۔ اس میں عیب پیدا ہو سکتے ہیں۔ جیسے ہمارے کپڑے میلے ہوتے رہتے ہیں، بدن پر میل جمتا رہتا ہے، اور ہم دونوں کو صاف کرتے رہتے ہیں، ویسے ہی آدمی کی فطرت میں بھی غرور، لالچ، نفرت اور دوسری طرح کی گندگی جمع ہو جایا کرتی ہے، جس سے اس کو پاک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر انسان کو اپنی طبیعت پر ظلم نہ کرنا چاہیے، انسان کو ست کرتار نے بنایا ہے، اور اس لئے نہیں بنایا ہے کہ وہ اپنی صورت کو بگاڑتا، اپنی انسانیت سے انکار کرتا رہے۔ بے شک دنیا میں آکر انسان اپنے رب سے دور ہو جاتا ہے، اور جیسے کہ مولانا روم نے فرمایا ہے:

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش

باز جوید روزگار وصل خویش

ہر آدمی جو اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے پھر وصل کے زمانے کو تلاش کرتا ہے۔ لیکن یہ وصل اپنی طبیعت کا، اپنی فطرت کا گلا کاٹ کر نہیں، اس کا توازن قائم رکھ کر، اس کی صحیح تربیت کر کے، اسے عشق کی تہذیب سکھا کر حاصل ہوتا ہے۔ یہی ہے سہج کی تعلیم، کہ آہستہ چلو، چلتے رہو، چلتے رہو، منزل کے جتنے قریب پہنچو گے، راستہ آسان ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ تم کہو گے:

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے

اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

یہ سہج کی تعلیم سائنس اور تجربے کے مطابق تندرستی کی سلامت روی کی تعلیم ہے، قدرت کے دستور کے اس قدر قریب کہ یہ اس سے الگ نہیں کی جا سکتی اور یہی اس تعلیم کی سچائی کا ثبوت ہے۔ زندگی کے بارے میں گرو نانک کے تین اصول یا تین ہدایتیں ہیں، کرت کرو، نام جپو، ونڈ چھکو۔ ان کی مصلحت پر غور کیجئے۔ زندگی کا دارومدار اس محنت پر ہے جس سے ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کچھ حاصل ہو۔ اناج کی ضرورت کسان پوری کرتا ہے، کپڑے کی جولاہا، مکان کی راج یا معمار۔ مزدور، صنعت پیشہ لوگ، کارخانے چلانے والے، کاروبار کرنے والے، سب ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ استاد، علمی کام کرنے والے، سائنس داں، انجینیر سب کے لئے کرت کرو کی ہدایت ہے، اور جو اپنا کام مستعدی سے، ایمانداری سے، اور اچھے سے اچھا نہ کرے اس پر الزام آتا ہے کہ اس نے اس ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ مگر انسان کے لئے ضرورتیں پوری کرنا کافی نہیں ہے۔ وہ ضرورتیں پوری کرنے کی فکر میں لگ جائے، اونچے معیار زندگی HIGH-STANDARD OF LIVING کے پھیر میں پڑ جائے تو ضرورتوں کی کوئی انتہا نہیں رہتی، وہ اپنی خواہشوں کا غلام بن جاتا ہے، اور خواہشیں اسے ایسے چکر میں ڈال دیتی ہیں کہ وہ اپنے فائدے کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانے لگتا ہے، قومیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں، ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرتی ہیں، اپنی صنعت و تجارت کو فروغ دینے کے لئے اپنی اور دوسروں

کی انسانیت کو مٹاتی ہیں۔ اس لئے شروع ہی سے محنت کرنے والے کے دل اور دماغ کو صحیح راہ پر لگا دینا چاہیئے۔ گرونانک کی دوسری ہدایت، نام جپو، کا مقصد یہی ہے۔ محنت کرنے والے کو برابر یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ خدا کا بندہ ہے، اس کی محنت اپنے لئے نہیں، خدا کے لئے ہے، اور اس کی محنت کو بارآور کرنا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بات اس کے دل میں بیٹھ جائے گی تو محنت سے اس کو جو کچھ حاصل ہوگا اسے وہ اپنا ہی نہ سمجھے گا، اس کا ایک حصہ دوسروں کو بھی دے گا۔ اس کا یہ دینا خیرات نہ ہوگا، اس کی وجہ سے فقیر نہ پیدا ہوں گے، سماج دولت مندوں اور ناداروں میں تقسیم نہ ہو جائے گی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ 'وَنڈ چھکو' کی ہدایت ہر قسم کے کام کرنے والوں کے لئے ہے، جس کے پاس کھانا بانٹ کر کھانے کو ہے وہ کھانا بانٹ کر کھائے، جس نے کوئی علم حاصل کیا ہے وہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائے۔ کسی انسان کو کوئی نعمت جو اسے ملی ہے اپنے پاس ہی نہ رکھنا چاہیئے، یہ سمجھ کر کہ یہ اس کی اپنی محنت کا نتیجہ ہے، اور محنت کرنے کے ساتھ وہ خدا کا نام لینے، نام جپنے کی ہدایت پر عمل کرتا رہا ہے۔ 'وَنڈ چھکو' کی ہدایت کا منشا یہ ہے کہ ہر آدمی کا سماج سے رشتہ قائم رہے، اس کی محنت، اس کی عبادت اس کے اپنے لئے نہ ہو، پوری سماج کے لئے، ہر انسان کے لئے ہو۔ پھر بھی یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ یہاں کون سی نرالی، انوکھی بات بتائی گئی ہے۔ گرونانک کی تعلیمات کی خوبی اسی میں ہے کہ ان میں نرالی انوکھی باتیں جو روزمرہ کے تجربے سے دور یا عقل کے خلاف ہوں اور انسان کو قدرت کے مقرر کئے ہوئے صحیح راستے سے ہٹائیں، نہیں ملتی ہیں۔

ان تعلیمات کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کٹر، ضدی، فسادی آدمی مذہبی نہیں ہوسکتا، وہ تعلیم صحیح مذہبی تعلیم نہیں ہے جو محنت کے کاموں کی یا محنت کرنے والے کی قدر گھٹائے، یا انسان کو اپنی نجات کی فکر میں ڈال کر سماج اور سماجی ذمہ داریوں سے الگ کر کے کسی کونے میں بٹھائے۔ در اصل یہ اُن راستوں میں سے جن پر انسان ہزاروں برس تک چلنے کی کوشش کرتا رہا ہے اُس راستے کا انتخاب ہے جس پر وہ سب سے زیادہ آسانی سے سب سے زیادہ دور تک اور دیر تک چل سکتا ہے وہ راستہ جسے ان تمام لوگوں نے اختیار کیا جن کی طبیعتوں میں سماجی حالات نے بگاڑ نہیں پیدا کیا

اور جو اس توفیق سے کام لے سکے جو خدا کی طرف سے سبھی کو عطا ہوئی ہے، یہ مساوات کا، جمہوریت کا، بھائی چارے کا راستہ ہے، اسی راستے پر چلنے والی سماج میں وہ سچے رہنما نمودار ہو سکتے ہیں جن میں کام کی، سماج کی، خدا کی لگن ہو، جو سورج کی کرنوں کی طرح اناج کو پکائیں اور پھولوں میں رنگ بھریں۔

اس کے باوجود اگر کسی کو خیال ہو کہ گرونانک کے ان تین اصولوں میں کوئی نرالی بات نہیں ہے وہ دیکھ لے کہ اس وقت ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں میں، سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں کے ملازموں میں، حکومت کرنے والوں اور حکومت کرنے کے امیدواروں میں کتنے ہیں جو کام کو فرض سمجھتے ہیں اور کام کو سلیقے اور ایمانداری سے نہ کرنے کو ایسا گناہ مانتے ہیں جس کی سزا دی جائے گی۔ اور لطف یہ ہے کہ آج کل سرکار کی طرف سے کام کرنے کا حکم دینے والا ابھی کوئی نہیں ہے، کام کا جمع خرچ زبانی ہوتا ہے یا ایسی رپورٹوں میں ملتا ہے جن پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ ہمارے لئے تو محنت کرنے کا حکم گرونانک کے زمانے کے مقابلے میں اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لئے کہ ہم ملک کی ترقی کے پلین بناتے رہتے ہیں جن کا مناسب نتیجہ نہ نکلے تو دنیا میں ہماری بڑی بے عزتی ہوتی ہے۔ دوسرے اصول پر، کہ نام جپو، یعنی خدا کا ذکر اس طرح کرو کہ اس کا نام دل پر نقش ہو جائے کون عمل کرتا ہے؟ ہماری حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے، اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی، ڈر یہ ہے کہ ہم خدا کا نام لیں گے تو آپس میں لڑائی ہو جائے گی۔ آپس کی لڑائیاں تو کسی نہ کسی بہانے سے ہوتی رہتی ہیں، ایسی لڑائیاں بھی جن میں بالکل بے قصور لوگ لٹتے اور مارے جاتے ہیں، اور ایسی نفرت بھی بے دھڑک پھیلائی جاتی جس کا سبب مذہبی اختلاف ہوتا ہے، لیکن اچھے اور پڑھے لکھے شہری کے لئے مناسب یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ خدا کا نام نہ لے، خدا کی مرضی کو اپنے کاموں میں دخل انداز نہ ہونے دے۔ جب کوئی اپنے آپ کو خدا کا بندہ نہ مانے تو وہ دوسروں کو خدا کے بندے اور خود اس کی طرح زندگی کی نعمتوں کے حق دار کیسے مانے گا۔ سبھی چاہیں گے کہ جو کچھ جس طرح سے سمیٹ سکیں سمیٹ کر اپنے پاس رکھیں، نہ پڑوسی کو اس کا حصہ ملے نہ سرکار کو انکم ٹیکس۔ اسی وجہ سے آپ نے دیکھا ہوگا

کہ جب بازار میں کسی مال کی کمی کا اندیشہ ہوتا ہے تو سب کوشش کرتے ہیں کہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خرید کر رکھ لیں ۔ نرالی اور انوکھی باتیں تلاش کرنا ایسے پڑھے لکھے لوگوں کا چونچلا ہے جو صرف دلچسپی چاہتے ہیں، جی بہلاتے ہیں، بحث کرتے ہیں۔ ان کا خیال نہ کیجئے۔ "کرت کرو، نام جپو، ونڈ چھکو" کے اصولوں کو برت کر دیکھئے۔ ان میں آپ کو ہر قدم پر ایک نئی اور نرالی مصلحت نظر آئے گی۔ یہ کسی عالم کے دعوے نہیں ہیں، ایک ایسے خدارسیدہ بزرگ کی ہدایتیں ہیں جس کی نگاہ میں صرف اپنا زمانہ نہیں، ہر زمانہ تھا۔

میں نے گرونانک کا ذکر ان باتوں سے اس لئے شروع کیا کہ وہ ہر شخص، ہر سماج، ہر زمانے کے لئے مناسب اور صحیح ہیں، اور ان پر بہتر سے بہتر زندگی کی بنیاد اور بہت مضبوط بنیاد رکھی جا سکتی ہے ۔ میرے نزدیک اس کے بعد ہمیں سادھ سنگت کے تصور پر غور کرنا چاہیئے ۔ اس کا ایک پہلو تاریخی ہے۔ ہم اس کا ذکر کر سکتے ہیں کہ اس سادھ سنگت میں کون سے لوگ شامل تھے اور ان کی زندگی اور عبادت کا طریقہ کیا تھا۔ لیکن سادھ سنگت کا خیال ایک زمانے کے لئے نہیں تھا، ہر زمانے کے لئے ہے، آج کل کے لئے بھی ہے، اس میں مختلف ملکوں کے، مختلف مذہبوں کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو ایک خدا کو مانتے ہیں کرت کرو، نام جپو، ونڈ چھکو کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں، دوسرے انسانوں سے محبت اور ہمدردی اور ان کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں، اور بغیر کسی خاص تنظیم، کسی خاص سنگھٹن کے ایک دوسرے کا سہارا لینا چاہتے ہیں۔ سادھ سنگت کسی ایک زمانے کے لوگ ہی قائم نہیں کرتے ۔ میں سمجھتا ہوں اس کا منشا یہ بھی ہے کہ ہر زمانے کے لوگ ان تمام نیک اور پاک لوگوں سے جو گذر چکے ہیں صحبت کا تعلق پیدا کریں، کہ ان بزرگوں سے فیض حاصل ہو، اور ان کے بارے میں صرف کتابوں میں نہ پڑھا جائے بلکہ انھیں اپنے زمانے میں موجود سمجھا جائے۔ آپ سوچئے کہ اگر ہم بجائے یہ پھیکی سی بات کہنے کے کہ سب مذہب سچے ہیں اور ان کی تعلیمات میں کوئی بنیادی فرق نہیں، صحیح دینی اور اخلاقی زندگی کی مثالوں کو، یعنی دنیا کے تمام دینی رہنماؤں کو ایک سادھ سنگت مانیں، اور خود اس سنگت میں شامل ہونا چاہیں تو اس سے ہمارے خیالات اور ہمارے آپس کے تعلقات پر کتنا اچھا اثر پڑے گا اور ہماری زندگی میں کتنی صفائی اور خوبصورتی پیدا ہو جائے گی ۔

مجھے معلوم نہیں کہ سادہ سنگت کے بارے میں میرا جو خیال ہے وہ سکھ عقیدوں کے مطابق ٹھیک ہے یا نہیں، بہر حال میں نے جو بیان کیا ہے وہ بھی اس کا ایک مطلب ہو سکتا ہے جو اصل مطلب کے خلاف نہ ہوگا۔ البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ سادہ سنگت میں شریک ہونے اور خدا کے حضور تک پہنچنے کے لئے گرو کی رہنمائی ضروری ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ گرو ایک بہت پرانا شبد ہے، اور عام استعمال میں اس کے کئی معنی ہیں۔ ایک بہت نالائق استاد کو شریف طبیعت کا طالب علم گرو کہہ سکتا ہے، اور ممکن ہے ایک بہت بڑا عالم و دوان اس قابل نہ ہو کہ اسے گرو کہا جائے۔ گرو سے مطلب شیخ یا پیر بھی لیا جا سکتا ہے جو اپنے مرید کی رہنمائی کرتا ہے، اور یہ بھی گرو کے ایک معنی ہیں۔ گرو نانک کی تعلیمات میں یہ لفظ بڑی اہمیت رکھتا ہے، مگر مجھے افسوس ہے کہ جو کتابیں میں نے پڑھیں ان سے یہ صحیح صحیح معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ غالباً اس کے ایک معنی ہیں توفیق الٰہی، یعنی وہ خاص صلاحیت، وہ استعداد، یا کہئے وہ بصیرت، وہ تڑپ، دل کا وہ نور جو خدا کی طرف سے انسان کو ملتا ہے اور اسے اس قابل بنا سکتا ہے کہ خدا کی ذات میں فنا ہو جانے کی آرزو کرے، اور اس آرزو میں بالکل گم ہو جائے۔ یہ توفیق گرو نانک کو بے حساب ملی تھی، مگر خدا کے ہر بندے کو کسی نہ کسی حد تک، کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتی ہے۔ یہ توفیق ہمارے جیسے انسانوں کو اس طرف مائل کرتی ہے کہ اپنے سے بہتر انسان تلاش کریں اور ان کی پیروی کریں، ان کے پیچھے چلیں۔ یہی توفیق ہمیں ایک رہنما سے دوسرے تک پہنچا سکتی ہے، کیا تعجب ہے کہ یہ ہمیں گرو نانک تک پہنچا دے، اور ہم شاعر کی طرح کہہ سکیں :

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ہمارے لئے یہ سوچنا کہ خدا کے یہاں گرو نانک کا کیا مرتبہ تھا صرف اپنی عقل کو حیران کرنا ہے، اور اس میں یہ ڈر بھی ہے کہ ہماری زبان کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی اور ہمارا دل اسی دال روٹی کی دنیا میں پڑا رہ جائے گا۔ ہمیں سوچنا تو یہ چاہئے کہ ہمارے یہاں، ہمارے دلوں میں، ہماری

زندگیوں میں گرونانک کا کیا مقام ہے، کیا ہم بچپن اور لڑکپن میں ماں باپ کا ویسے ہی ادب کرتے ہیں جیسے کہ انھوں نے کیا تھا، کیا ہم میں نیک کام کرنے کی ویسی ہی ہمت ہے، کیا ہم غریب کی حلال کی کمائی کی ویسی ہی قدر کرتے ہیں جیسے انھوں نے لالو بڑھئی کی کی تھی، کیا ہم امیر کی دعوت قبول کرنے سے اسی طرح انکار کرسکتے ہیں جیسے انھوں نے ملک بھگو کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تھا، اس لئے کہ امیر کی دولت دوسروں کی محنت سے، دوسروں پر ظلم کرکے حاصل ہوتی ہے، کیا ہم ان کی طرح خلوص سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ہندو نہیں ہے، کوئی مسلمان نہیں ہے، یعنی سب خدا کے بندے سب میرے بھائی ہیں، کیا ہم انھیں کی طرح خدا کا پیغام ہر جگہ پہنچانے کے لئے تیار ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جاکہ خاطر خواہ اوست

یعنی میرے دوست میرے خدا نے میرے گلے میں رسی باندھ دی ہے اور اس کا جہاں جی چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے، کیا ہم میں کسی قسم کی سادھ سنگت قائم کرنے کی لگن ہے جس کا مقصد خدا کی عبادت کرتے ہوئے نیک اور مفید زندگی بسر کرنا ہو؟ گرو کا درشن چھوٹا دل اور مٹھی بھر حوصلے نہیں دلا سکتے، گرو تک ہمیں صرف وہ عشق پہنچا سکتا ہے جو ہمیں ان کے خیال میں محو رکھے، ان کی نیک اور ان شخصیت میں فنا ہو جانے کی آرزو میں ڈبو دے، شاعر کی طرح ہم بھی کہنے لگیں:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

گرو اور خدا کا رشتہ بیان کرنے کی طاقت میری زبان میں نہیں۔ شاید یہ ایک ایسے اونچے مقام کی بات ہے جہاں ہم پہنچ نہیں سکتے۔ گرونانک کی کامل شخصیت کی تصویر کھینچنا بھی ہمارے بس میں نہیں ہے۔ شیخ ابوسلیمان دارانی نے یہ بتانے کے لئے کہ صوفی کس کو کہتے ہیں فرمایا تھا کہ صوفی وہ ہے جس پر ایسی حالتیں گذرتی رہیں جن کا علم صرف خدا کو ہوتا ہو اور خدا ہی جانتا ہو کہ وہ اس کے

حضور میں رہتا ہے تو کیسے رہتا ہے۔ گرو نانک نے اپنے آپ کو نہ پیغمبر کہا تھا اور نہ اوتار، ہم انھیں پیغمبر یا اوتار کہیں تو ہم ایسے مذہبوں کی اصطلاحیں قرض لیں گے، یعنی ایسے مذہبوں کی نقل کریں گے جو اُن کے مذہب سے الگ ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ایک ملک کے سچے بادشاہ کو دوسرے ملکوں کا شاہی لباس پہنائیں گے۔ گرو نانک تو گرو نانک تھے اور ان کا ست کرتار سے اپنا جدا معاملہ تھا۔ اس معاملے کی کیفیت کا اندازہ ان کے مقدس کلام سے کیجئے۔ ان کے عشق کی ایسی شدت کو دیکھئے کہ ہم میں، جن کے لئے یہ عشق ایک سنی سنائی بات ہے، وجد کی کیفیت پیدا کرتا ہے، ان کی نظر کو دیکھئے کہ دیہات اور کسان کی زندگی، گرمی کی تپش اور برسات کی بھیگی رات، عورتوں کے سنگھار اور بیوی اور شوہر کی جدائی، روزمرہ کی ان معمولی باتوں میں وہ حسن تلاش کر لیتی ہے جو خدا تک پہنچنے کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے، ان کے اس بے پناہ درد کو دیکھئے جو سب کی مصیبتوں کو اپنا لیتا ہے، اور انھیں خدا سے شکایت کرنے پر مجبور کرتا ہے، ان کے اس سکون کا کچھ اندازہ کیجئے جو سب کچھ خدا کی مرضی پر چھوڑ دینے سے ان کو حاصل ہوا تھا، گویا اپنے دل کے آئینے کو اتنا صاف کیجئے اور اتنا صاف کرتے رہئے کہ اس میں گرو نانک کی کامل شخصیت کا تھوڑا بہت عکس اتر آیا کرے، اور غالب کا یہ شعر پڑھتے رہئے:

خبر نگہ کو، نگہِ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

کیا اچھا ہو اگر ہم اس مبارک موقعے پر گرو نانک کی پیروی کا شوق تازہ کریں، محبت اور خدمت کی زندگی گذارنے کا پکا ارادہ کریں، اور اپنے دلوں کو سچے معبود، ایک اونکار، ست نام کی عبادت کے سوا ہر خیال سے پاک کرنے کی کوشش میں لگ جائیں۔

معین الدین حارث

جامعہ سے متعلق

ایک قدیم طالب علم کے افکار و تاثرات

اب سے دو سال قبل جامعہ کے یوم تاسیس سے کچھ دن پہلے اکتوبر ۶۷ء میں دہلی حاضر ہوا تھا۔ یوم تاسیس کے جلسے میں اور اس سے متعلق دوسرے مختلف پروگراموں میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی طرح ہر سال حاضری دیا کروں مگر اور مصروفیات زندگی اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ پارسال حاضر نہ ہو سکا۔ اس سال یوم تاسیس سے دو ہفتے قبل چند دنوں کے لئے دہلی میں تھا۔ انجمن جامعہ کے جلسے میں شرکت کی۔ جامعہ نگر میں قیام تو نہ کر سکا مگر کئی بار حاضر ہوا اور وہی مسرت حاصل کی جو ہر بار جامعہ آنے سے حاصل ہوا کرتی ہے۔

یوم تاسیس کے جلسے میں شریک ہو سکتا اور جلسۂ تقسیم اسناد میں کے۔ پی۔ ایس مینن صاحب کا عالمانہ خطبہ براہ راست انہی کی زبان سے سنتا تو دوہری مسرت ہوتی مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ برادر عزیز عبداللطیف اعظمی صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ اس موقع پر جب جامعہ کا جشن زریں (گولڈن جوبلی) قریب آرہا ہے جامعہ کے طلبائے قدیم سے رابطہ بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور جامعہ کے متعلق خاصکر ملک کے مستقبل کے متعلق ان کی رائیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے یہ خواہش بھی کی کہ اگر کسی وجہ سے حاضر نہ ہو سکوں تو اپنے خیالات لکھ کر پیش کروں۔ اسی دعوت پر ان سطور کے تحریر کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

جامعہ کا یوم تاسیس جب ہر سال آتا ہے تو خواہ اس میں شرکت ہو سکے یا نہ ہو سکے اس دن جامعہ اور اس کی زندگی خاصکر اپنی زندگی کے وہ سال جو اب سے چالیس پینتالیس سال قبل جامعہ میں گذارے

یاد آتے ہیں اور انہی کے ساتھ اپنے وہ اساتذہ کرام بھی جن کے درس اور فیض محبت سے کچھ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مجھے ہر ایسے موقع پر وہ یوم تاسیس جامعہ خاص طور پر یاد آتا ہے جو میری طالب علمی کے دور میں آیا تھا اور جس کے جلسے میں استاد مرحوم مولانا اسلم جیراجپوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظم پیش کی تھی جس کا پہلا شعر نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی یاد رہ گیا ہے :

یوم تاسیسِ جامعہ ہے آج
نُطق مہمانِ سامعہ ہے آج

مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم نہ صرف ایک بے بدل حافظ قرآن تھے بلکہ ان کا قرآن مجید کا مطالعہ وسیع اور اس کے معانی و مطالب پر ان کی نظر گہری تھی۔ اسی کے ساتھ تاریخ اسلام پر بھی انھیں عبور حاصل تھا اور ان کے اس علم و فضل سے اس دور کے (جس دور میں میں جامعہ کا طالب علم تھا) بلکہ اس کے بعد بھی جامعہ کے صدہا طالب علم فیض یاب ہوئے اور اس چیز نے ان طالب علموں میں قرآن کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق اور لگاؤ پیدا کیا۔ یہ بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جنھوں نے علم و فضل کے اس دریا سے تھوڑی بہت بھی سیرابی حاصل کی ان پر قرآن فہمی کی راہیں کھل گئیں۔ میں اپنی اس خوش نصیبی پر رب قدیر کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہوگا کہ اپنے اور بہت سے ہم جماعت رفقاء کے ساتھ مجھے بھی یہ موقع ملا۔ خداوند کریم مولانا اسلم مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور اعلیٰ علیین میں بلند ترین مراتب سے نوازے، آمین۔ ان کے اس احسانِ عظیم کو ان کا کوئی شاگرد فراموش نہیں کر سکتا۔

مولانا اسلم مرحوم کو قرآن و تاریخ اسلام پر عبور کے ساتھ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور ان کی نظم گوئی تحریک خلافت کے دور میں عروج پر تھی۔ اس سلسلے میں ان پر شبلی مرحوم کا رنگ غالب تھا۔ ان کی کئی نظمیں اس زمانے میں عام جلسوں میں پڑھی جاتی تھیں اور زبان زدِ خاص و عام ہوگئی تھیں۔ ان نظموں میں بھی قرآنی تعلیمات و تاریخ اسلام کی روایات کی طرف بڑے لطیف پیرائے میں اشارات ہوا کرتے تھے اور سامعین کو اسی صراطِ مستقیم کی طرف آنے کی دعوت ہوا کرتی تھی۔ ان کی ایک طویل نظم کا جس میں یہی تعلیم تھی اور صبر و شکر پر زور تھا، آخری شعر اب بھی یاد آتا ہے اور بہت سے

کٹھن وقتوں میں ڈھارس بندھاتا ہے:

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم
جانچ ہوتی ہے اسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

یومِ تاسیس کے جلسے میں انھوں نے جو نظم پڑھی تھی وہ بھی اسی رنگ میں تھی اور جامعہ کے مقاصد کو واضح کرتی تھی۔ آج کے جلسے میں بھی جو طلبائے قدیم موجود ہوں گے انھیں وہ موقع ضرور یاد آئے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس جلسے میں موجود نہیں ہوں۔

اب کی جامعہ کا جو یومِ تاسیس ہو رہا ہے اس میں سب سے بڑا خلا جو شرکائے جلسہ کو محسوس ہوگا وہ ہے جو استادِ محترم ذاکر حسین صاحب مرحوم امیرِ جامعہ کی وفات حسرت آیات سے پیدا ہوا ہے۔ ان کا وجودِ گرامی نہ صرف جامعہ کے لئے بلکہ پوری ملت اور مادرِ وطن کے لئے بہت بڑی نعمت اور سرمایہ تھا۔ تقریباً پانچ ماہ قبل گذشتہ مئی میں ان کے اچانک انتقال سے جو صدمہ گذرا اس کا احساس ملک و ملت کے لئے کس درجہ شدید تھا اس کا اندازہ ان خراجہائے عقیدت سے ہوتا ہے جو ان کی وفات کے بعد انھیں پیش کئے گئے۔ ذاکر صاحب کی ذات کو جامعہ کے علاوہ ملک کے اور بھی کئی ممتاز علمی اور تعلیمی اداروں سے قریبی تعلق تھا مگر ان سب میں جس ادارے کو ان کے اٹھ جانے کا غم زیادہ سے زیادہ ہو سکتا ہے اور جسے انتہائی شدت کے ساتھ برسوں یاد کیا جائے گا وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے جس کی تقریباً ڈوبتی ہوئی کشتی کو انھوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ ۱۹۲۵ء میں سہارا دیا، طوفانِ حوادث سے بچا کر کنارے لگایا اور اپنی زندگی کے پورے بائیس سال اس کی خدمت میں صرف کرکے شب و روز کی ان تھک محنت سے اس کی ایسی آبیاری کی کہ یہ پودا نہ صرف پروان چڑھا بلکہ ان کی زندگی میں اس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔

گذشتہ بیس سال کی مدت ذاکر صاحب نے جامعہ سے دور رہ کر گذاری اس کا ایک تہائی حصہ اپنی مادرِ علمی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمت میں صرف کیا اور آخری بارہ سال بڑے اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے جن میں آخری عہدہ آزاد جمہوریۂ ہند کی صدارت تھا اور جس کے فرائض

انھوں نے اس درجہ انہماک اور اس انوکھی شان سے انجام دئے کہ وہ آزاد ہند کی تاریخ کا زریں اور یادگار باب بن گئے ہیں۔ مجھے جامعہ کی طالب علمی کے دور میں اور اس کے بعد بھی جب وہ جامعہ کی تعمیر میں مصروف تھے اور پھر اس کے بعد ان کے نیم سرکاری اور سرکاری عہدوں کے دور میں بھی ان سے برابر نیاز حاصل رہا اور مجھے اس بات کا ذاتی علم ہے کہ آخری دور میں جب وہ جامعہ سے دور تھے اور براہ راست جامعہ کے کسی کام میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے یا پسند نہیں کرتے تھے انھیں جامعہ کا اور اس کی مزید ترقی کا ہر وقت بلکہ ہر لمحہ خیال رہا کرتا تھا۔ ان کی دلی خواہش یہی تھی کہ جامعہ کو اور زیادہ ترقی نصیب ہو مگر اس ترقی کے ساتھ ساتھ جامعہ اپنی ان خصوصیات کو باقی رکھے جو بانیانِ جامعہ کے اور خود ذاکر صاحب کے پیش نظر تھیں اور جنھیں عملی شکل دینے کے لئے ذاکر صاحب مرحوم اور ان کے رفقائے کار نے جن میں سے اکثر تو انہی کی طرح اللہ کو پیارے ہو گئے (جو باقی ہیں انھیں اللہ سلامت رکھے اور ان کا سایہ جامعہ کے سر پر تادیر قائم رہے) اپنی زندگیوں کا بہترین حصہ صرف کیا کیونکہ ان خصوصیات ہی کا نام دراصل جامعہ ملیہ ہے ورنہ تعلیمی اداروں کی ملک میں پہلے کمی تھی نہ اب ہے اور اب تو ان کی تعداد میں اتنا اور اس تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ ملک کی آبادی کی بے پناہ کثرت کی طرح ان اداروں کی کثرت سے بھی بعض اوقات خوف محسوس ہوتا ہے۔

مگر جامعہ کی خصوصیات باقی رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ رفتارِ زمانہ اور ضروریات وقت کے مطابق جامعہ میں تبدیلیاں نہ ہوں یا وہ بدلتے ہوئے دور کے تقاضوں کو پورا نہ کرے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو وہ ایک ایسے جمود کی کیفیت ہوگی جو اس ادارے کو زندہ تو رکھے گی مگر اس کی نشوونما روک دے گی اور وہ ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔ جامعہ کا تخیل اور اس کے مستقبل کی تصویر ذاکر صاحب مرحوم کی نظر میں یہ کبھی بھی نہ تھی جن دوستوں کو مرحوم کی وہ تقریریں یاد ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً جامعہ میں کیں، ان کی ایک موقع پر کہی ہوئی یہ بات ضرور یاد آئے گی کہ لبا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اداروں کی شاندار عمارتیں مقبرے بن کر رہ جاتی ہیں اور ان میں دور دور تک

کہیں بھی زندگی کا پتہ نہیں ملتا، خدا نہ کرے کہ جامعہ کی عمارتوں کا کبھی بھی یہ حال ہو جائے ۔

اسے اتفاق یا حسن اتفاق کہیئے کہ ذاکر صاحب مرحوم کے انتقال سے گنتی کے پانچ دن قبل میں دہلی میں تھا ۔ حاضری انہی کی خدمت میں تھی اور ان کی زندگی کا آخری Week-End (سنیچر اور اتوار) میں نے انہی کے ساتھ گذارا ۔ اس اتوار کو جو ان کی زندگی میں آخری اتوار تھا شب کے کھانے پر میں تنہا ان کے ساتھ تھا ۔ کھانے سے فراغت کے بعد حسب عادت باتیں شروع کیں اور ان کا سلسلہ معمول سے بہت زیادہ طویل ہو گیا اور کامل ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا ۔ ان کی عمر، ان کی صحت اور ان کی تھکن کا خیال کرتے ہوئے اس ڈیڑھ گھنٹے میں میں نے کئی بار کوشش کی کہ اجازت چاہوں اور یہ کہنے کی بھی جرأت کی کہ آپ اب آرام فرمائیے مگر انہوں نے باصرار روکا اور زیادہ تر جامعہ اور اس کے مستقبل کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے ۔ انھیں جامعہ کے جشن زریں کا بہت خیال تھا اور وہ چاہتے تھے کہ یہ آنے والا جشن بھی اسی طریقے سے منایا جائے جیسا اب سے چوبیس سال قبل جشن سیمیں منایا گیا تھا اور اسے جامعہ کی زندگی کا ایک اور یادگار موقع بنا دیا جائے ۔ افسوس کہ اس موقع پر ذاکر صاحب موجود نہ ہوں گے ۔

وہ چاہتے تھے کہ جس طرح آزادی سے پہلے جب جامعہ سرکاری امداد سے محروم تھی بلکہ اُسے قبول بھی نہیں کرتی تھی، جامعہ کی ضرورتوں کے لئے عام لوگوں کے پاس جاکر چندہ فراہم کیا جاتا تھا اس موقع پر بھی فراہمیٔ چندہ کی کوشش کی جائے ۔ ہرچند کہ جامعہ کے جاری اخراجات اب سرکاری امداد سے جو اب پرانی بدیسی حکومت نہیں بلکہ اپنی قومی حکومت ہے اور جس کے خزانے کا ہر نیا پیسہ قومی سرمائے کا حصہ ہے، پوری ہوتی ہیں مگر متعدد ایسے کام ہیں جو جامعہ کو کرنے ہیں اور کرنے چاہئیں اور جن کے لئے سرکاری خزانے سے امداد نہیں مل سکتی اور نہ اس کی توقع کرنی چاہیئے ۔ پھر قوم سے چندے کی فراہمی محض سرمایہ جمع کرنے کی خاطر ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعے ادارے کا قوم سے زندہ رابطہ قائم ہوتا ہے جس کی کسی بھی ادارے اور خاصکر تعلیمی ادارے کی صحیح ترقی کے لئے وہ ضرورت محسوس کرتے تھے ۔

اس سلسلے میں قدرتی طور پر انھیں جامعہ کی سلور جوبلی کا وہ چندہ یاد آیا جس کا ایک اچھا خاصہ انھوں نے ملک کے اس ممتاز شہر بمبئی میں، جس میں سے جامعہ کی طالب علمی کے اپنے دور کے خاتمے کے بعد اپنی پوری زندگی گذاری ہے انھوں نے اپنے رفیق محترم شفیق الرحمان قدوائی مرحوم کے ساتھ کئی ماہ کی ان تھک کوشش اور بقول انہی کے جس کا اعلان انھوں نے بمبئی کے ایک سے زائد عام اجتماعات میں بھی کیا تھا، اس وسیع و عریض شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کی خاک چھان کر جمع کیا تھا۔ پچیس سال کی مدت گذر جانے کے بعد ذاکر صاحب کو اپنے اور جامعہ کے وہ دوست اور مربی یاد آرہے تھے جن سے وہ اس چندے کے سلسلے میں ملے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کا نام لے لے کر ان کا ذکر کیا جو اب باقی نہ رہے ان کے لئے کلمات خیر کہے، ان کی خوبیوں کو یاد کیا جو ابھی بقید حیات ہیں، ان کا ذکر آیا تو ان میں سے بعض سے خصوصی طور پر مل کر سلام پہنچانے کی فرمائش کی۔ ان میں اگر ان کے رفیق محترم جناب ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید صاحب مینجنگ ڈائرکٹر سپلا تھے تو بمبئی کے اس دور کے وہ عرب ملک التجار شیخ محمد علی زین العلی رضا بھی تھے جنھوں نے سولہ سال کی عمر میں ہندوستان آکر بمبئی میں سکونت اختیار کی۔ موتیوں کی — سچے موتی آج کل کے نقلی نہیں۔ تجارت میں ملک التجار کا درجہ حاصل کیا اور پوری زندگی بمبئی میں گذار کر اسی مہینے ۸۴ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا — اور ان میں ایک اور عزیز دوست جناب حاجی نور محمد احمد صاحب بھی تھے جو پرانے خلافتی اور کانگریسی مگر اُن دنوں مسلم لیگ سے وابستہ تھے اور جنھوں نے اپنی سیاسی جماعت کے ممتاز لیڈروں کے حکم اور سخت تنقید کے باوجود جامعہ کے جوبلی فنڈ میں حسب استطاعت اضافہ کرنے کی جرأت مندانہ کوشش کی اور اس پُر آشوب دور میں بھی یہ بات یاد دلائی کہ تعلیمی کاموں کو سیاسی اختلافات کی ہوا نہ لگنی چاہیئے اور اچھے تعلیمی اداروں کی امداد شریف انسان کا، بلالحاظ سیاسی عقائد و خیالات یا وقتی رجحانات فرض ہے — انھوں نے سیف طیب جی مرحوم کو یاد کیا جنھوں نے اپنے دائرہ اثر میں جامعہ کے ہمدردوں کا ایک حلقہ پیدا کیا اور ان کے ذریعے جامعہ کی مدد کی اور ذاکر صاحب مرحوم کے مشوروں سے مستفید ہو کر بمبئی

میں انجمن اسلام کے ذریعے اردو کے تعلیمی اداروں کا قدیم مگر اس وقت کا کچھ بے ترتیب سا نظام درست کیا، اس میں نئی جان ڈالی اور اس کام کو اس طرح بڑھایا اور پھیلایا کہ اب وہ بمبئی والوں کی تعلیمی ضروریات کے ایک اچھے خاصے حصے کا کفیل اور ضامن بن گیا ہے ——— اُن مسلم دوستوں کے ساتھ ذاکر صاحب مرحوم کو وہ غیر مسلم دوست اور ادارے بھی یاد آئے جنھوں نے ان کی اپیل پر جامعہ کی دریادلی سے امداد کی تھی اِن میں اگر ہاؤس آف ٹاٹا زتھا تو پٹیل والکرٹ برادرس کے ڈائرکٹر، گاندھی جی کے رفیق، اور ذاکر صاحب کے عزیز دوست جناب جہانگیر پٹیل بھی تھے۔

ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ انہی اداروں اور ان پرانے دوستوں اور انہی کے ساتھ نئے ہمدردوں سے مل کر انھیں جامعہ کے کام سے جو واقفیت ہے اس میں مزید اضافہ کر کے اور جامعہ کی جن ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے غیر سرکاری ذرائع سے سرمایہ فراہم کرنے کی ضرورت ہے ان پر توجہ دلاکر اس موقع پر بھی ایک معقول رقم فراہم کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ زندہ ہوتے تو باوجود ان کے عہدے کی بعض پابندیوں کے بھی جامعہ سے ان کا تعلق اور ان کی زندگی بھر کی محنت کے اس شجر کو اور زیادہ بار آور بنانے کے لئے سرمایہ کی فراہمی آسان ہوتی۔ مگر اب وہ ہم میں نہیں ہیں پھر بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کا جامعہ سے زندگی بھر کا تعلق اور جیسے اب جامعہ کی سرزمین میں ان کی آخری خواب گاہ بن جانے سے دوام حاصل ہوا ہے اس کی وجہ سے ان دوستوں کے لئے جو اس کام کا بیڑا اٹھائیں گے اب بھی بہت سی سہولتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ جامعہ کو ان سہولتوں کا ٹھیک سے اندازہ کرنا چاہیئے اور جوبلی کے سرمایہ کی فراہمی کے موقع پر ان سابقہ روایات و تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

میں نے بہت سا حصہ اپنے محترم استادوں کی یاد اور گذرے ہوئے واقعات کی یاد تازہ کرنے میں صرف کیا، شاید اپنی عادت اور اس تربیت کی وجہ سے جو جامعہ کی گود میں حاصل ہوئی اور جسے ذاکر صاحب کے فیضِ صحبت نے جلا دی، میں اس پر مجبور تھا مگر مجھے یہ بات یاد ہے کہ جامعی احباب یہ بھی معلوم کرنا چاہیں گے کہ ایک ایسے سابق جامعی طالب علم کی حیثیت سے جس نے

تا حدِ امکان اپنی مادرِ علمی کے ساتھ اپنے تعلق کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے، جامعہ کے مستقبل اور اس کے آئندہ کاموں کے متعلق میرے ذہن میں کیا خیالات ہیں اور میری حقیر رائے میں اب جامعہ کو کیا کرنا چاہیئے۔ ہرچند کہ میں اس موضوع پر ان دوستوں کی طرح جنھوں نے اپنی زندگیاں جامعہ کے لئے وقف کی ہیں اور جو اب بھی اسی کام میں مصروف ہیں کچھ زیادہ کہنے کا حق نہیں رکھتا پھر بھی یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ میری رائے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مزید ترقی بخشنے اور اس کا کام اور زیادہ پھیلانے کے ساتھ اس کی بنیادی خصوصیات کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ جامعہ اپنے ابتدائی دور میں اور خاصکر ذاکر صاحب کی عملی سرپرستی جب اسے صبح سے شام تک حاصل رہی اس زمانے میں اپنے طرز کا ایک نرالا تعلیمی تجربہ تھا اور اسے اس صدی کی تیسری اور چوتھی دھائی میں جو شہرت و عزت حاصل ہوئی وہ انھی تعلیمی تجربات کی بنا پر تھی۔ یہ سچ ہے کہ جامعہ ابتدا ہی سے ایک جامعہ یعنی یونیورسٹی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ یونیورسٹی کا یہ تخیل کچھ بہت زیادہ صحیح نہیں ہے کہ اس کے ساتھ بہت سے کالجوں کا الحاق ہو اور اس سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہو، پھر بھی جامعہ میں کالج کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ابتدا سے رہا اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا بلکہ بعض شعبوں کے لحاظ سے اس کی توسیع بھی ہوگی۔ مگر ملک کے تعلیمی تجربات میں جامعہ کی اپنی دین یا Contribution اس کا ابتدائی مدرسہ اور اسی کے ساتھ اس میں ثانوی تعلیم کا انتظام تھا۔ یہ شعبے اب بھی موجود ہیں اور میری رائے یہ ہے کہ یہ نہ صرف باقی رہنے چاہئیں بلکہ ان کو مزید ترقی دینے اور مثالی بنانے کی کوشش بھی جاری رہنی چاہیئے۔

تعلیم میں اعلیٰ یا کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کو ضرور بلند مقام حاصل ہے اور اب تو ہمارا ملک صحیح طور پر مابعدِ سند یا (پوسٹ گریجویٹ) تعلیم پر بھی متوجہ ہو رہا ہے، پھر سائنس اور تکنیکی تعلیم پر بھی زیادہ زور دیا جا رہا ہے کیونکہ ماضی میں ان شعبوں پر ویسی توجہ نہیں ہو پائی تھی جیسی ہونی چاہیئے اور موجودہ حالات میں جس کی ضرورت مسلّم ہے، مگر اس سے کون انکار کرسکتا

ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کی بنیاد وہ ابتدائی اور اس کے بعد کی ثانوی تعلیم ہے جس پر سندی یا مابعد سندی تعلیم کا شاندار قصر تعمیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؟ اور اس سے بھی کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بنیاد خدا نخواستہ کمزور ہو تو پھر اس پر کھڑی کی جانے والی سندی اور مابعد سندی تعلیم کی عمارت بھی کمزور ہی رہے گی؟

اس باب میں اگر کچھ شکوک و شبہات ذہن میں پیدا بھی ہوں تو ابھی پارسال شائع شدہ کوٹھاری کمیشن کی ضخیم رپورٹ موجود ہے جس کا سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والا بھی اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا کہ ہمارے ملک میں اب بھی تعلیم کی یہی ابتدائی اور اصل بنیاد بہت کمزور ہے اور بڑی اور اہم ضرورت اسی بنیاد کو ٹھیک کرنے کی ہے۔ چونکہ ماضی میں جامعہ نے اس سلسلے میں بہت اچھا اور مثالی کام کر دکھایا ہے جس کا اعتراف ملک کے اور بیرون ملک کے ماہرین تعلیم بھی کر چکے ہیں، جامعہ کو اپنے کام کے اس حصے کی طرف سے غفلت نہ برتنی چاہئے بلکہ اسے ٹھیک کرنے اور پائداری بخشنے کے ساتھ اس میں نئے نئے تجربات کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کام کے لئے ویسی وافر سرکاری مالی امداد نہ ملے جیسی اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے لئے حکومت ہند دے سکتی ہے (اور پھر جامعہ ایسے علاقے میں ہے جہاں صوبائی حکومت کا نظام اب مضبوط اور ترقی یافتہ نہیں ہے جیسا ملک کے اور صوبوں میں ہے۔ اس لئے سرکاری سطح پر امداد کی کمی بھی محسوس ہو سکتی ہے) مگر اس کمی کو اور ذرائع سے پورا کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیئے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کام سے اور اس کی اہمیت سے عام لوگوں کو واقف کیا جائے تو اسے امداد حاصل کرنے میں کوئی خاص دشواری ہو یا کامیابی نہ ہو۔

اس ضمن میں ایک تجویز اور بھی پیش کرنے کی جرأت کروں گا اور وہ جامعہ کی تعلیمی برادری جو تعلیمی کام کرتی ہے اس کا فیض اوروں تک پہنچانے کی کوشش ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جو تعلیمی کام جامعہ میں ہوتا ہے یا جو تجربات یہاں اس سے پہلے ہوئے ان سے اور مقامات کے تعلیمی اداروں نے بھی فائدہ اٹھایا مگر جہاں تک خود جامعہ کی تعلیمی بستی کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اس بستی کے

باہر بھی اور قرب وجوار کے علاقوں میں اچھے یعنی مثالی ابتدائی اور ہو سکے تو بعض ثانوی مدارس بھی قائم کرنے اور چلانے کی کوشش جامعہ کو کرنی چاہئے اگر ایسا ہو سکا تو یہ ایک اچھے تعلیمی کام کا دائرہ اور وسیع کرنے کا باعث ہو سکے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مثالی طرز کے ہر کام کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہو گی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ حکومتیں اور سرکاری ادارے اپنی قانونی اور ضابطوں کی پابندیوں کے ساتھ جو رقوم دیا کرتی ہیں وہ پوری طرح کافی کبھی بھی نہیں ہوتیں نہ ہونی چاہئیں کیونکہ ہر نیا تجربہ خرچ کا طالب ہوا کرتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ خرچ سرکاری قوانین وضوابط کی حدود میں قابل قبول قرار پا سکے اور کچھ تجربات تو ایسے بھی ہونے چاہئیں جو اس آزادی اور اپنی قومی حکومت کے دور میں بھی سرکاری امداد واعانت سے بے نیاز رہ کر ہی کئے جائیں۔ یہ محض ایک خیال ہے اس پر خود جامعہ کے اہل نظر اور وہ اصحاب جو تعلیمی تجربات میں ذاتی طور پر مصروف ہیں، سوچ سکتے ہیں اور اس کام کی راہیں نکال سکتے ہیں مگر اس طرح کے چھوٹے موٹے کاموں میں بھی مالی امداد واعانت کی جو ضرورت ہو وہ پوری کرنے میں جامعہ کے طلبائے قدیم اور انجمن طلبائے قدیم کو جامعہ کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

ایک اور خیال جو بار بار میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور جو کسی حد تک اس ذاتی تجربے پر مبنی ہے جو برسوں تک سیاسی کام اور اس سلسلے میں سیاسی پارٹی کی تنظیم اور شہر بمبئی کے متعدد تعلیمی اور سماجی کام کرنے والے اداروں سے عملی تعلق سے پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جس دور سے ہم لوگوں کی ابتدائی زندگی کا تعلق رہا وہ گاندھی جی کی جاری کردہ قومی تحریکات کا دور تھا جس میں نوجوانوں کو قومی خدمت کی دعوت دی جاتی تھی، سیاسی تحریکات میں حصہ لینے کی بھی اور قومی طرز کے ادارے قائم کرنے اور چلانے کی بھی، اور یہ کام اگر بلا معاوضہ نہیں تو بہت قلیل معاوضے پر جو لبا اوقات معمولی طرز کی زندگی گذارنے کے لئے بھی ناکافی ثابت ہوا کرتا تھا، کام کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ اس دور میں اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تعداد بہت کافی تھی ان میں سے ایک بڑی تعداد نے تو اپنی پوری زندگی نہایت ایمانداری اور خلوص کے ساتھ ان کاموں میں لگا دی اور یہ اعتراف ایک بین حقیقت ہی

اعتراف ہوگا کہ ہمارے ملک کے بہت سے قومی ادارے جو اس دور کی یادگار ہیں انہی مخلص کارکنوں
ن خدمات کا پھل ہیں جن سے قوم آج بھی فائدہ اٹھا رہی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بذات خود اسی کی ایک
ندہ مثال اور بلاشبہ قابل فخر مثال ہے اور اسی لئے ذاکر صاحب مرحوم اور ان کے رفقائے کار
بن کی پرخلوص قربانیوں سے یہ ادارہ قائم رہا اور ترقی کرسکا ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

مگر اب حالات بہت کچھ تبدیل ہوچکے ہیں، اب اس قسم کی دعوت دینے والے بھی نظر نہیں
آتے اور اگر دعوت دیں تو انھیں کیا جواب ملے گا یہ کہنا بھی مشکل ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے
رجو جواب ملے گا وہ بہت زیادہ حوصلہ افزا نہ ہوگا۔ یہ تو مان لیا جاسکتا ہے کہ اب گوکھلے اور گاندھی
ر ذاکر حسین مشکل سے پیدا ہوں گے اور نہ انھیں ایسے ساتھی ملیں گے جو تن من دھن سبھی کچھ قربان
ر کے کسی کام یا کسی ادارے کو قائم کرنے یا چلانے کی ذمہ داری قبول کریں، مگر زندگی کے اور بہت
سے شعبوں کی طرح اس میدان میں بھی اب درمیانہ راستہ کیوں نہ نکالا جائے کہ فقیرانہ زندگی اختیار
ر کے کام کرنے والے نہ سہی مگر سادگی اور قناعت سے کسی حد تک کام لے کر اپنی صلاحیتیں تعلیمی
ر سماجی کاموں پر لگانے والوں کا ایک گروہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور خاصکر جامعہ جیسے
ومی اداروں میں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا پر نظر رکھی جائے اور ان میں سے اچھے اور
صلاحیت نوجوانوں کو خصوصیت کے ساتھ قومی اور سماجی کاموں کے لئے تیار کیا جائے یا کم از کم ان
ں طالب علمی کے دور میں ان کاموں کی انھیں رغبت دلائی جائے۔ یوں تو ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ پورے
علیمی نظام اور دوسرے مختلف کاموں اور اداروں کے لئے ضروری افراد فراہم کرتا ہی رہے گا مگر
ن کا خواہ بہت چھوٹا سا حصہ ہی کیوں نہ ہو ایسا کیوں نہ ہو جسے طالب علمی کے دور ہی سے ان کاموں
ی رغبت دلاکر ان کے لئے تیار کیا جائے اور ان سے اتنی قربانی کی توقع رکھی جائے کہ وہ اپنی
جائز ضروریات زندگی اور ایک اچھی متوازن قسم کی زندگی کے لئے ضروری معاوضے کی توقع ضرور
ریں اور یہ ان کا حق ہے جو انھیں ضرور دیا جائے، مگر وہ محض روپیہ یا بڑی تنخواہ کو اپنا مطمح نظر
رار نہ دیں بلکہ اسی معقول معاوضہ پر جو قوم اور اس کے ادارے دے سکتے ہیں قومی اور

سماجی کاموں میں زندگی گذارنے پر آمادہ ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ جامعہ جس دور کی یادگار ہے اسی دور کی ایک اور قومی یادگار گجرات ودیاپیٹھ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے فارغ التحصیل طلبا کو زیادہ تر ایسے ہی تعلیمی اور سماجی کاموں میں کھپایا جائے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ گجرات کی اپنی کچھ روایات ہیں اور گاندھی جی نے جو ادارے اس علاقے میں چھوڑے ہیں ان کی وجہ سے بھی گجرات والوں کو اس کام میں سہولت حاصل ہے مگر گجرات کے دیہاتوں کے لئے اچھے تربیت یافتہ اور مقصد کی خاطر کام کرنے والے استاد اور کارکن مہیا کرنے کا جو کام گجرات ودیاپیٹھ کر رہا ہے اس کی معلومات حاصل کر کے اس طرز پر سو فی صدی نہ سہی مگر کسی حد تک بھی اپنے قومی تعلیمی و سماجی اداروں کے لئے اچھے کارکن مہیا کرنے پر جامعہ توجہ کر سکے اور اس کا کوئی ایسا نظام بنائے جو اس کے تعلیمی نظام کے ساتھ ساتھ چل کر ایسے کارکن مہیا کر سکے تو یہ وقت کی اور اب سے بعد کے دور کی بھی ایک بڑی قومی ضرورت پوری کر سکے گا۔

جہاں تک جامعہ کی عمارات کی تعمیر کا تعلق ہے مجھے جو کام طلبائے قدیم کی توجہ کا زیادہ اور فوری طور پر مستحق نظر آتا ہے وہ جامعہ نگر کی مجوزہ مسجد کی تعمیر ہے۔ اب کی جامعہ جانے پر یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ جس جگہ استاد مرحوم اب آرام فرما ہیں اس کے قریب ہی اس شاندار مسجد کی بنیاد پڑ گئی ہے مگر یہ بھی معلوم ہوا کہ جو سرمایہ پہلے جمع ہو چکا تھا وہ تقریباً صرف ہو چکا ہے اور ایک کافی بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ یہ کام بھی ایسا ہے کہ نہ تو اس کے لئے سرکاری مدد مل سکتی ہے، نہ ملتی ہو تو قبول کرنی چاہیئے بلکہ یہ کام قوم کو خود کرنا چاہیئے۔ جامعہ کا تعلق، ذاکر صاحب کی آخری آرام گاہ کا قرب اور جامعہ کی پوری تعلیمی بستی کی ایک ضرورت، اس لحاظ سے اس مسجد کی جو اہمیت ہے وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ طلبائے قدیم کو اپنے اپنے حلقے کے اصحاب خیر سے اس کام کے لئے مالی امداد حاصل کر کے اس کمیٹی کا ہاتھ بٹانا چاہیئے جو اس خانۂ خدا کی تعمیر میں مصروف ہے۔

سید غلام ربانی

فن اور زندگی

فن ایک طرز زندگی ہے، یہ خیال کچھ انوکھا سا معلوم ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ ہم نے فن کو اپنے روزمرہ کے کاموں سے الگ سمجھ لیا ہے اور اس کی تخلیق فن کاروں کا ہی حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ ماہرین فن اور عوام کے درمیان ایک خلیج حائل ہے اور کچھ عرصہ سے یہ خلیج زیادہ وسیع ہوتی جارہی ہے۔ لوگ جب دنیا کے بڑے بڑے ماہرین فن کے شاہکار دیکھنے میں مصروف ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں اور کائنات کے اسرار و رموز اُن پر کھل رہے ہیں۔ اس وقت ان کی گفتگو کا بھی خاص انداز ہوتا ہے۔ فن کار حضرات کو دوسرے لوگ بدمذاق معلوم ہوتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دوسروں میں اچھائی برائی سمجھنے کا مادہ نہیں ہے اور جب وہ یہ جملہ سنتے ہیں کہ فن ایک طرز زندگی ہے تو حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آخر یہ فن ہے کیا بلا اور زندگی سے کیا مُراد ہے؟

فن کی کوئی جامع تعریف کرنی مشکل ہے، ایک مختصر سی تعریف یہ بھی ہو سکتی ہے کہ "آرٹ چیزوں کا بنانا ہے" اسی موضوع پر اس وقت بحث ہوگی۔

کسی متوسط درجہ کے شخص کے مکان پر جائیں تو معلوم ہوگا کہ صاحب مکان نے اپنی چیزوں کو اس طرح رکھنے کی کوششیں کی ہیں جن سے وہ زیادہ اچھی دکھائی دیں۔ فرش یا قالین جو بچھا ہوتا ہے اس کے شوخ رنگ گرمائی میں کچھ اضافہ نہیں کرتے مگر اس شخص کے جذبات کو ضرور گرماتے ہیں جو ان پر چلتا ہے۔ دیواروں کو تصویروں سے سجایا جاتا ہے۔ کمرہ کی دیواروں پر کوئی خط مستقیم دیوار کو مضبوط نہیں بناتا مگر اس پر حاشیہ ضرور بنا دیتا ہے۔

زندگی گزارنے کے لئے فن کی کس قدر ضرورت ہے اس کی اہمیت کسی نئے جوڑے سے پوچھنی ہئے جو اپنی نئی دنیا بسانے کی فکر میں ہے۔ اس کے سامنے مسائل کا ایک طوفان اٹھا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے مکان کا مسئلہ آتا ہے، آیا بنایا جائے، خریدا جائے، یا کرایہ پر لیا جائے، بہت کم لوگ ہیں جو مکان کے مسئلے کو خاطر خواہ طور پر حل کرتے ہوں۔ مکان محض گرمی سردی سے بچنے کا ایک ٹھکانا ہی نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور بھی ہوتا ہے، اس کی تعمیر ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ زمین کی نوعیت کے لحاظ سے اس نقشہ تیار کرنا ایک فن ہے چنانچہ آرکیٹکٹ سکونتی ضروریات کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھتا ہے کہ مکان دیکھنے میں اچھا معلوم ہو۔

مکان زمین پر ہوتا ہے اور زمین کا کچھ رقبہ ہوتا ہے اس میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں۔ اس ناہمواری کو پھول پودوں سے چھپا دیا جاتا ہے۔ کوئی کونا بے تکا معلوم ہو تو اس کو انگور یا کسی اور قسم کی بیل سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ غرض کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی بدنمائی نہ بچے۔

ایک نئی نویلی دلہن یا ایک الہڑ نوجوان شروع میں کسی چیز کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ رکابیاں، چھریاں چاقو، چادریں، پلنگ، کھانا پکانے کے برتن، کرسیاں، میزیں، لیمپ وغیرہ میں سے ہر چیز ایک فنی مسئلہ پیش کرتی ہے، کیونکہ اس کو یہ سوچنا ہوگا کہ آیا یہ چیزیں وضع قطع، رنگ، مناسبت اور موزونیت کے لحاظ سے اس طرز زندگی کے لئے مناسب ہوں گی جو وہ گزارنا چاہتا ہے یا گزار سکتا ہے۔

کپڑے مکان کی نسبت زیادہ ذاتی ہوتے ہیں۔ انسان اپنے کپڑوں کو اپنا ایک جزو سمجھتا ہے اور یہ کسی قدر درست بھی ہے وہ ایک پرانی یا گھسی پٹی شیروانی کی بجائے نئی شیروانی میں زیادہ خوش رہتا ہے اور یہ احساس بھی رکھتا ہے کہ اس کی دوسری شیروانیاں رنگوں اور خطوں کی ترتیب کے لحاظ سے اچھا اثر پیدا کریں۔ وہ کپڑے محض اس لئے نہیں پہنتا کہ گرمی سردی سے بچا رہے بلکہ اس معیار کو چاہتا ہے جس سے اس کے ساتھیوں میں اس کی سبکی نہ ہو۔ رنگ، بناوٹ، نمونہ، وضع، خطوط غرض ہر وہ چیز جو لباس میں امتیازی شان پیدا کرے اس کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، چنانچہ فیشن کے دلدادہ حضرات نے اپنی سرگرمیوں سے ایک ہنگامہ بپا کر دیا ہے جس سے کپڑوں کی صنعت کے

یم الشان کارخانے قائم ہو گئے ہیں اور ان کی فروخت میں بھی عجیب وغریب طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ی بڑی دکانوں پر لکڑی کے آدمی اعلیٰ قسم کے سوٹ پہنے کھڑے ہیں اور ان ملکوں میں جہاں کپڑوں فروخت کا فن زیادہ ترقی کر گیا ہے سچ مچ کی حسین عورتیں جدید ترین لباس زیب تن کئے نظر آتی ی، وہ چل پھر کر مختلف انداز سے اپنے آپ کو یا لباس کو دکھاتی ہیں۔

ابھی وہ زمانہ باقی ہے کہ لوگ بہت سی خوبصورت چیزیں اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ بے شمار د اور عورتیں فرنیچر، قالین، موزے، سوئیٹر اور بہت سی ایسی چیزیں جو ہاتھ سے بناتے تھے اب کارخانوں بننے لگی ہیں اور گھر گھر نظر آتی ہیں۔

کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں اکثر گھٹیا اور سستی ہوتی ہیں، چنانچہ شروع میں جب کارخانوں نے چیزوں مینہ برسانا شروع کیا تو ایک شخص نے کہہ دیا تھا کہ کارخانوں کی پیداوار کا طوفان بے تمیزی زمین کو مونڈی چیزوں سے پاٹ دے گا لیکن اب ایک تبدیلی ہو گئی ہے۔ کارخانوں نے ایک دوسرے کے مقابلے زیادہ دلکش اور خوش وضع چیزیں بنانی شروع کر دی ہیں، ان میں بہتر خطوط ہوتے اور رنگوں میں یادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

وضع میں بھی خوبصورتی پیدا کی جاتی ہے چنانچہ فرنیچر یا پارچہ جات اور خانگی ضرورت کی چیزیں مثلاً پ، چولھے، میز کا سامان کھانا پکانے اور کھانے کے برتنوں میں وضع کے لحاظ سے تبدیلی کی ں، ان کو خوبصورت بنایا گیا۔ باورچی خانہ جو مکان کا سب سے زیادہ کام کا کمرہ ہے اور ایک وار محنت کی جگہ ہے، اب زیادہ بُری جگہ نہیں رہا اور لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ موجودہ فن ہمارے نوں میں باورچی خانہ سے داخل ہو رہا ہے۔ آج کل کی ایجادوں اور بجلی کے سامان کے استعمال کثرت اور نئی نئی نقلی دھاتوں کے سامان کی بھرمار ہوتی جا رہی ہے۔

مصنوعات کو بہتر بنانے کا شوق انتہا کو پہونچ گیا ہے۔ موٹر کے کارخانوں کے مالکوں کو بہت د معلوم ہو گیا کہ موٹر کے لئے محض تیز رفتاری کافی نہیں، لوگوں کو کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ ھوں نے موٹروں کے بدنما خطوط اور رنگوں کی اصلاح کے ساتھ گاڑی کی شکل کو بھی خوبصورت

بنانا شروع کیا، نئی نئی وضع کی موٹریں تیار ہونے لگیں اور ان نمونوں کی کثرت اس قدر ہوگئی کہ موٹروں کا نام ان کے نمونوں سے پکارا جانے لگا، چنانچہ ہر کارخانہ کی پیداوار کے ساتھ موڈل سنہ ۶۶، سنہ ۶۷ عام ہوگیا اور موٹر نشین حضرات اچھی خاصی موٹروں کو نکال کر سنہ ۶۸ کا موڈل خریدنے لگے۔

چیزوں کے اشتہار اور فروخت، ان کو سلیقے سے رکھنے یا سجانے کے لئے تجارت نے ہمیشہ فن سے مدد لی ہے، خوبصورت بیل بوٹوں کے تھان اور تیار کپڑوں کی نمائش، پھلوں کی ترتیب ان کے رنگ اور شکل کے لحاظ سے، بید کے سامان کو اس طرح آراستہ کرنا کہ خریدار کو ترغیب ہو، چیزوں کو بند کرنے یا رکھنے کے لئے بے شمار خوبصورت وضع کے ڈبے، شیشیاں، ان کی تصویریں اور اس قسم کی بہت سی ترکیبیں ہیں جن سے تاجر کام لیتے ہیں ان تمام چیزوں میں فنی اصول لازم ہوتے ہیں اور تجارت نے فن کا دامن اس طرح پکڑ لیا ہے کہ آج کل "کمرشل آرٹ" ایک مستقل فن بن گیا ہے اور اسے بھی فنون لطیفہ کے دربار میں کرسی مل گئی ہے۔

لکھنا دنیا کے نہایت قدیم فنون میں سے ہے۔ چھاپنے اور کتابیں تیار کرنے کا فن اس قدر مشین کے چکر میں آگیا ہے کہ یہ کام اب انفرادی کوششوں کے بس کا نہیں رہا۔ پہلے زمانہ میں جو آدمی کتاب لکھتا تھا وہی قلم بناتا اور سیاہی تیار کرتا تھا۔ اب یہ صورت نہیں رہی۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے دیوانِ غالب چار پانچ آنے کو بازار میں بکتا تھا، وہی دیوانِ غالب برلن کے مطبع شرکتِ کاویانی میں بڑے اہتمام سے چھپا اور اب تو یہ حال ہے کہ مرقع چغتائی اور مصور دیوان الماری کی زینت بن گئے ہیں۔

بازاروں میں دکانوں کے نام جو کالی سیاہی کے حروف سے روشن ہوتے ہیں، رات کے وقت بجلی کی رنگین روشنیوں سے جگمگانے لگتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ فضا میں ہوائی جہاز دھوئیں سے حروف بناتے اور اشتہار دیتے ہیں۔

اب تک زندگی کے جن شعبوں کا ذکر ہوا، ان میں انفرادی انتخابات نمایاں ہیں لیکن اجتماعی سرگرمیوں کا بھی یہی حال ہے۔ کسی مقام پر ندی کا پل بنایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو اس پر سے گزرنے

میں آسانی ہو لیکن پل دیکھنے کی بھی چیز ہے، اس کا منظر خوبصورت بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

دنیا میں بہت سے شہر اور قصبے بے ڈھنگے پن سے بڑھ گئے تھے۔ اب مذاق عامہ ترقی پا گیا ہے تو وہ بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ بھلا ٹیڑھی گلیوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ ان کو توڑ کر سیدھا کیا جا رہا ہے۔

عوام کے کاروبار کے لئے جو سرکاری عمارتیں بنتی ہیں ان میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ وسیع اور کشادہ ہوں اور ساتھ ہی خوش وضع ہوں اس کے لئے شہر حیدر آباد بہت اچھی مثال ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا آرٹس کالج، ہائی کورٹ، دواخانہ عثمانیہ، اسٹیٹ لائبریری، یونانی دواخانہ، صلع سرائے، معظم جاہی مارکیٹ، اسٹیٹ میوزیم، جوبلی ہال، اسمبلی ہال خوبصورت عمارتیں ہیں، ان میں بودھ اور مغل فنِ تعمیر نمایاں ہے۔

زندگی کے اہم شعبوں کی فہرست میں مذہب کو شامل کرنا ناگزیر ہے، مذہب اور فن کچھ انمل اور بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مذہبی عمارتوں اور عبادت کے طریقوں میں فن آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے۔ مذہب نے ہم کو فن کے بڑے بڑے شاہکار دئے ہیں، دیوی دیوتاؤں کی رنگین تصویریں، دھاتوں اور پتھروں کی مورتیں، شاندار مقبرے، مسجدیں، مندر، کلیسا، گرودوارے جو صدیوں سے قائم ہیں، ان کے در و دیوار پر فنونِ لطیفہ کی مہریں لگی ہیں۔

اجنتا، ایلورہ، پٹیل کھورا، ناسک، کارلی، بھاجا، الی فنٹا اور کھجراؤ میں فنونِ لطیفہ کے تاج محل ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت اور شاندار عمارتیں مذہب ہی نے بنوائی ہیں۔

مندروں میں بھجن گائے جاتے ہیں تو راگ راگنی کے ساتھ۔ کلیساؤں میں دعائیں پڑھی جاتی ہیں تو ترنم سے خالی نہیں ہوتیں۔ حمد اور نعت بھی تحت اللفظ کی بجائے ترنم ہی میں بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور قرأت اور اذان میں لحن دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔

محمد بدیع الزماں

اقبال اور وطنیّت

اقبال کے متعلق اکثر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ وہ وطنیت کے قائل نہیں تھے۔ گرچہ اقبال نے اپنی نظم "وطنیت" میں اس موضوع پر اپنے تصوّر کی وضاحت خود کی ہے۔ ایسی ہی ایک تنقید حضرت فراق گورکھپوری کی ہے۔ جناب محمد طفیل صاحب ایڈیٹر ماہنامہ "نقوش" لاہور کے نام اپنے خط مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۵۲ء میں حضرت فراق نے اقبال کی شاعری کے محرکات و مقاصد پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"اردو شاعری میں بہت سے محاسن کے باوصف بہت سی بلند چیزوں اور قدروں کی کمی رہی ہے۔ دو مثالیں لوں گا۔ حالی اور اقبال کی۔ حالی کا دل بہت نرم ہے۔ نیکی اور شرافت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن گہرا یا بلند تفکر یا فلسفیانہ دماغ ان کے یہاں نہیں ہے۔ یہ چیزیں اقبال کے یہاں بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ لیکن بدنصیبی سے ایک جنگجوئی کا جذبہ بھی اُن کے یہاں ملتا ہے۔ اور طاقت یا قوت خواہ کسی طرح کی بھی ہو اس کے لئے ایک اندھی پرستش بھی اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ جنگیں جیتنے، ملکوں کو فتح اور ان پر اسلامی حکومتیں قائم کر دینے کو اقبال بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک سنگین کرختگی مزاج کا اثر اُن کا کلام پڑھ کر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسلامی ملّت کے تصوّر کی زنجیروں میں ان کی شاعری جکڑی ہوئی ہے[1]۔"

۱۔ ماہنامہ 'نقوش' لاہور، ادب عالیہ نمبر، جولائی ۱۹۶۰ء

حضرت فراقؔ گورکھپوری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے اقبالؔ کے نظریۂ شاعری پر ایک لمبی بحث چھڑ جاتی ہے جو اس مقالہ کا موضوع نہیں۔ مگر ان اقتباسات سے اقبالؔ کے متعلق یہ غلط فہمی ضرور ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ وطنیت کے قائل نہیں تھے بلکہ ایک ایسی بین الاقوامیت کے دلدادہ تھے جس کا تعلق صرف اسلام اور مسلمان سے ہو۔ ادب ہو یا معاشرہ کا کوئی نظام بہت سی غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں جو زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ خود ایک مستقل عنوان بن جاتی ہیں اور ان غلط فہمیوں کے نتیجے میں معاشرہ میں زبردست ذہنی ردعمل پیدا ہوتا ہے اور اس کی شدید کشمکش قومی یکجہتی میں دیوار کی طرح حائل ہو جاتی ہے۔ ملک کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اقبالؔ کے متعلق اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے تاکہ ادب بھی ہماری قومی یکجہتی میں ممد و معاون ہو سکے اور ہم اقبالؔ کی شاعری پر بھی صحیح رائے قائم کر سکیں۔ اقبالؔ کے متعلق ایسی ہی پیش کش کی اہمیت پر جناب آل احمد سرورؔ صاحب نے حال ہی میں فرمایا ہے:

"اقبالؔ اس ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کی پیداوار ہیں جس نے مغرب کے اثر سے ہمارے ملک میں ایک نئی مشرقیت کو جنم دیا۔۔۔ ان کی نئی مشرقیت کو ماضی پرستی کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ یہ عصر حاضر سے ایک نئے مفاہمے کی کوشش ہے۔۔۔ اس نئی مشرقیت میں اوّل اوّل قومیت کا ایک رومانی تصور تھا۔ مگر کیا پرجوش اور ولولہ انگیز تصور۔ اقبالؔ نے اس کے ہمالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا گیت، تصویر درد اور نیا شوالہ جیسی نظمیں لکھوائیں۔ ان نظموں میں بڑے خلوص سے باہمی محبت کو سارے فرقہ وارانہ خیالات کا حل بتایا گیا تھا۔۔۔ اقبالؔ کی عظمت کے اعتراف کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں کہ ہم ان کے مذہبی نظریے سے اتفاق کریں۔ وہ اس مذہبی نظریے کی وجہ سے بڑے شاعر کے درجے سے خارج بھی نہیں کئے جا سکتے۔۔۔۔ دانتے اور ملٹن اور گوئٹے کے مذہبی نظریات سے اتفاق کئے بغیر ہم ان کی عظمت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس طرح اقبالؔ کی عظمت کے اعتراف کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کے یہاں بلند تخیل، گہرا تجربہ، اپنے اسی گہرے تجربے سے مکمل وفاداری اور اس کے اظہار کے لئے مناسب اور موزوں اظہار۔۔۔ ملتا ہے۔۔۔ مسجد قرطبہ کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ سرتیج بہادر نے

اسپین میں لکھے گئے ان کے اشعار کے حوالہ سے درست کہا تھا کہ یہ شاعری سب کے لئے ہے۔
اس لئے آج ہمیں مذہبی اور سیاسی نظریات کی بنا پر شاعروں کی عظمت متعین نہیں کرنا چاہئے۔

"...... آزادی کے بائیس سال بعد ہم اقبال کے متعلق زیادہ معروضیت کے ساتھ سوچ سکتے ہیں اور ان کی شاعری کے متعلق بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ اب ان کی شخصیت کے اور ہمارے درمیان وقت کا خاصہ فاصلہ ہوگیا ہے۔ ادب میں یہ فاصلہ بھی غیر جانبداری برتنے میں اور انصاف کرنے میں مدد دیتا ہے .... اقبال کی شاعری سے آج بھی ہمیں گرمی اور روشنی مل سکتی ہے"۲

اقبال اس وطنیت کے قائل نہیں تھے جو سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے یورپ اور مشرقِ وسطیٰ میں سامراجی طاقتوں نے "وطنیت" کے جو تصورات قائم کئے اور جن کے مضر اثرات آج بھی ان خطوں میں نظر آرہے ہیں، اقبال کے پیشِ نظر تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

اسی لئے اقبال نے وطنیت پر اپنے تصورات کے اظہار کے لئے اپنی نظم "وطنیت" کی سرخی "وطنیت یعنی بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے" رکھی۔ اور اس "وطنیت" کے جسے تہذیب نو کے آذروں نے تراشا، مضر اثرات کی وضاحت اس طرح کی:

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

گرچہ اس نظم میں اقبال کا تخاطب مسلمانوں سے ہے مگر اس کا اطلاق ساری انسانیت پر ہوتا ہے کیونکہ

۲۔ ماہنامہ "صبح نو" پٹنہ، مئی ۱۹۶۹ء : "اقبال ـــ ایک آفاقی شاعر"

اقبال اسلام کا مقصد ملّتِ آدم قرار دیتے ہیں۔ ان کی دردمندی ملّتِ آدم کی متمنی تھی نہ کہ صرف جمعیت اقوام کی خواہ وہ مسلمانوں ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس خیال کو "ضرب کلیم" کی نظم "مکّہ اور جنیوا" میں بخوبی واضح کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تصورات محدود دائرے میں چکر نہیں لگا رہے تھے بلکہ ان کا اطلاق ساری انسانیت پر تھا۔ کہتے ہیں ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام | پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم!
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود | اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم!
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام | جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم؟

متذکرہ بالا اشعار سے ہمارا ذہن اس امر پر صاف ہو جاتا ہے کہ وہ "جنگیں جیتنے، ملکوں کو فتح کرنے اور ان پر اسلامی حکومتیں قائم کر دینے کو" اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ ایسی بین الاقوامیت کے متمنی تھے جس کا محور "ملّتِ آدم" ہو نہ کہ "جمعیتِ اقوام"۔

اقبال کی بین الاقوامیت سے متعلق اپنا ذہن صاف کرنے کے بعد ہم ان کی حبّ الوطنی کا صحیح طور پر تجزیہ کر سکتے ہیں۔ حب الوطنی بہت پاکیزہ اور مقدس جذبہ ہے۔ اس کی اہمیت صرف سیاسی مصلحتوں ہی کی بنا پر نہیں بلکہ ہر شہری میں تعمیری صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ اس کا فقدان جسم ہی کو معطل نہیں کرتا بلکہ دل کو مردہ کر دیتا ہے۔

اقبال کی حبّ الوطنی کا تو یہ عالم ہے کہ ان کی شدّتِ احساس نے جب شعر کے پیکر میں ملبوس ہونا چاہا تو سب سے پہلی نظم جو معرضِ وجود میں آئی وہ "ہمالہ" تھی جس کی کوکھ سے ہندوستان کی سب سے متبرک ندی گنگا نے جنم لیا۔ اقبال صرف ملّتِ اسلامیہ کے سوز و ساز سے ہی سروکار نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی حب الوطنی اس کی بھی آرزو مند تھی کہ ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا! | مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا | داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

اقبال کے کلام میں ہندوستان کی آزادی کی تڑپ از اول تا آخر پائی جاتی ہے۔ البتہ شروع میں لہجہ اور طرز ادا خطیبانہ اور واعظانہ ہے جو جلد ہی بدل کر فلسفیانہ ہو جاتا ہے۔ نظم "تصویر درد" میں ہندوستان کی غلامی پر ان کا اضطراب ملاحظہ ہو:

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندستاں! مجھکو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا — لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
سُن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو — وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنیوالی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں؟
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذّتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں!
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

دوسری نظم "نیا شوالہ" میں اقبال کس نزاکت اور دردمندی سے اُن تاروں کو چھیڑتے ہیں جو خوابیدہ روحوں پر مضراب کا کام دے سکیں۔ یہ نظم ان تمام تقریروں پر بھاری ہے جو قومی یکجہتی کے موضوع پر کی گئی ہیں اور کی جاتی ہیں:

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اور پھر اقبال کا ترانۂ ہندی" ہے۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ سیاسی پارٹیوں کی نشستوں، جلسے اور جلوسوں میں گائی جانے لگی۔ ملک وقوم سے وارفتگی ملاحظہ ہو:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا

اقبال کی عقیدت مندی ہندوستان کے بام ودر تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے ثقافتی، تمدنی ورثے بھی اُن کے لئے اُتنے ہی مقدس ہیں۔ اگر اقبال کو اپنا رمزِ شوق لَا اِلٰہ میں پوشیدہ نظر آتا ہے تو رام کے پیالوں سے بھی اُنھیں وہی شرابِ حقیقت چھلکتی نظر آتی ہے۔ اپنی نظم "رام" میں اس عظیم ہستی کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر — رفعت میں آسماں سے اونچا ہے بامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی — روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

ہندوستان مذاہب اور عقائد کا سنگم ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اقبال کا خلوص اور ان کی نیک نیتی اس سنگم پر ملنے والی دوسری ندیوں کو فراموش کردیتی۔ چنانچہ انھوں نے گرونانک اور گوتم بدھ کے قدموں پر بھی پھول نچھاور کئے۔ اول الذکر کو "مردِ کامل" اور موخر الذکر کو گوہر یکدانہ" کے نام سے یاد کرتے ہوئے نظم "نانک" میں کہتے ہیں:

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی — قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر	غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں	شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا	نورِ ابراہیمؑ سے آذر کا گھر روشن ہوا

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

یہ ضرور ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری کے آخری دور میں اسلام کے بنیادی تصورات سے زیادہ کام لیا مگر پھر بھی پہلے کی طرح اس دور میں بھی اُن کا جذبۂ حبّ الوطنی اسی طرح جوش میں آتا رہا۔ چنانچہ "ضربِ کلیم" کی نظم "گلہ" میں آزادی کی تڑپ فلسفیانہ استدلال اختیار کر لیتی ہے۔ کہتے ہیں:

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک	بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے!
دہقان کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ	بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے!
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر	افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے!

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے!

ان کی نامرادی نے اتنی شدّت اختیار کر لی کہ دوسری نظم "شکر و شکایت" میں وہ خدا سے یہ گلہ کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں:

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

مختصر یہ کہ اقبال کے کلام میں حبّ الوطنی اور وطنیت کے جذبوں کی کمی نہیں۔ اس میں اپنے ملک کے پہاڑ، پتھر، ندی، دیوی اور دیوتا سے عقیدت مندی بھی ملتی ہے اور اپنے وطن کی عظمتِ رفتہ کا ذکر بھی۔ اس میں ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے کاٹ پھینکنے کا عزم بھی ہے اور ہندوستان کی آزادی کی تمنا بھی۔ اس بات کی کہ اقبال کا خطاب صرف مسلمانوں

سے ہے کل بنی نوع سے نہیں اردو ادب کے نقادانِ ادب نے وقتاً فوقتاً تردید کی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عابد حسین اس غلط فہمی کا ازالہ یوں کرتے ہیں:

"ایک غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اقبالؔ کا خطاب انسانوں کی صرف ایک جماعت مسلمانوں سے ہے۔ کل بنی نوعِ انسان سے نہیں۔ ان کے پیشِ نظر ملت کا نصب العین ہے جو انسانیت کے مقابلے میں بہت تنگ اور محدود ہے۔ اس سے زیادہ وسیع مشرب تو ہندوستان اور ایران کے غزل گو شاعروں کا ہے جو عام انسانی زندگی کے جذبات و کیفیات کے مصور ہیں مگر ذرا غور سے دیکھئے تو محض جذبات و کیفیات کی مصوری اور چیز ہے اور زندگی کی ایک مکمل تصویر کی تعمیر اور چیز ہے۔

"دیکھنا اصل یہ ہے کہ جو نصب العین اقبالؔ کے ذہن میں ہے وہ کیا اور کیسا ہے۔ محض یہ بات کہ وہ ملت کے تصورات سے وابستہ ہے اسے تنگ اور محدود رکھنے کو کافی نہیں... اقبالؔ کی شاعری اور ان کے نصب العین کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نقش کو اس کے تاریخی پسِ منظر کے ساتھ دیکھیں۔

"اس میں شک نہیں کہ اقبالؔ کا سارا فلسفہ اسلامیت کی روح سے لبریز ہے اور ان کے صحیح مخاطب مسلمان ہیں لیکن ایک سچے شاعر کی طرح ان کے دل میں سارے جہاں کا درد ہے۔ ان کی محبت کل بشر کو محیط ہے اور ان کا پیام ایک حد تک سب انسانوں کے لئے عام ہے۔ وہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنی خودی کی تربیت اور اپنی مخصوص ملی روایات کی حفاظت کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے صحیح نصب العین سے قریب تر پہنچ جائیں[1]۔"

۱۔ ڈاکٹر عابد حسین "اقبال کا تصورِ خودی" درکتاب 'اقبال پر ایک نظر' مرتبہ سید محمد شاہ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

مقصد اور موقف

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو خلافت اور عدم تعاون کی عمومی تحریکوں کے جلو میں قائم ہوئی۔ اس کے بانیوں میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم المرتبت ہستیاں تھیں، اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ان الفاظ کے ساتھ اس کا سنگ بنیاد رکھا:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔"

دینی اور سرکاری تعلیم گاہیں دو علامتیں تھیں، مذہبی تعلیم اور جدید تعلیم کی اور ان دونوں کے قریب آنے کا مطلب یہ تھا کہ ملک کی صحیح خطوط پر تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں کی شخصیت و تعمیر اس تہذیبی ورثے کا جس کا ایک اہم عنصر مذہب ہے اور اس احساس کا کہ عہد حاضر کے علمی و تہذیبی سرمایہ سے بچ کر بامقصد اور مفید زندگی نہیں گذاری جا سکتی پورا پورا حصہ ہو۔ اس بات کو یوں بھی کہا گیا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قدیم و جدید اور دینی اور سیاسی قدروں کے ایک خوشگوار اور صحت مند امتزاج کی آرزومند رہی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مقصد تہذیبی اور تعلیمی تھا لیکن وہ قائم ہوئی سیاسی تحریکات کے جلو میں۔

اسی لئے شروع میں اس ادارے میں سیاسی جوش و خروش زیادہ تھا لیکن رفتہ رفتہ جب یکوں کا زور کم ہوا اور ہلچل میں کچھ کمی آئی تو ایک تعلیمی و تہذیبی ادارہ کی حیثیت سے اس کا وجود ی خطرہ میں پڑ گیا۔ اس لئے کہ یہ سرکاری ادارہ تھا نہیں کہ اسے حکومت کی امداد حاصل ہوتی۔ ومت تو اسے بغاوت اور انقلاب کا گہوارہ سمجھتی تھی۔ دوسری طرف قوم ایسے ادارہ کے ے جس کی ڈگریاں تسلیم نہ کی جائیں اور جو سرکاری ملازمت کا ضامن نہ ہو، کچھ کرنے کے لئے آمادہ ہیں تھی۔ اس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ طرح طرح کی دشواریوں میں گھر گئی اور ایک مرحلہ میں تو یہ فیصلہ لیا گیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ لیکن جامعہ میں طالب علموں اور کارکنوں کی ایک جماعت تھی جو ہر قسم مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار تھی مگر اللہ کے اس کام کو باقی رکھنا اور ترقی دینا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین یم کو جو اس وقت جرمنی میں تھے اور جو ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ کے قیام کے وقت انقلابی نوجوانوں کے سرخیل تھے، جب اس صورت حال کی اطلاع ملی تو انھوں نے لکھا کہ "میں اور میرے ند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہمارے آنے تک جامعہ یہ کو بند نہ کیا جائے۔" حکیم اجمل خاں مرحوم پر ان مخلص نوجوانوں کے جذبۂ ایثار کا بہت اثر ا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا اور اس کا ذکر بھی کیا کہ حالات مایوس کن ہیں۔ گاندھی ، نے کہا: "جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا۔ آپ کو روپیہ کی دقت ہے تو میں بھیک مانگ لوں گا۔" اس سے یم صاحب کی ہمت بندھی اور وہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی لے آئے۔ یہ واقعہ جولائی ۱۹۲۵ء کا ہے۔ ذری ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب اپنے دو ساتھیوں ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ منی سے واپس آئے اور حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی وفات (دسمبر ۱۹۲۷ء) تک جس طرح معہ کی مسیحائی کی، جامعہ کی تاریخ میں اسے آب زر سے لکھا جائے، تو مبالغہ نہ ہوگا، اور اس مرد انے اس کڑے وقت میں جامعہ کو بچا لیا۔ اس زمانہ میں ایک اور خدا ترس انسان نے جامعہ کی تگیری کی۔ اور وہ تھے مدراس کے سیٹھ جمال محمد مرحوم۔ ذاکر صاحب کی آنکھیں، جب ان کا ذکر آتا ما شکر گذاری کے جذبہ سے نم ہو جاتیں اور فرماتے کہ سیٹھ جمال محمد مرحوم کی فیاضانہ اعانت سے

جامعہ کو دوبارہ زندگی ملی، حکیم صاحب کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم نے جامعہ کی سرپرستی کی۔ پھر بھی جامعہ کی جو مالی دشواریاں تھیں وہ قائم رہیں۔ قرضہ بڑھتا جاتا تھا۔ اور ٹرسٹیز میں کافی لوگ ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ جامعہ چلنے والی نہیں، اسے بند کر دینا چاہیئے۔ ایسے سخت وقت میں جب قوم کے بڑے بوڑھے ہمت ہار چکے تھے، نوجوانوں نے آگے بڑھ کر قومی تعلیم کا علم اٹھالیا اور انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی رہنمائی میں جامعہ کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان نوجوان کارکنوں نے جامعہ کو چلانے کے لئے ۱۹۲۸ء میں "انجمن تعلیم ملی" کے نام سے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی جس کے اراکین نے یہ عہد کیا کہ وہ کم از کم بیس سال تک جامعہ کی خدمت کریں گے اور ایک سو پچاس روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ طلب نہ کریں گے۔ عملاً ہوا یہ کہ اس بیس سال کے عرصہ میں کسی کو -/۱۵۰ روپے ماہوار نہیں ملے۔ پہلی دفعہ جن حضرات نے اس عہد نامہ پر دستخط کئے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین (۲) پروفیسر محمد مجیب (۳) مولانا اسلم جیراجپوری
(۴) مولانا خواجہ عبدالحیٔ (۵) حافظ فیاض احمد (۶) ارشاد الحق
(۷) برکت علی (۸) سعدالدین انصاری (۹) سعید انصاری
(۱۰) شفیق الرحمان قدوائی (۱۱) حامد علی خاں

تعلیمی مقاصد، تعلیمی تجربے

جامعہ جب قائم ہوئی تھی تو وہ اعلیٰ تعلیم کا ادارہ تھی۔ سوسائٹی کے قیام کے بعد ذاکر صاحب نے یہ نظریہ سامنے رکھا کہ جب تک شروع ہی سے بچوں کی تعلیم و تربیت قومی و ملی ضرورتوں کے مطابق نہ ہو ایسے نوجوان پیدا نہیں ہو سکتے جو اچھے مسلمان یا اچھے ہندو اور اچھے ہندوستانی کی حیثیت سے ان ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں جن کا بوجھ ایک اچھا شہری ہی اٹھا سکتا ہے۔ برطانوی سامراج سے لڑنے کے لئے ایسے نوجوانوں کی ضرورت تھی جو اپنے مذہبی اور تہذیبی ورثے کی عظمت کا احساس رکھتے ہوں، جن کے دل جذبۂ حب وطن سے سرشار ہوں اور جن کے ذہنوں کو علوم جدیدہ کی

روشنی میسر آئی ہو۔ ہمارا ملک غریب ملک ہے ۔ پچھڑا ہوا ہے ۔ طرح طرح کے سماجی اور معاشی روگ اس کی جان کو لگے ہوئے ہیں ۔ جہالت کی تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے ۔ یونیورسٹیاں اور قدیم طرز کے ادارے ملک و قوم کی ضرورتوں سے بے نیاز ایسے ماحول میں کام کر رہے ہیں کہ ملک کے کروڑوں غریب اور پسماندہ انسانوں کے دکھ درد سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ تعصب اور تنگ نظری کے گھور اندھیرے میں سچائی، رواداری اور سماج سیوا کا کام بہت کم ہو رہا ہے اور مسلمانوں کا تو ایک ادارہ بھی ایسا نہیں جو ایسے نوجوان پیدا کرے جن کی ملک و ملت کو ضرورت ہے ۔ اس صورت حال کا جائزہ لے کر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ابتدائی تعلیم پر زیادہ توجہ کی اور خاص طور پر اپنے محدود وسائل کے باوجود ابتدائی مدرسہ کو ایک نمونے کا مدرسہ بنا دیا، جس نظریۂ تعلیم اور جس طرز تعلیم پر جامعہ کے مدرسہ ابتدائی میں کام ہوا، ملک اس سے اس وقت نا آشنا تھا۔ لیکن جامعہ کالج بھی اعلیٰ تعلیم کے شعبہ کی حیثیت سے باقی رہا۔ اور اس سے ایسے گریجویٹ نکلتے رہے جنھوں نے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔

۱۹۳۷ء میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی طرف سے دو ماہرین تعلیم ای سالٹر ڈیویز (E. SALTER DAVIES) اور لارن زلیاکس (LAURIN ZILLIACUS) مختلف ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے ہندوستان پہونچے ۔ وہ جامعہ میں بھی آئے۔ اس کے کام کو دیکھا۔ استادوں اور طالب علموں سے ملے اور جامعہ کے تعلیمی کام کے بارے میں جو رائے قائم کی اسے لکھ کر دے گئے۔ ڈیویز نے لکھا:

> "مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسکولوں کے دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں نے اس سفر میں بہت سے اسکول دیکھے ہیں، اور میں بلا جھجک کہتا ہوں کہ کئی لحاظ سے میں نے آپ کے اسکول کو زیادہ دلچسپ پایا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی مشکلات کے باوجود آپ لوگ تعلیم کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہیں جنھیں عام طور پر تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن ہمارے اسکولوں میں انھیں برتنے میں بڑی سست روی سے کام لیا جاتا ہے ،
> آپ دراصل انھیں اصولوں پر کام کر رہے ہیں جنھیں میں اپنے وطن کینٹ (انگلستان)

میں عمل میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خدا اس عظیم الشان کام میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو کامیاب کرے۔"

لارن ذلیاکس نے اعتراف کیا:

"جامعہ ملیہ میں آکر اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے مخلص ساتھیوں سے گفتگو کرکے میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی کا یہ بہت ہی فیض بخش اور حوصلہ افزا تجربہ ہے۔ اس ادارہ کے پیچھے جو تصور کارفرما ہے اور وہ جذبہ اور عمل جس میں یہ تصور ڈھل گیا ہے، اس نے اس ادارہ کے کام کو دنیا کی بہترین تعلیمی کوششوں کی صف میں جگہ دی ہے۔"

جامعہ کا تہذیبی موقف

جامعہ میں شروع ہی سے اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ ۱۹۲۸ء کے بعد جامعہ نے بچوں کے لئے اور بڑوں کے لئے اردو زبان میں کتابوں کی اشاعت کا کام بڑے پیمانہ پر شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ادبی اور علمی دنیا میں اس کا اعتبار قائم ہو گیا۔ ذاکر صاحب کو اس کا شدید احساس تھا کہ ہندوستان میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر جو ملک کا مستقبل ہیں بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ ان کے پڑھنے کے لئے نہ تو اچھے رسالے نکلتے ہیں اور نہ اچھی کتابیں چھپتی ہیں۔ جامعہ کے ادارۂ نشر و اشاعت مکتبہ جامعہ نے اس سلسلہ میں سلیقہ سے کام کرنے کی نئی نئی راہیں پیش کیں۔ اس طرح ذاکر صاحب کی قیادت میں جامعہ اور کارکنان جامعہ جلد ہی ملک کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ لیکن پھر بھی اس کی مالی دشواریاں کم نہ ہوئیں، بے سروسامانی کا وہی عالم لیکن ان ہی دنوں کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے یہ بھی کہا ہے:

"مگر کچھ ایسا لگتا ہے کہ تنگی کے دن کچھ اچھے ہی دن تھے۔ سامان نہیں تھا، ارمان تھے۔ دولت نہیں تھی، ہمت تھی، سامنے ایک آدرش تھا دل میں ایک لگن تھی۔ اختیار مانگنے پر کسے دھیان تھا۔ اپنا کام پورا کرنے کی دھن تھی، تنخواہیں بڑھوانے کا موقع کہاں تھا، جان کھپانے میں جی سکھ پاتا تھا۔ ہر بچہ جو اس بے سروسامان بستی میں آجاتا تھا اس کی آنکھوں

میں ہمیں آزادی کی چمک دکھائی دیتی تھی، ہم سے غلامی نے جو کچھ چھین لیا تھا وہ سب ہمیں ان بچوں میں مل جاتا تھا......"

تہذیبی اعتبار سے جامعہ کا ایک خاص موقف رہا ہے۔ ایک موقع پر خود گاندھی جی نے کہا تھا (جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اگر "اسلامیہ" کا لفظ ہٹا دیا جائے تو مجھے اس ادارہ سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ جامعہ ایک ایسا ادارہ ہو جہاں اسلامی تہذیب کے ترجمان ہوں اور ساتھ ہی ایسے دیش بھگت جنھیں مذہبی اختلافات اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکیں، ایسے دیش بھگت مسلمان جو سماج سیوا کا کام کرتے وقت یہ نہ دیکھیں کہ وہ شہروں میں کام کرتے ہیں یا گاؤں میں، ان کی خدمت سے ہندو فیضیاب ہوتے ہیں یا مسلمان، ان کی خدمت کا کام خدا کی رحمت ہو جو سب کے لئے ہوتی ہے، ان کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں، ان کا مذہب سب دلوں کو جوڑے، انھیں ایک دوسرے سے جدا نہ کرے، ایسا ہی مذہب اسلام جامعہ کے تہذیبی موقف کا سرچشمہ رہا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے یہ موقف اختیار کر کے کسی مذہبی یا تہذیبی بے راہ روی کا ارتکاب کیا ہو۔ جامعہ کے تہذیبی موقف کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں کاشی ودیا پیٹھ (بنارس) کے جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبہ پڑھتے ہوئے کہا تھا:

"کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں، آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لئے کتنا اہم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لئے مضر ہو۔ مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا انتظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضہ ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ

بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کرسکنے کا دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حالت میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لئے کہ اس سے مسلمان کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما"

تعلیمی تجربوں کی وسعت

جس زمانہ میں جامعہ اپنی تعلیمی، ادبی اور علمی کاوشوں سے اپنے تہذیبی مقاصد کو آگے بڑھا رہی تھی، اسی زمانہ میں وہ تعلیم کے میدان میں نت نئے تجربے بھی کر رہی تھی، ابتدائی تعلیم میں اس نے جدید تعلیمی نظریات کے مطابق تجربے کیئے اور ملک کو ان کی افادیت کی طرف متوجہ کیا۔ ساتھ ہی اس نے شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کے شوق، محنت اور بصیرت کے سہارے تعلیم بالغاں کا کام شروع کیا۔ اس وقت اس اہم کام کی طرف ملک کی توجہ نہیں تھی؛ ان پڑھ بالغ عوام کے شعور کی بیداری کا کام کوئی نہیں کرتا تھا۔ تعلیم سے ذہنوں کو روشنی ملتی ہے۔ صحیح رائے عامہ بنتی ہے، اچھے برے میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اسے سب مانتے تھے۔ لیکن اَن پڑھ بالغوں کو بھی ان برکتوں کی ضرورت ہے، اس کا احساس یا تو تھا نہیں، اور اگر تھا تو اس مفید کام کو شروع کرنے کے لئے لوگ تیار نہیں تھے۔ جامعہ نے دہلی کے مختلف محلوں میں شبینہ مدارس اور تعلیم بالغاں کے مراکز قائم کرکے تعلیمی تجربے کی ایک راہ نکالی اور اس سلسلہ میں کافی لٹریچر بھی فراہم کیا۔ خواندہ

بالغوں کے لئے جامعہ نے سلسلہ وار جو کتابیں لکھوائیں اور چھاپیں وہ ملک میں بہت مقبول ہوئیں اور اس لحاظ سے بھی جامعہ اپنی نوعیت کا انوکھا ادارہ قرار پایا۔ ۱۹۳۸ء میں جب واردھا اسکیم کے مطابق ملک میں بنیادی تعلیم (بیسک ایجوکیشن) کا چرچا ہوا، اور مختلف مقامات پر بنیادی تعلیم کے مدرسے اور استادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے نئے نئے ادارے قائم ہونے لگے، تو جامعہ نے اُردو زبان والوں کے لئے استاد تیار کرنے اور بنیادی تعلیمی اسکیم کا تجربہ کرنے کے لئے استادوں کا مدرسہ قائم کیا جس نے جلد ہی تعلیم کے اداروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ جیسا کہ معلوم ہے جامعہ ہمیشہ سے ایک تعلیمی تحریک رہی ہے۔ استادوں کے مدرسے سے جو استاد تربیت پاکر نکلے ہیں انھوں نے دوسرے مدرسوں میں جاکر اپنے عمل سے جامعہ کے تعلیمی مشن اور تہذیبی فکر کی اشاعت کی ہے۔ مدرسوں میں آرٹ کی تعلیم رائج تھی، لیکن اس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ آرٹ کے استادوں کو بھی جدید طرز کے مطابق اصول تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی تعلیم دی جائے۔ یہ بہت بڑی خامی تھی۔ آزادی کے بعد جامعہ نے انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ ایجوکیشن قائم کر کے اس تعلیمی تجربہ کی افادیت کو اُجاگر کیا۔ اس طرح مدرسہ ثانوی میں جہاں برسوں سے جدید ترین طریقۂ تعلیم مثلاً مقصدی طریقہ (پروجیکٹ میتھڈ)، تفویضی طریقہ (اسائنمنٹ میتھڈ) اور اس طرح کے دوسرے طریقوں کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی، آزادی کے بعد ملٹی پرپز MULTI PURPOSE نصاب جاری کیا گیا۔ اس کے مطابق آٹھویں جماعت کے بعد طالب علم اپنے شوق اور صلاحیت کا اندازہ کر کے جس میں ان کے استاد بھی ان کی رہنمائی کرتے ہیں میڈیکل، انجینرنگ یا سماجی علوم اور ادبیات کے مضامین پڑھتے ہیں اور تین سال کے ایک وسیع نصاب تعلیم سے گذر کر ہائر سکنڈری کا امتحان دیتے ہیں۔

مذہبی تعلیم

جامعہ کے نصاب تعلیم میں مذہبی تعلیم کو ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے۔ مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی اور کالج جہاں پیشہ ورانہ تعلیم نہیں ہوتی تقریباً سبھی طالب علم مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مسلمان

طلباء اسلام کا اور ہندو طلباء ہندو دھرم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طرح جامعہ کے طلباء مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے محروم نہیں رہتے۔ آج ملک کے تعلیمی اداروں میں اخلاقی تعلیم کے نصاب کی کمی اور اس کے نتائج کا احساس بہت قوی ہے۔ جامعہ جیسے تعلیمی اداروں نے اس سلسلہ میں جس رہنمائی کی کوشش کی، افسوس ملک نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

جامعہ کی توسیع سلور جوبلی کے بعد

۱۹۴۶ء میں جامعہ کی سلور جوبلی منائی گئی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت اور جامعہ کے کام کی برکت نے ہر مکتبۂ خیال کے ممتاز افراد کو جامعہ کے پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ پھر اس کے بعد ایسا مجمع دیکھنے کو نہ ملا۔ اب گویا پوری قوم نے جامعہ کے قومی تعلیم کے کام اور اس کی افادیت کا اعتراف کر لیا تھا۔ مرکزی عارضی حکومت نے مالی امداد کا اعلان کیا اور اس کا یقین ہو گیا کہ آزاد ہندوستان میں جامعہ کی مشکلات بہت کم ہو جائیں گی۔ ۱۹۴۷ء میں ہم آزاد ہوئے لیکن آزادی کا بادل خون بھی برسا گیا۔ ملک تقسیم ہوا۔ بھائی نے بھائی کو قتل کیا۔ لیکن گاندھی جی کی توجہ، پنڈت نہرو کی فکر مندی اور ذاکر صاحب کی شخصیت اور ہمت نے جامعہ کو مٹنے سے بچا لیا۔ ابھی جامعہ ۱۹۴۷ء کے بعد پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ مولانا ابو الکلام آزاد اور پنڈت نہرو کے اصرار پر ذاکر صاحب کو وائس چانسلر بن کر علی گڑھ جانا پڑا اور پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ ہوئے۔ حکومت ہند نے جامعہ کے کام کو سراہا۔ اور رفتہ رفتہ اس کے کام کے ساتھ حکومت کی امداد بھی بڑھتی رہی، ۱۹۵۴ء میں حکومت نے جامعہ کا سارا خسارہ پورا کرنے کا ذمہ لے لیا اور ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس کو یونیورسٹی کی حیثیت کا ادارہ تسلیم کیا۔ اس کے بعد جامعہ میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو فروغ حاصل ہوا ہے لیکن جامعہ نے اپنی توجہ اسکولوں کی طرف سے نہیں ہٹائی ہے، کیونکہ یہی اسکول جامعہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتے ہیں۔

جامعہ کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تسلیم کر لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جامعہ اپنے بنیادی موقف سے ہٹ گئی ہے۔ پہلے پوسٹ گریجویٹ اور آنرز کورسز نہیں تھے اور اب یہ چل رہے ہیں۔

نا الیس سی تک سائنس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ریسرچ کا کام شروع کرنے کے ساتھ جامعہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کی اجازت مل گئی ہے۔ سول انجینرنگ (ڈپلوما کورس) اور سوشل ورک میں بی اے آنرز تک کی تعلیم کا کام بھی ہو رہا ہے، کئی نئی عمارتیں بھی بن گئی ہیں، الغرض ذاکر صاحب کے علی گڑھ جانے کے بعد سے حکومت ہند کی امداد اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی توجہ سے جامعہ کے کام کی کافی توسیع ہوئی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن توسیع و ترقی کی اس ہما ہمی، تنخواہوں میں معتدبہ اضافے اور جامعہ برادری میں استادوں اور طالب علموں کی تعداد بڑھنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جامعہ کے وہ تعلیمی و تہذیبی مقاصد جو اس کی تمام سرگرمیوں کا محور رہے ہیں، پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں۔

اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے جامعہ کا تہذیبی مقصد

جامعہ میں ذریعہ تعلیم اردو ہے اور حکومت نے بھی اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن ہمارے عمل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو، ہندی اور انگریزی میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ایسے طالب علم جو اردو سے واقف نہیں ہیں جامعہ انھیں اردو پڑھاتی ہے اور اس کا باقاعدہ انتظام ہے، اردو ہماری اس تہذیب کی علامت ہے جو صدیوں سے اس دیس کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے سے وجود میں آئی۔ یہ میل جول اور محبت کی زبان ہے، اشتراک و تعاون کی زبان ہے۔ جامعہ اس تہذیب اور اس کی اس زندہ علامت کی خدمت کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہے۔ اور اس کام کو اپنے طریقہ سے کر رہی ہے۔

تعلیمی ادارے قوموں اور جماعتوں کے، چاہے وہ اس منصب کو پسند کریں یا نہ کریں، فکر و نظر، کردار اور کلچر کے ترجمان بن جاتے ہیں، ملک میں ایسے غیر سیاسی، غیر جماعتی کالج اور یونیورسٹیاں ہیں جو اپنے آپ کو کسی مخصوص تہذیب کی نمائندہ درسگاہ نہیں سمجھتیں، اپنے طور طریقے، انتظام اور کام کے لحاظ سے وہ اچھی درسگاہیں ہیں، لیکن ان کی کوئی تہذیبی شخصیت نہیں، اور تہذیب کے بارے میں ہمارے یہاں جو ذہنی اور جذباتی الجھاوے ہیں اور جس طرح ہم اس اہم چیز کی طرف سے غافل ہیں، اس طرح کے کالج اور یونیورسٹیاں اس کی علامت بن گئی ہیں، ان حالات میں ایسی تعلیم گاہوں

میں درس وتدریس کا کام اچھا ہو سکتا ہے اور قوم کو ایسے شہری مل سکتے ہیں جن میں صلاحیت اور محنت سے کام کرنے کا شوق ہو، لیکن اس کا امکان بھی رہتا ہے کہ تہذیبی معاملات میں ان اداروں سے نکلے ہوئے نوجوان یا تو غلط راستے پر پڑ جائیں یا پھر شہری زندگی میں تہذیبی قدروں کی اہمیت کا انھیں کوئی علم اور احساس نہ ہو اور ان کے خیالات اور کردار قوم اور قومی تہذیب کی صحیح تصویر پیش نہ کر سکیں۔ اس وقت نوجوانوں میں جو بے چینی اور سارے ملک میں جو مایوسی نظر آرہی ہے وہ شاید اسی تعلیم کا نتیجہ ہے جو اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے کتراتی رہتی ہے۔

ہمارے دیس میں ایسے تعلیمی ادارے بھی ہیں جن کا ایک مخصوص مذہبی نصب العین ہے اور اس لئے وہ جس تہذیبی مسلک کی اشاعت کرتے ہیں وہ اس خاص مذہب سے منسوب ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے جن کے یہاں کسی اور تہذیب کی گنجائش نہیں رہتی، ایک محدود اور مخصوص حلقے میں ان کا طرز فکر مثبت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے ہر وقت اس کا خطرہ رہتا ہے، اور اس کا انھیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کے طرز فکر اور طریقۂ کار سے ہندوستان کی ملی جلی تہذیبی زندگی میں انتشار اور خلفشار کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ان دونوں قسم کے اداروں سے مختلف ہے۔ ملک کے اکثریتی طبقے کو اگر اس کی فکر نہ ہو کہ تعلیمی اداروں کا کوئی تہذیبی رول ہونا چاہیے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس کے لئے تہذیب کا مسئلہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن اقلیتوں کے قائم کئے ہوئے اداروں کے لئے اس کی فکر ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے ملک کی مشترک زندگی میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکتے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی اسی مقصد کے پیش نظر اور اس صورت حال کو اس نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا۔ اس نے ایک طرف اپنے مخصوص تہذیبی مسلک کا حق ادا کیا ہے اور دوسری طرف قومی زندگی کے ہر شعبہ میں برابر کی شریک رہی ہے۔ اس نے ایک اقلیتی ادارہ ہوتے ہوئے بھی اپنے دروازے دوسرے مذہب والوں کے لئے ہر وقت کھلے رکھے۔ یہاں ہر مذہب کے لوگ معلم اور متعلم کی حیثیت سے مل جل کر رہے ہیں، مذہب کو اس نے ملی جلی

رگی اور باہمی ربط کے رجحان کو بڑھانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہاں مذہب کا رد عمل یہ رہا ہے کہ "فصل" کے ئے "وصل" کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ فکر و عمل سے اس خیال کی اشاعت کی گئی ہے کہ ہندو، مسلمان، لہ، عیسائی سب ایک ہندوستانی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور اس ملک میں سب کے برابر کے حقوق ر فرائض ہیں۔

آج ملک و قوم کو جہاں اس کی ضرورت ہے کہ جدید علوم اور ٹیکنولوجی کی دنیا میں اپنا وقار قائم کرے ں طرح اس کی بھی ضرورت ہے کہ ملک کی ملی جلی تہذیب کی خصوصیات اور اعلیٰ قدروں کے تحفظ کی ربھی کی جائے۔ جامعہ نے قدیم اور جدید کے امتزاج کو اپنا مسلک بنایا اور قومیت اور قومی تہذیب ، بارے میں اس نے اپنے نظریہ کو کبھی کسی مصلحت پر قربان نہیں کیا۔ اس وقت تعلیم اور تہذیب، م اور قومیت کے بارے میں ملک میں طرح طرح کی باتیں کہی جا رہی ہیں، اور اس سلسلہ میں ذہنی الجھاؤ ہتے جا رہے ہیں۔ جامعہ اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے اپنا فرض منصبی سمجھتی ہے کہ وہ اس صورت حال ایک چیلنج کے طور پر قبول کرے اور اپنی تعلیمی اور تہذیبی روایات کی روشنی میں، جس حد تک وہ کتی ہے، اس فضا کو صاف کرے جو تعلیم و تہذیب کی مبہم اور پیچیدہ تعبیروں سے مکدر ہو رہی ہے۔

عبداللطیف اعظمی

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس

چھٹا اجلاس

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا، جس کا صدر دفتر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے، پانچواں اجلاس اکتوبر ۱۹۶۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد ہوا تھا، جو اپنے مباحث اور شرکاء کی تعداد کے لحاظ سے بہت کامیاب ہوا تھا، اسلام اور تحقیق و ادب کے بہت سے اہم مسائل پر مقالے پڑھے گئے تھے اور بہت ہی پرسکون ماحول میں انتہائی نظم وضبط کے ساتھ بعض اختلافی مسائل پر بحث وگفتگو ہوئی تھی۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب کا انگریزی میں خطبۂ استقبالیہ پروفیسر ہمایوں کبیر کا، جواب مرحوم ہو چکے ہیں، انگریزی میں زبانی خطبۂ افتتاحیہ اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا اردو میں خطبۂ صدارت اب تک یاد ہیں اور علمی و تحقیقی حلقوں کو عرصے تک یاد رہیں گے۔ امسال اس کانفرنس کا چھٹا اجلاس ۳۰، ۳۱ دسمبر کو جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کی صدارت میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں منعقد ہوا۔ اعظم گڑھ تہذیب و ترقی کے مرکزوں سے الگ تھلگ ایک چھوٹا سا ضلع ہے، جہاں دارالمصنفین اور چند مشہور عربی مدارس کے علاوہ دلچسپی اور کشش کی اور کوئی چیز نہیں ہے، مگر یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ ملک کے مختلف حصوں سے پچپن ۵۵ نمایندوں نے شرکت کی اور دارالمصنفین کے مدعو مہمان ان کے علاوہ تھے۔

اس کانفرنس کا بنیادی موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اسلامیات ہے، مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ علماء اسلام اس میں بہت کم دلچسپی لیتے ہیں اور مشہور علماء عام طور پر شرکت سے گریز کرتے ہیں، اسی بنا پر پانچویں اجلاس کے مقامی سکریٹری جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اجلاس سے قبل رسالہ جامعہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شکایت کی کہ "راقم الحروف اس کے تین اجلاسوں میں شرکت کر چکا ہے اور ان سب میں ایک کمی جس کا اسے شدید احساس ہوا یہ تھی کہ عربی مدارس کے بہت کم لوگ اس میں شریک ہوئے، حالانکہ دعوت ہر اجلاس کے لیے کافی لوگوں کو بھیجی گئی، اس "عالمانہ بے نیازی" کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی" اجلاس کے بعد اس کی روداد میں یہ شکایت پھر دہرائی جو دسمبر ۱۹۶۷ء کے جامعہ میں چھپی تھی۔ لکھتے ہیں:

"یہ کانفرنس یوں بھی مفید ہو سکتی ہے کہ مدارس عربیہ کے ارباب علم و نظر اس طرف توجہ کریں اور فعال عنصر کی حیثیت سے اس کے اجتماعات میں شریک ہوں، لیکن نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ یہ حضرات اپنے

> صنم خانوں سے باہر نہیں آتے، اگر یہ بات ہے کہ وہ اسے اپنے تقویٰ و طہارت کے شایانِ شان نہیں سمجھتے کہ دنیوی اداروں میں کام کرنے والوں کے ساتھ بیٹھیں تو یہ بڑی غیر اسلامی بات ہے، مگر میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے، اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں مدارس عربیہ میں جو علم پڑھایا جاتا ہے، وہ نصاب کی چند کتابوں تک محدود ہے جو بہت پہلے لکھی گئی تھیں۔ حالانکہ ان میں جو مسائل ہیں وہ آج بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ اس وقت تھے، البتہ انھیں نئے ذہن کو نئی زبان، نئی اصطلاحوں اور نئے انداز سے سمجھانا ہوگا.... ہمارے علماء اس کے لیے آمادہ نہیں.... یہی وہ اندازِ فکر ہے جس نے مسلم سماج کو جمود و تعطل کے شکنجہ میں ایسا مجبور کر دیا ہے کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن....“ (صفحہ ۲۹۵)

مگر خوشی کی بات ہے کہ اس مرتبہ علماء کی تعداد اچھی خاصی تھی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا سعید اکبر آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مولانا شاہ معین الدین ندوی، میزبان ہونے کی وجہ سے شرکت پر مجبور تھے، مگر ان کی شرکت کی وجہ سے بھی اجلاس میں وزن پیدا ہوا، اس لیے ان کا ذکر بھی مہمانوں میں کیا جا سکتا ہے، ان کے علاوہ مولانا قاضی سجاد حسین، مولانا محمد یوسف کوکن عمری (صدر شعبۂ عربی و فارسی مدراس یونیورسٹی)، مولانا مفتی محمد رضا انصاری (شعبۂ دینیات علی گڑھ)، مولوی سید محمد رابع ندوی (ندوۃ)، مولوی ضیاء الدین اصلاحی (دار المصنفین)، مولوی فضل الرحمٰن گنوری (شعبۂ دینیات علی گڑھ) اور مقامی مدارس کے علماء بھی کافی تعداد میں شریک ہوئے، اسی طرح، حسبِ معمول، اسکالر اور محققین کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی، مثلاً مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم، جو شروع سے اب تک اس کانفرنس کے جنرل سکریٹری رہ چکے ہیں، ڈاکٹر سید مقبول احمد (جوائنٹ سکریٹری)، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری (خازن)، سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مقامی سکریٹری)، پروفیسر عبدالقادر سروری (صدر شعبۂ اردو سری نگر)، پروفیسر سید امیر حسن عابدی (شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر سید حسن (صدر شعبۂ فارسی پٹنہ)، پروفیسر عطاء الرحمٰن (پٹنہ یونیورسٹی)، پروفیسر مسعود حسن (صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ)، ڈاکٹر عطا کریم برق (شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ)، ڈاکٹر محمد صابر خاں (پرنسپل گورنمنٹ کالج بنگال)، ڈاکٹر بدر رضا بیدار (انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز دہلی)، سید اوصاف علی (انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز دہلی) وغیرہ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے موجودہ اور سابق اساتذہ اور کارکنوں نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی، مثلاً جناب سعید انصاری، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، جناب عبدالحلیم ندوی، ڈاکٹر مشیر الحق جامعہ کے قدیم طالب علم اور سہ ماہی رسالہ ”اسلام اور عصرِ جدید“ کے نائب مدیر ڈاکٹر محمود الحسن اور راقم الحروف۔ مولانا عبدالسلام صاحب نے ”مجد الدین محمد بن یعقوب الفیروزی“ پر مقالہ لکھا تھا، مگر وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھا نہ جا سکا۔ انشاء اللہ جامعہ میں شائع ہوگا، جناب عبدالحلیم ندوی صاحب نے عباسی دورِ اول کی عربی غزل، ڈاکٹر مشیر الحق صاحب نے فتویٰ نویسی میں عصری تقاضوں کا مقام اور ڈاکٹر محمود الحسن نے ابن اثیر کا مورخانہ مرتبہ پر مقالے پڑھے اور راقم نے اپنے مقالے میں عربی مدارس کے نصابِ تعلیم کی اصلاح اور تاریخِ اسلام کو نئے انداز سے

لکھنے پر زور دیا۔

اس مرتبہ علماء کا پلّا بھاری رہا اور اسلامی علوم و فنون کا اچھا چرچا رہا۔ مولانا شاہ معین الدین ندوی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے افتتاحی اور دوسرے مختلف مواقع کی تقریروں میں اور حکیم عبدالحمید دہلوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں ان علمی اور اسلامی خدمات کا ذکر کیا جو ہندستان کے علماء نے انجام دی ہیں، عام طور پر علماء مستشرقین کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے مگر خطبۂ استقبالیہ اور خطبۂ صدارت میں ان کی اسلامی خدمات کو سراہا گیا، اگرچہ شاہ صاحب نے ان کی تعریف کے ساتھ یہ شکایت بھی کی کہ "بعض مستشرقین نے مختلف تاریخی، سیاسی اور مذہبی اسباب کی بنا پر مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی بڑی غلط تصویر پیش کی ہے"۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے اپنی اختتامی تقریر میں کانفرنس کے مقاصد عربی مدارس کے نصاب تعلیم اور بعض ایسے موضوعات پر جن پر اس اجلاس میں بحث و گفتگو آئی تھی، بہت اچھے انداز میں اظہار خیال کیا، شاہ معین الدین صاحب نے جنوری کے معارف میں اس تقریر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ان کی تقریر خیالات کے اعتدال و توازن کی بنا پر ہر خیال کے اہل علم نے پسند کی"۔ جدید مطالعہ اور تحقیق میں معروضیت پر بہت زور دیا جاتا ہے، مگر مولانا ابوالحسن علی صاحب اس کے خلاف ہیں، وہ اسلام کے مطالعہ کے لیے عقیدت بھی ضروری سمجھتے ہیں، ہمدردی بھی اور جذباتی تعلق بھی، اس لیے انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس کے خلاف تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے بھی اس مسئلے پر اظہار خیال کیا اور فرمایا کہ اگرچہ سَو فیصدی کوئی شخص معروضی نہیں ہو سکتا، مگر علمی اور تحقیقی مباحث میں، خصوصاً ایسے مواقع پر جب مخاطب صرف عقیدت مندہی نہ ہوں تو معروضی انداز زیادہ مفید اور مناسب ہوتا ہے۔

دارالمصنفین نے اس موقع پر اپنے یہاں کے مخطوطات اور مطبوعات کی نمائش بھی کی تھی، مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی کتابوں کے مسودوں اور ہندوستان اور بیرون ہند کے اہل خطوط بھی اس نمائش میں رکھے گئے تھے، جن کو مہمانوں نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے دیکھا اور پسند کیا۔

اعظم گڑھ میں شبلی کی یادگار دارالمصنفین کے علاوہ مولانا حمیدالدین فراہی کی یادگار مدرستہ الاصلاح بھی اپنی خدمات کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کانفرنس سے ایک روز پہلے نمائندوں کا مدرسہ میں استقبال کیا گیا، جس میں مدرسہ کے ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی صاحب نے مدرسہ کا تعارف کرایا اور مولانا فراہی کی تفسیر کی خصوصیات پر روشنی ڈالی، جامعہ کے ایک قدیم طالب علم برادرم مولوی عبدالرحمن ناصر اصلاحی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مہمانوں کی طرف قاضی سجاد حسین صاحب اور مولانا سعید اکبرآبادی صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے مولانا فراہی کو خراج عقیدت پیش کیا، اور مولانا اکبرآبادی صاحب نے ان کی تفسیر کی خصوصیات پر بڑی عالمانہ تقریر کی۔

اگلے اجلاس کے متعلق طے ہوا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں منعقد ہوگا اور اس کے صدر ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب ہوں گے۔ اس طرح علمی سطح پر قدیم و جدید کو قریب سے قریب تر آنے کا ایک اور موقع ملے گا۔ امید کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

Regd. No. D - 758 February, 1970

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۱	بابت ماہ مارچ ۱۹۷۰ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

اڈیٹر: ۷۴۲۵۸ منیجر: ۷۴۴۷۶

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

فروری کے شذرات میں ہم نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا تھا جنھوں نے بمبئی میں جامعہ کی گولڈن جوبلی کے سلسلہ میں ہماری مدد کی تھی، اس فہرست میں تین اہم اشخاص کا ذکر نہیں تھا، یہ ہیں جناب سکندر علی وجدؔ، جناب ناظر لطیف اور جناب شاہد علی خاں، جامعہ میں کون ایسا ہے جو وجدؔ صاحب سے واقف نہیں ہے، استاد اور طالب علم سب اُن کی شخصیت سے متاثر اور ان کی شاعری کے قدردان ہیں، ہم لوگ بہت خوش ہوئے جب امسال صدر جمہوریہ ہند نے انھیں 'پدم شری' کا خطاب دیا، جامعہ والے انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔ وجدؔ صاحب نے بمبئی میں ہمیں کئی مفید مشورے دئے، کئی ایسے حضرات سے ملاقات کرائی جن کے وسیلے سے جوبلی کے موقع پر جامعہ کو خاصی امداد مل سکتی ہے، وقت نکال کر اور زحمت کر کے ہمارے ساتھ کئی جگہوں پر گئے اور ایسے کام کے لئے گئے جن سے عام طور پر خوددار طبیعتیں کتراتی ہیں، یعنی چندہ مانگنا، اس پر مستزاد ان کی صحبت میں شعر و شاعری اور زبان و ادب کے مسئلوں پر پُرلطف گفتگو، الغرض اس بار انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور دل جو پہلے ہی سے اُن کے فتراک کا نخچیر تھا، اُن کی شخصیت کے دام کا مستقل طور پر اسیر بن گیا۔

ناظر لطیف صاحب ایک برطانوی کمپنی کے جنرل منیجر ہیں اور غالباً پہلے ہندوستانی ہیں جن کا تقرر کمپنی کی اس پوسٹ پر ہوا ہے، انھوں نے ہمیں مدعو کیا اور دیر تک ہمارے بمبئی آنے کے مقصد پر گفتگو کرتے رہے، وعدہ کیا کہ وہ پوری مدد کریں گے اور جامعہ کو اچھی خاصی رقم دلوائیں گے، شاہد علی خاں صاحب مکتبۂ جامعہ کی شاخ بمبئی کے انچارج ہیں اور اپنا کام بڑی محنت اور حسن و خوبی سے کر رہے ہیں، بمبئی میں، ایک لحاظ

سے، مکتبہ کی دوکان ہی ہمارا ہیڈ کوارٹر ہوتی ہے، ان بمبئی کے شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں سے ملاقات ہوجاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ بمبئی میں اردو کے کیسی کیسی صلاحیت والے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ شاہد صاحب نے جامعہ کے لئے اپنے حلقے میں کام بھی کیا اور مزید کوشش کا یقین بھی دلایا، امید ہے کہ ان کی کوششیں جاری رہیں گی اور ان کی کاوش سے چندہ کی فراہمی میں بڑی برکت ہوگی۔

تعطیلات سرما میں مدرسۂ ثانوی کے استاد جناب محمد حسین صاحب اور جامعہ کے اسٹیورڈ جناب محمد شمیر ندوی صاحب بھی جوبلی کے کام کے لئے باہر گئے تھے، ان کا سفر کلکتہ اور اس کے مضافات کا تھا۔ چند روز وہ لکھنؤ میں بھی ٹھہرے تھے جہاں مولانا علی میاں صاحب نے جامعہ کی مسجد سے جو زیر تعمیر ہے، بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور ایک اپیل بھی لکھ کر دی، ہم سب ان کے ممنون ہیں۔ لکھنؤ اور کلکتہ میں ہمارے قدیم طالب علموں نے ان لوگوں کی بہت مدد کی، پچاس سال تک تعلیم کا کام کرنے کے بعد جامعہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اس کی معنوی اولاد دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور مادر علمی کی خدمت اپنی سعادت تصور کرتی ہے۔ ہم لوگوں کو اس سے تقویت ملتی ہے اور ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے۔ حسین صاحب اور شمیر صاحب نے پرانے طالب علموں کو زندگی کی تگ و دو میں مصروف پایا، اُن میں کام کرنے اور ترقی کرنے کی لگن پائی اور اسی کے ساتھ جامعہ کی خدمت کا جذبہ بھی ان میں محسوس کیا، یہ سب باتیں اس کی دلیل ہیں کہ جامعہ کی تعلیم و تربیت رائیگاں نہیں گئی۔

اس سفر میں ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو ایسے لوگ بھی ملے جنھیں جامعہ سے کچھ شکایتیں ہیں۔ اس پر ہم متعجب نہیں ہوئے، قوم کو تنقید اور شکایت کا حق ہے اور وہ تنقید اور شکایت نہ کرے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ اُسے اب ہم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ جامعہ انسانوں کی بستی ہے، فرشتوں کی نہیں، اور انسانوں سے غلطی ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ اکثر اپنی غلطی نظر نہیں آتی، دوسرے اسے جلد دیکھ لیتے یا محسوس کرتے ہیں اور اسی میں صاحب استعداد طبیعتوں کی اصلاح کی گنجائش ہوتی ہے، یا کم از کم یہ ہوتا ہے کہ اپنے

آپ کو جانچنے اور پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسرے جسے غلطی سمجھ رہے ہیں وہ ہرے سے غلطی ہی نہ ہو لیکن اسے انسان کو اپنے فعل کے جانچنے کا وسیلہ سمجھنا چاہیئے اور اس پر ناراض ہونے کے بجائے معترضین کا ممنون ہونا چاہیئے۔

جامعہ کے معترضین کئی طرح کے ہیں۔ ان میں ایک قسم اُن لوگوں کی ہے جو جامعہ کے کسی اہم کارکن سے محض ذاتی اسباب کی بنا پر ناراض ہو گئے ہیں، اس کی وجہ سے پورا ادارہ اُن کی زد میں ہے، اس کا کوئی کام ان کو پسند نہیں، اس کی کوئی ادا انھیں نہیں بھاتی۔ ان کے ساتھ وہی معاملہ ہے کہ

قصور ڈھونڈ کے پیدا کئے جفا کے لئے

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اس بات کی شکایت بھی ہے کہ ہمارے اعتراضات کا جواب جامعہ والے نہیں دیتے۔ اب آپ خود بتائیے کہ ایسے اعتراضوں کا بھلا کیا جواب ہو سکتا ہے جن کی بنیاد ذاتی رنجش یا ذاتی پسند اور ناپسند پر ہو، ادارے اجتماعیت کے مظہر ہوتے ہیں ذاتیات کے نہیں۔

دوسری قسم ان معترضین کی ہے جنھیں حقیقت حال کا صحیح علم نہیں، لیکن چونکہ ہمارے قومی مزاج میں معروضیت کے بجائے داخلیت کو زیادہ دخل ہے، اس لئے کسی خبر کو سُن کر فوراً متاثر ہو جاتے ہیں اور ایک رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اس طرح کی غلط فہمیوں کے شکار وہ لوگ زیادہ ہوتے ہیں جو ہر چھپی ہوئی چیز کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں، ایک مثال لیجیئے۔ برسوں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بعض حضرات یہ خبر چھاپتے رہے کہ جامعہ والے مسجد کی تعمیر کے خلاف ہیں اور جو کچھ روپیہ اس کے لئے جمع ہوا تھا وہ خُرد بُرد ہو گیا ملک میں بہت سے لوگ تھے جنھیں اس کا یقین تھا کیونکہ یہ ہفوات اخباروں میں چھپتے تھے اور بڑے ثقہ لوگوں کے اخبار یہ سب چھاپ دیتے تھے۔ بمبئی میں ایک صاحب نے جو اس طرح کی خبروں سے متاثر معلوم ہوتے تھے مجھ سے بڑے محتاط لفظوں میں سوال کیا: "صاحب! یہ بتائیے جامعہ کو قائم ہوئے پچاس برس ہو گئے، اب تک وہاں مسجد کیوں نہیں بنی ہے" میں نے کہا کہ آپ کے پاس وقت ہو اور آپ

سننے کے لئے تیار ہوں تو عرض کروں۔ وہ اس کے لئے آمادہ تھے، میں نے پوچھا "آپ جامعہ کی تاریخ سے واقف ہیں؟" انھوں نے کہا بتائیے۔ میں نے انھیں مختصراً جامعہ کی کہانی سنائی اور کہا کہ جامعہ کی مسجد علی گڑھ میں بن نہیں سکتی تھی، پھر وہ دہلی میں قرول باغ میں لائی گئی جہاں اس کا قیام عارضی تھا اور کرایے کے مکانوں میں اپنے دن گزار رہی تھی، ۱۹۳۶ء میں اس کا قافلہ اوکھلا گاؤں کے قریب اترنے لگا، تھوڑی تھوڑی کر کے زمینیں خریدی جانے لگیں، پہلے مدرسۂ ابتدائی کی عمارت بنی، پھر مدرسۂ ثانوی کی اور وہ بھی یہ عمارتیں جس طرح برسوں کاسۂ گدائی لے کر پھرنے کے بعد بنی ہیں اس کا حال کچھ جامعہ والے ہی جانتے ہیں، ایسی صورت میں جب مہینوں استادوں کی تنخواہیں نہ ملتی ہوں اور مطبخ قرض پر چلتا ہو کہ پیٹ کا تقاضا ایک دن بھی انتظار نہیں کر سکتا، ٹین کا ایک معمولی سا ہال نماز کے لئے بنایا تو جا سکتا ہے، (اور جامعہ نے محمد علی ہال کے نام سے اس کا انتظام کر لیا تھا) ایک اہم تعلیمی ادارے کی مسجد کی تعمیر جو اس کے شایان شان ہو، کیسے ہو سکتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب مرحوم اور جامعہ کے دوسرے کارکنوں کو برابر اس کا خیال رہا کہ جامعہ میں ایک شاندار مسجد ہو اور اسی لئے سلور جوبلی کے موقع پر مسجد کے لئے چندہ کی مہم شروع کی گئی اور کوئی پینتالیس۴۵ ہزار روپے جمع ہوئے، ذاکر صاحب نے مسجد اور بیت الحکمت کی مشترک عمارت کے لئے جرمن آرکیٹیکٹ ہائینز سے جو نقشہ تیار کرایا تھا اس کے مطابق اس وقت کے لحاظ سے کوئی دس لاکھ کی لاگت آتی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں سلور جوبلی ہوئی اور ۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا، سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور جامعہ ہی کو بچانا مشکل ہو گیا۔ برسوں یہی انتظار رہا کہ حالات ٹھیک ہوں تو اس کثیر رقم کے لئے قوم سے اپیل کی جائے، اور اب سیکڑوں مایوسیوں کے بعد کم لاگت کی مسجد کا جو تقریباً پانچ لاکھ روپے ہے، نقشہ بنوایا گیا ہے اور خدا کا نام لے کر مسجد کی تعمیر شروع کر دی گئی ہے ـــــ میں نے یہ بھی کہا کہ ہمارا یہ خیال غلط نکلا کہ جیسے ہی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی کم از کم معترضین تو ہر طرح کی امداد کے لئے تیار ہو ہی جائیں گے۔ اب ہمیں اس سلسلہ میں جو دشواری ہو رہی ہے ہمیں جانتے ہیں، پھر بھی خدا کی ذات سے امید ہے کہ اب جبکہ یہ کام شروع ہو گیا ہے، پورا بھی ہو جائے گا، جس کا کام ہے وہ خود ہی مسلمانوں سے یہ کام کرا لے گا، ہمارا کام کوشش کرنا ہے خواہ

اس میں کتنی ہی دشواریاں ہوں ـــــ مخاطب کی طبیعت چونکہ صالح تھی اس لئے میری بات کا ان پر اثر ہوا اور انھوں نے نہ صرف یہ کہ جامعہ کی مشکلات کو سمجھا بلکہ مسجد کے لئے چندہ بھی دیا۔

معترضین کی یہی وہ قسم ہے جنھیں اگر صحیح صورت حال بتائی جائے تو ہمدرد بن جاتے ہیں۔ لیکن ایک طرح کے لوگ اور ہیں جو چندہ دینا نہیں چاہتے اور اپنی اس نیت کو جامعہ پر اعتراضات کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ اِن کی گفتگو کا انداز، لب و لہجہ اور بحث کے بیشتر بڑے دلچسپ ہوتے ہیں، وقت ہو تو ایسے لوگوں کے نفسیاتی مطالعہ سے فکر وعمل کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے تھکی ہاری زندگی بھی حسین نظر آنے لگتی ہے۔ مثلاً ایک شہر میں مجھ سے ایک صاحب نے کہا: ’صاحب! آخر چندے سے مسلمانوں کا کام کب تک چلے گا؟‘ یہ سوال کتنا فکر انگیز ہے؟ ایک دوسرے صاحب نے فرمایا: ’آپ خود بتایئے، کس کس کو چندہ دیں اور کہاں تک دیں؟‘ جنوبی ہندوستان کے ایک شہر میں کہا گیا ’جسے دیکھئے، شیروانی پہنے شمالی ہندوستان سے چندے کے لئے چلا آتا ہے، کیا ہم انھیں لوگوں کے لئے کماتے ہیں؟‘ یہ اور اس طرح کی سبھی باتیں ہنسی میں ٹال دینے والی نہیں ہیں، کچھ ایسی ہیں جن پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے، خواہ چندہ ملے یا نہ ملے۔

غور فرمایئے مسلمانوں کی کتنی جماعتیں اور ادارے محض چندے کے بل بوتے پر چل رہے ہیں، یہاں اس سے بحث نہیں کہ مسلمانوں کو من حیث الجماعت ان جماعتوں اور اداروں سے کتنا فائدہ پہونچ رہا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں چندے پر گزر بسر کرنے والوں کی تعداد چندہ دینے والوں سے زیادہ ہے۔ پھر اس پر آئے دن کے فسادات جن میں مسلمان پٹتا ہے، لٹتا ہے، برباد ہوتا ہے، ان کی امداد اور بحالی کا انتظام بھی مسلمانوں ہی کو کرنا پڑتا ہے، اپنے گذشتہ سفر کے دوران میں نے یہ بھی دیکھا کہ کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہیں جہاں مسجدیں اور مدرسے، اسکول اور کالج، شفاخانے اور مسافر خانے نہ بن رہے ہوں یا بنانے کے منصوبے نہ ہوں، آخر اس

کے لئے مسلمانوں ہی نے چندہ دیا ہوگا یا انھیں کو دینا ہوگا، میرا اندازہ تو یہ ہے کہ مسلمان دل کھول کے پیسے دیتا ہے، اگر ان پیسوں کا صحیح مصرف ہو اور کسی نظم و ضبط سے ہو تو ہمارے بہت سے کام ہو جائیں اور سلیقے سے ہو جائیں۔

میں نے جب کبھی یہ بات سنی کہ مسجد کا کام رکتا نہیں، پورا ہو کر رہتا ہے تو ایمان میں ایک تازگی سی محسوس ہوئی، لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال آیا کہ غریب، شوقین اور ہونہار بچوں اور بچیوں کے لئے وظائف فنڈ کی فراہمی کا کام شاید اللہ میاں کو پسند نہیں ورنہ کوئی ایک بندۂ خدا تو یہ کہتا کہ یہ نیک کام ہے، شروع کردو، ضرور پورا ہوگا۔ میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا ہے اور میں کسی طرح یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ غریبوں اور ناداروں کی تعلیم کے لئے وظائف فنڈ کا انتظام کوئی دینی کام نہیں ہے، میرے خیال میں تو آج یہ ایک اہم دینی کام ہے جس کی طرف ارباب خیر کو پوری توجہ دینی چاہئے، قوم کی تعلیمی حالت ٹھیک نہ ہوئی، اور ہمارے باصلاحیت نوجوان ناداری کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے تو قوم کی معاشی حالت ٹھیک نہ ہوگی اور معاشی حالت اچھی نہ ہوئی تو اخلاقی حالت کے بہتر ہونے کی توقع نہیں اور پھر جس قوم یا جماعت کی اخلاقی حالت بگڑ جائے تو اس سے دینی فلاح اور دنیوی بہتری کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ بات کسے سمجھائی جائے اور کیسے سمجھائی جائے۔

ایسے موقع پر مجھے ہمیشہ مسدس حالی کی یاد آتی ہے، اس پر یقیناً بہت سے لوگ چونکیں گے لیکن کبھی کبھی پیچھے مڑ کے بھی دیکھ لینا چاہئے، مسدس حالی اس لئے نہیں لکھی گئی تھی کہ مسلمانوں کو 'پدرم سلطان بود' کا سبق یاد دلایا جائے، اس کا مقصد اصلاحی تھا، اس میں خاص طور سے وہ حصہ پڑھنے کے لائق ہے جہاں مسلمانوں کی اخلاقی ابتری کا نقشہ کھینچا گیا ہے، کئی لحاظ سے مسلمانوں کی وہی حالت آج بھی ہے جو حالی کے زمانے میں تھی، اس حصہ کو پڑھنے اور بار بار پڑھنے

کی ضرورت ہے کیونکہ ہمارا جہاز گرداب میں پھنس گیا ہے اور ہر چھوٹے بڑے کی جان جوکھوں میں ہے۔
ذیل کے تین بند پڑھئے اور غور وفکر کیجئے:

کسی نے یہ اک مردِ دانا سے پوچھا — کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا "عقل جس سے ملے دین و دنیا" — کہا "گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرا"

کہا "پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے"

کہا "گر نہ ہو اس کو یہ بھی میسّر" — کہا "مال و دولت ہیں پھر سب سے بڑھ کر"
کہا "در ہو یہ بھی اگر بند اس پر" — کہا "اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر"

وہ ننگِ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو — مبادا کہ وہ ننگِ عالم تمہیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو — تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو

وگرنہ یہ قول آئے گا راست تم پر
کہ "ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر"

کرشن چندر

اردو کا مقدمہ

دسمبر ۱۹۶۹ء کے آخری دنوں میں جو اردو کنونشن منعقد ہوا تھا اس کے پروگرام کا وہ جلسہ یادگار رہے گا جس میں پردھان منتری اندرا گاندھی تشریف لائی تھیں اور ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں کے ادیبوں کی طرف سے اُن کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا گیا تھا۔ اس موقع پر اردو اور ہندی کے مشہور ادیب کرشن چندر نے کنونشن کے صدر کی حیثیت سے اردو کا مقدمہ جن الفاظ میں پیش کیا تھا، وہ درج ذیل ہیں۔ پچھلے شمارے کے شذرات میں ہم نے اس کنونشن کے متعلق اپنے خیالات و تاثرات بیان کر دیے تھے۔

"مدیر"

پردھان منتری جی، معزز مہمانو اور دوستو،

آج کی عدالت میں اردو کا مقدمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ عدالت کسی ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کی عدالت نہیں ہے بلکہ آپ کے دل، ضمیر اور کانشی اَنس کی عدالت ہے جس کے سامنے ایک بے بس، مجبور اور مظلوم زبان اپنے لئے، اپنی زندگی اور اس کی حفاظت کا حق مانگنے آئی ہے، اور یہ حق اس کو ملنا چاہئے، کیونکہ اردو کہتی ہے، میں اسی ملک کی ایک زبان ہوں، میں کوئی بدیسی زبان نہیں ہوں کہ مجھے دیش نکالا دیا جائے، میں اسی ملک کی زبان ہوں۔ میں دہلی اور لکھنؤ کے قرب و جوار میں پیدا ہوئی۔ میری دلکشی اور آپ کی محبت نے مجھے بڑھاوا دیا اور میں دھیرے دھیرے سارے شمالی ہند میں پھیل گئی، مجھے یوپی، بہار، دہلی، ہریانہ، راجستھان میں کروڑوں لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہی میرا وطن ہے، یہی میرا گھر

ہے۔ اس مٹی کی بوباس میرے انگ انگ میں رچی ہوئی ہے۔ میں اس دیش کے کروڑوں لوگوں کا مزاج ہوں، ان کی بول چال کی زبان ہوں، ان کے کلچر کا حصہ ہوں۔ مجھے میرا گھر دیدیجئے۔ مجھے میرا وطن واپس ملنا چاہیئے۔

اردو زبان کہتی ہے کہ میں کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں ہوں، کچھ کمیونل لوگ، کچھ تنگ نظر لوگ مجھے صرف مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔ حالانکہ اگر ایسا ہی ہوتا تو بھی کوئی بُرا نہ ہوتا۔ کیا اس دیش میں مسلمانوں کو اپنے دھرم، اپنے کلچر، اپنی شخصیت، اپنے مزاج اور اپنی زبان کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں ہے؟

لیکن میں تو یہ نہیں کہتی۔ اتہاس کے ورق الٹ جائیے۔ میں اپنی زندگی کے کسی حصے میں کسی ایک فرقے کی زبان نہیں رہی ہوں۔ مجھے اگر کروڑوں مسلمان بولتے ہیں تو کروڑوں ہندو، سکھ اور عیسائی بھی بولتے، سمجھتے ہیں۔ میں نے قرآن کے ساتھ ساتھ وید اور گیتا کو بھی اپنے سینے سے لگایا ہے۔ جپ جی کا پوتر پاٹھ اور مقدس بائبل کے اقوال میری روح میں رچ بس گئے ہیں۔ میری زبان میں اور میری لپی میں آریہ ساجیوں کے اخبار نکلتے ہیں، سناتن دھرمیوں کے اخبار نکلتے ہیں، جن سنگھیوں کے اخبار نکلتے ہیں، اکالیوں کے اخبار چھاپے جاتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ میرے چاہنے والوں میں اگر میرؔ اور غالبؔ تھے تو چکبستؔ، رتن ناتھ سرشارؔ اور دیاشنکر نسیمؔ بھی تھے۔ آج بھی میرے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں میں سبھی مذہبوں کے لوگ ہیں۔ میں وہ ماں ہوں جس نے اپنی گود میں ہر مذہب اور ہر دھرم کے بچوں کو پناہ دی ہے۔ کیا اس لئے میری گردن ماری جائے گی؟ کیا ماں کی محبت کا یہی انعام ہوتا ہے؟

میں ایک ہندوستان گیر اور جہاں گیر زبان ہوں۔ ایک عالم میں میری دلکشی، حلاوت اور حسنِ ادا کے چرچے ہیں، میں صرف دہلی، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، ہریانہ اور راجستھان ہی میں بولی اور سمجھی نہیں جاتی، مجھے اہلِ پنجاب اور اہلِ کشمیر نے بھی اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ ٹیگور کے وطن کی راجدھانی کلکتہ میں میرے درجنوں اخبار نکلتے ہیں۔ شری نائیک جس پرانت کے مکھیہ منتری ہیں اس کے سب سے بڑے شہر بمبئی میں بھی اردو کے بہت سے اخبار نکلتے ہیں اور ہر روز کسی نہ کسی محفل میں اس زبان

کے گیت گنگنائے جاتے ہیں۔ میرے اخبار اور رسالے بنگلور سے بھی شائع ہوتے ہیں اور مدراس اور اڑیسہ میں بھی مجھے سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ میں وہ زبان ہوں جو اپنے وطن شمالی ہند کے علاوہ دکن کے کروڑوں لوگوں کی جان ہے، میں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہوں، اور میں نے اپنے دل کا پیار، اپنی نگاہ کی نرمی اور اپنی روح کی حلاوت مختلف صوبوں میں رہنے والے مختلف قومیتوں کے لوگوں کو دی ہے، کیا اس لئے میرا منہ بند کیا جا رہا ہے؟ میں وہ زبان ہوں جس نے اِسی دھرتی پر جنم لیا۔ میں بھی ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل، ملیالم، اوڑیا، آسامی، سندھی، تلگو، کنڑ اور دوسری بھاشاؤں کی طرح بھارت ماتا ہی کی بیٹی ہوں، یہی میرا دیس ہے، یہیں میں پلی بڑھی اور سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور اب تو مجھے دوسرے دیسوں میں بھی مہان تا لی ہے، پاکستان والوں نے بنگالی اور پنجابی، سندھی اور بلوچی اور پشتو کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اپنایا ہے، میں ملیشیا میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہوں اور ایسٹ افریقہ میں بھی، لندن میں میرے تین اخبار نکلتے ہیں اور کئی رسالے، میں ہندوستان اور دوسرے دیسوں کے درمیان سمجھنے سمجھانے کے لئے ایک پُل کا کام کرتی ہوں، کیا اس لئے مجھے ڈائنا مائٹ سے اڑا دیا جائے گا؟

میں ایک سیکولر زبان ہوں، میں روزی روٹی کے لئے جدوجہد کرنے والی کروڑوں کی تعداد میں کام کرنے والے لوگوں کی زبان ہوں، میں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے ہر موڑ پر حصہ لیا ہے، میں نے ہندوستانی سماج کو بدلنے اور اُسے آگے بڑھانے کے لئے اپنی محنت، اپنا فن اور اپنے شاعروں اور ادیبوں کا لہو پیش کیا ہے اور اگر یہی میرا جُرم ہے تو میں اپنے جُرم پر فخر کرتی ہوں اور مجھے اس بات پر ناز ہے کہ ہر فیصلہ کن لڑائی میں میں نے ہندوستان کی جنتا کو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دیا ہے۔

آج پھر ہم ایک انقلابی موڑ پر کھڑے ہیں اور ہمارے دیش کی پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی اس نئے انقلابی موڑ کا نشان بن گئی ہیں اور ہماری آشاؤں اور امیدوں کا مرکز۔ پچھلے سماج نے اردو سے انصاف نہیں کیا کیونکہ اس نے اس دیش کی جنتا سے بھی انصاف نہیں کیا ہے۔ لیکن کیا نیا سماج اور ڈیموکریٹک سوشلزم کے راستے پر چلنے والے اور اس کا نرمان کرنے والے بھی اردو کے ساتھ انصاف نہیں کریں

گے ؟ ــــــ اردو کے ایک ادیب کی پچپنویں سالگرہ پر تقریر کرتے ہوئے اسی ہال میں شریمتی اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ لپی بھاشا کی کنجی ہوتی ہے اور ہم اردو والے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے کہ اردو زبان کو اس کی کنجی یعنی لپی کے ساتھ زندہ رکھا جائے، اس کے اپنے وطن میں زندہ رکھا جائے، ان تمام صوبوں میں اسے علاقائی زبان کا سرکاری درجہ دیا جائے جہاں ایک بڑی تعداد میں ہمارے دیش کی جنتا اسے بولتی اور سمجھتی ہے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں چاہتے، ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی اور ان کے وہ ساتھی جو ڈیموکریسی اور سوشلزم میں یقین رکھتے ہیں ان اصولوں کو اردو پر بھی لاگو کریں گے اور اس زبان کی حفاظت کریں گے۔ جو سماج اس زبان کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ سوشلسٹ سماج نہیں ہو سکتا، کوئی دوسرا سماج ہو سکتا ہے۔

انور صدیقی

کچھ انگریزی ادب کے اثرات کے بارے میں

ادبی اثرات پر گفتگو کرنا اور وہ بھی ماہرانہ گفتگو انتہائی مشکل اور نازک کام ہے اس لئے کہ ادبی اثرات کا داخلی اور خارجی شواہد کی مدد سے تعین خاصا محنت طلب ہے۔ بعض شعراء کے یہاں اگر ان اثرات کے داخلی ثبوت مل بھی جاتے ہیں تو یہ معلوم کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ واقعی شاعر نے براہ راست مطالعے کے بعد ان اثرات کو قبول کیا ہے اور انھیں اپنے فن پارے میں جگہ دی ہے۔ تقابلی ادب کا طالب علم بالعموم اسی طرح کی دشواریوں سے دوچار ہوتا ہے اور اکثر صورتوں میں جو نتائج نکالے جاتے ہیں وہ گمراہ کن ہوتے ہیں کیونکہ بعض اوقات مماثلت صرف اتفاقی ہوتی ہے واقعی نہیں۔ صرف اتفاقی مماثلت کو بنیاد بنا کر واضح طور پر ادبی اثرات کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی کیونکہ انسانی ردِّ عمل کی نہج عام طور پر ہر ملک و قوم میں یکساں ہوتی ہے۔

ہر ملک میں غیر ملکی ادبی اثرات دو مرحلوں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ پہلے دور میں صرف ترجمے کئے جاتے ہیں اور یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی رہتی ہے کہ کن غیر ملکی ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے فن پاروں کا ترجمہ کیا جارہا ہے۔ دوسرا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب یہ ترجمے تخلیقی ادب کو متاثر کرتے ہیں اور وہ بھی طرح طرح سے۔ کبھی براہ راست اثر کی صورت میں اور کبھی بالواسطہ طرز احساس میں تبدیلی کی شکل میں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ پہلا دور ترجمے کا اور دوسرا دور ترجمانی کا۔ ان سب سے بڑھ کر ایک منزل وہ آتی ہے جو شاید سب سے معتبر منزل ہے اور جس تک پہنچنا سب کے بس کی بات بھی نہیں ہے جب کسی ادب کی تخلیقی رَو اپنے طور پر غیر ملکی ادبی اثرات سے متاثر ہو

بے نیاز ہو کر طے ہوتی ہے اور اعلیٰ درجے کے ادبی اور فنی کارناموں کو جنم دیتی ہے۔ انگریزی ادب کے اثرات اردو میں بھی انھیں منزلوں یا مرحلوں سے ہو کر گزرے ہیں۔

غالباً اس بات سے آج کوئی انکار کی جرأت نہیں کر سکے گا کہ جہاں ہم نے انگریزی شعر و ادب کے ذریعہ اپنے ادبی سرمائے میں توسیع کی ہے وہیں ہم نے ان کے ذریعے اپنے آپ کو بھی پایا ہے۔ اس توسیع، خود آگہی اور اپنی بازیافت سے ہم نے علم، تہذیب، ادب اور سیاست کے شعبوں میں جو کچھ کھویا ہے یا پایا ہے اس کا تفصیلی تذکرہ شاید میں اس موقعہ پر نہ کر سکوں گا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ انگریزی شعر و ادب سے متاثر ہوئے بغیر ہم اپنی ملکی اور قومی تاریخ کی اس منزل میں نہیں پہنچ سکتے تھے جسے ہم ذہنی بیداری یا نشاۃ ثانیہ کی منزل کہتے ہیں۔ انگریزی ادب کے مطالعے اور جدید علوم سے آگہی نے ہماری جامد ذہنی زندگی کی سطح پر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو تموج پیدا کیا تھا اس کی لہریں آج بھی ہمارے فکر و احساس کو طرح طرح سے مرتعش کرتی رہتی ہیں۔ یہ لہریں کبھی کبھی گرداب بھی بنی ہیں مگر زیادہ تر ان کی وسعت سے ہماری فکری، تہذیبی اور ادبی زندگی کے تنگ دائرے ٹوٹے ہیں اور ہمارا ذہنی اُفق اور وسیع ہوا ہے۔ اردو علم و ادب کے شعبے میں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور سرسید کی علی گڑھ تحریک، انگریزی ادب کے زندہ اثرات کی تابندہ مثالیں ہیں۔ دہلی کالج میں ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے ہی علوم جدیدہ سے متعلق بہت سی تاریخ ساز تصانیف کا انگریزی سے ترجمہ ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں منشی ذکاء اللہ اور ماسٹر رام چندر کی خدمات سے کون واقف نہیں ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو کو ایک صاف، شائستہ اور سادہ نثر دینے کی کوشش کی۔ علی گڑھ تحریک نے جہاں ایک طرف وکٹورین انگلستان کی عقلیت، سائنسی طرزِ فکر اور حقیقت پسندی پر زور دیا وہیں اس نے ادب کے دوسرے میدانوں میں بھی کئی انقلاب انگیز تبدیلیوں کا مطالبہ کیا۔ قدیم ادب سے، جو بے مقصد اور ہیئت پرست ہو کر رہ گیا تھا اور فن کاری سے زیادہ صناعی پر زور دینے لگا تھا انگریزی ادب کے مطالعہ کی وجہ سے ایک طرح کی مقدس بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ یہ بے اطمینانی ہرگز پیدا نہ ہوتی اگر سرسید اور ان کے رفقاء کے ذہن میں وہ مطالبے نہ ہوتے جو آرنلڈ اور دوسرے وکٹورین انگریزی

ناقدین ادب سے کر رہے تھے۔ آرنلڈ اور اس کے معتقدین کا خیال تھا کہ ادب کو تنقید حیات کا فریضہ انجام دینا چاہیئے اور اسے ہر حال میں اعلیٰ تہذیبی اور انسانی اقدار کا پابند رہتے ہوئے انسانیت کے لئے قوت شفا فراہم کرنی چاہیئے۔ اس دور کے کئی نقاد ادب کو مذہب کا نعم البدل بنانا چاہتے تھے اس لئے کہ ڈارون کے نظریات نے ان کی نظروں میں عیسائیت کا مستقبل خطرے میں ڈال دیا تھا اور اس کے حقیقی احیاء کی کوئی صورت نظر آرہی تھی۔ ادب کو مقصدی یا افادی بنانے کا جو مطالبہ حالی، سرسید، شبلی اور نذیر احمد نے کیا اس کا ماخذ وکٹوریائی انگریزی ادب اور اٹھارویں صدی کے انگریزی ادب میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ علی گڑھ تحریک نے انیسویں صدی کے اوائل کی رومانی تحریک کے شعراء اور ادباء کے فنی کارناموں کی طرف توجہ نہ کی یا اس کی طرف سے بے توجہی برتی۔ غالباً یہ بے توجہی شعوری تھی اس لئے کہ رومانی تحریک عقل پر جذبے کو ترجیح دیتی تھی اور یہ رجحان علی گڑھ تحریک کی عقلیت پسندی کے منافی تھا۔ ذاتی طور پر سرسید کے لئے شاید وکٹورین عہد بھی کچھ پریشان کن ہی رہا ہوگا اس لئے کہ وہاں بھی شعری ادب رومانی تحریک کی توسیع کی حیثیت رکھتا تھا اگرچہ رومانیت کے خلاف ردِّ عمل کی ابتدا بھی ہو چکی تھی انھیں ذہنی سکون اٹھارویں صدی کی ادبی اور ذہنی فضا میں محسوس ہوا جہاں ایک طرح کی سرد عقلیت اور کلاسیکی نظم و ضبط کی حکمرانی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کو ایڈیسن اور اسٹیل کے رسالوں Tatler اور Spectator کے مذاق و معیار کے مطابق نکالنے کا اعلان و اظہار کیا۔ یاد رہے کہ یہ رسالے تہذیب و اخلاق کے اصولوں کو عام کرنے کی غرض سے اٹھارویں صدی میں نکالے گئے تھے اور ان کا مقصد بھی جذباتیت کو ختم کر کے عقلی رویوں کو فروغ دینا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے ہمہ جہت کارنامے فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ اس نے اردو شعر و ادب کو کیا کچھ نہیں دیا۔ اس نے انگریزی ادب کے وسیلے اور وساطت سے اردو کو صحافت، ناول نگاری، انشائیہ، سوانح نگاری اور تنقید نگاری کو یہی نہیں کہ معیار دیئے بلکہ نمونے بھی بخشے۔ اسی تحریک کے زیر اثر بیسویں صدی کی ابتدا میں انگریزی شاعری کے بے شمار کارنامے اردو میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوئے اور جدید اردو شاعری کا پیش خیمہ بنے۔ غلام محمد طور نے ورڈسورتھ کی نظم کوئل کا، عزیز لکھنوی نے طامس مور کی نظم مئی کے جوان چاند کا، سید علی حیدر نے

ِسکاٹ کی 'حبِ وطن' کا، آصف نے بائرن کی نظم 'نوحے' کا، فضل الٰہی نے شیلی کی نظم 'فلسفۂ محبت'
حبیب کنتوری نے گرے کی مشہور Elegy کا منظوم ترجمہ 'گم نام ناموڑ' کے عنوان سے کیا۔ یہ وہ چند
ہیں جو ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۹ء تک صرف مخزن میں شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ اور بھی کتنی نظمیں
انگریزی سے اردو کے قالب میں ڈھلیں۔ انگریزی نظموں کے اردو ترجموں کا ایک مجموعہ
ن فرنگ' کے نام سے مولوی محمد ضامن کنتوری صاحب نے حیدرآباد سے شائع کیا تھا جس پر
کے نومبر ۱۹۰۲ء کے شمارے میں ایک تعارفی تبصرہ شائع ہوا تھا۔ ان تمام ابتدائی ترجموں میں
ی مزاج سے ناواقفیت کی وجہ سے ناپختگی ضرور ہے مگر ان ترجموں نے تھوڑے سے عرصے میں
ح ہمارے شعراء کے طرزِ احساس کو بدلا اور اظہار کے روایتی سانچوں کو توڑا اسے وہی لوگ
تے ہیں جو ہمارے ادب کے ارتقاء کی تاریخ سے واقف ہیں۔ ان نظموں نے اردو میں مناظر
ن سے متعلق نظموں کی روایت کو آگے بڑھایا ـــــ وہ روایت جو کرنل ہالرائڈ کی ایماء پر انجمن
ٔ نے اپنے موضوعاتی مشاعروں سے شروع کی تھی۔ اردو کی رومانی شاعری میں اور بالخصوص
ل کی بانگ درا کی ابتدائی نظموں میں اِن ترجموں کے تخلیقی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ کہیں ترجمے
رت میں کہیں تاثر کی شکل میں۔

سرسید کے افادی نقطۂ نظر کے خلاف ادب برائے ادب یا انشاء لطیف کی تحریک کے ظہور میں
زیزی ادبیات نے نمایاں حصّہ لیا ہے۔ سجّاد انصاری، مہدی، بجنوری اور عظمت اللہ بیگ
ں اور شعری کاوشوں میں کہیں آسکر وائلڈ کا رنگ نمایاں ہے تو کہیں پیٹر (Pater) کا۔ سجّاد
ی کی فطانت میں آسکر وائلڈ کی ذہانت کی دھار محسوس ہوتی ہے۔ بجنوری نے پورے مغربی فکر
سے اکتسابِ نور کیا ہے۔ عظمت اللہ بیگ نے شعری ہیئت میں تجربے بھی کئے ہیں اور کئی
ترجمے بھی۔

ترقی پسندی نے بھی انگریزی ادب و تنقید کی وساطت سے اپنے انقلاب انگیز تصورات مستعار
۔ ترقی پسند تنقید پر کاڈویل اور طامسن کے نظریے اور اندازِ کار کا غلبہ رہا۔ تخلیقی کاوشوں کو

سمت و رفتار دینے میں آڈن، اسپنڈر اور لوئی میک نیس کا جو حصہ رہا ہے اس کا اعتراف خود ترقی پسندوں کو بھی ہے۔

اردو کی جدید نسل کے شعراء اور تنقید نگاروں نے اگرچہ انگریزی کے علاوہ دوسری مغربی زبانوں کے ادب کے اثرات قبول کرنے کے رجحان کو آگے بڑھایا ہے پھر بھی ان کے طرز احساس، طرز فکر اور طرز بیان پر ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ، ٹامس مَن، فلپ لارکن وغیرہ کے اثر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یورپی زبانوں کے ادب کے اثرات بھی انگریزی کے ذریعہ سے ہی ہماری نسل تک پہنچ رہے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی انگریزی شعر و ادب سے تخلیقی طور پر اخذ نور کرنے کا رجحان اردو میں غالب رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔

سید سفارش حسین رضوی

شاد عظیم آبادی کی مرثیہ گوئی

شاد کو اس عہد کا میر کہا گیا ہے، اُن کی غزلوں میں میر کی سی سادگی، خستگی اور برشتگی ملتی ہے۔ لوگ ان کے کلام پر سر دُھنتے ہیں مگر مرثیہ گوئی میں ان کے مرتبہ شناس بہت کم ہیں۔ بات یہ ہے کہ عام مرثیہ گویوں کی طرح شاد کے مرثیے عموماً نظروں کے سامنے نہ آئے۔ اُن کی غزلوں کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا لیکن مرثیہ گوئی پر لاعلمی کا پردہ پڑا رہا، حالاں کہ مرثیے میں وہ اپنے دور کے مجدد ہیں، انھوں نے مرثیہ گوئی میں اصلاحی قدم اٹھایا اور کامیاب ہوئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد اُردو شاعری میں جو موڑ آیا اس کے بعد سے شاد کی شاعری شروع ہوتی ہے اس موڑ کا اثر اُن کی طبیعت اور کلام دونوں پر پڑا۔ شعر کہنا تو اُنھوں نے پندرہ برس کی عمر ہی سے شروع کر دیا تھا مگر مرثیہ پر توجہ دبیر اور انیس کے پٹنہ جانے کے بعد سے کی۔ اس سے پہلے ایک مرثیہ کہا تھا جو شاد کے چچا نے مرزا دبیر کے سامنے اصلاح کے لئے پیش کر دیا۔ دبیر کی اصلاح نے شاد کی طبیعت کو بجھا دیا اور مرثیہ گوئی سے ان کا جی اُچاٹ ہو گیا۔ اپنے ایک خط میں جو رسالہ "ندیم" گیا (صوبہ بہار) کی جلد ۲۲، نمبر ۱، ۲، ۳، بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۴ء میں چھپا ہے، شاد نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

"مرزا دبیر سے اور میرے بزرگوں سے بہت پیشتر سے راہ و رسم تھی، غضب یہ ہوا کہ میرے عم مرحوم نے مرزا صاحب کے سامنے وہ مرثیہ اصلاح کے لئے پیش کر دیا۔ وہ اس کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گئے اور دو برس بعد اصلاح دے کر ہمراہ لیتے آئے مجھ کو اصلاح ایسی ناپسند

ہوئی کہ پھر مرثیہ کہنے سے جی چھوٹ گیا اور کبھی کوئی کلام پیش نہ کیا۔"

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بہار میں دبیر کا رنگ عام طور پر مرغوب تھا۔ دوسرے یہ کہ مرثیے کے بعض مقام شاد کے دل میں کھٹکنے لگے اور گو میر انیس نے شاد کی تسلی کی مگر وہ اس سے مطمئن نہ ہوئے۔ اسی خط میں لکھا ہے :

"ایک دفعہ میر صاحب کی مجلس میں میرے ہمراہ مولوی محمد یحییٰ وکیل بھی شریک ہوئے۔ انھوں نے میر صاحب پر یہ اعتراض کیا کہ کلام بے شک لاجواب تو ہے مگر اہل بیت کا کیرکٹر قایم نہیں رہتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مؤثر رئیس ہندوستانی کا یہ واقعہ ہے میں نے اگرچہ اس کے جواب کئی طرح سے دیئے مگر خود میرے دل پر مرثیہ کے بعض مقام کھٹکنے لگے مثلاً برخلاف واقعات تاریخ وروایات صحیح، زار ونالی ونوحہ وزاری برخلاف استقلال وصبر وغیرہ۔ چنانچہ یہ اعتراض میں نے خود میر صاحب کے سامنے کیا، انھوں نے بگڑ کر فرمایا کہ جو صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں وہ خود دس بند کہہ کر دیکھیں کہ کلام میں اثر بھی رہتا ہے اور پھیکا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ میر صاحب کا یہ فرمانا میرے لئے کافی نہ ہوا اور سوچا کہ اصل حال میں اثر نہ ہو غیر ممکن ہے۔ اسی دھن میں میں نے اس روز سے یہ عہد کیا کہ ایک مرثیہ ایسا کہوں جس میں اصلیت رہے اور موثر بھی ہو۔ غرض اس روز سے بیماری ہو یا صحت، سفر ہو یا گھر حتّٰی کہ بعض حوادث موت تک میں جہاں تک ممکن ہوا مرثیہ کے بند دس بیس برابر کہتا اور مشق کرتا رہا مگر جب دوسرے وقت پر دیکھا تو پھر پوچ و مبتذل پا کر پھاڑ دیا اور کسی پر یہ ظاہر نہ کیا، اس درمیان میں میر صاحب، میر مونس اور بہت سے سخن شناس جنت نصیب ہو گئے، آخر ۱۹ برس بعد دو سو بند کا ایک مرثیہ حسب خواہ کہا۔"

انیس برس کی کوشش کے بعد شاد نے جو مرثیہ کہا ہوگا وہ کیا کچھ ہوگا، آج یہ پتہ لگانا دشوار ہے کہ شاد کا پہلا مرثیہ کونسا ہے لیکن ان کے کلام سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاد کی ان تھک کوششوں نے مرثیہ گوئی میں انھیں کس مقام پر پہنچا دیا ہے۔

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

"مجھ کو دو مشکلیں سخت پیش آئیں، ایک اُس نقص مذہبی و اخلاقی کو مٹانا جو مرثیوں میں دیکھا جاتا ہے اور سننے والے اس کے عادی اور اُسی سے مانوس و متاثر ہیں۔ دوسرے میر انیس مرحوم نے جو احاطہ کھینچا ہے اور دنیا بھر کے اعلیٰ مضامین کا دریا اس طریقہ سے بہا دیا ہے کہ تازہ مضمون پیدا کرنا محال ہو گیا ہے، اور بالفرض کوئی اقدام بھی کرے تو اس احاطہ سے باہر ہو کر مبتذل ہو جائے۔ غرض جہاں تک ہو سکا ان دونوں مشکلوں کو حل کرنے میں عمر گذر گئی تاکہ اہل سخن فقیر کے طرز مرثیہ گوئی کو سمجھ لیں۔"

اپنے طرز کو شاد نے نظم کر کے ایک مرثیہ کے چہرہ میں داخل کیا۔ اس سے متعلق اُنھوں نے مولف بات دبیر کو ایک خط لکھا تھا جنھوں نے یہ خط کتاب کے دیباچہ میں صفحہ ۳۹ پر درج کر دیا ہے۔ شاد اس میں لکھا ہے —" میں نے ایک مرثیہ (۱) علاوہ مرثیہ کو تمہید میں نظم کر کے پڑھا جس کے بعض بند آپ سننے اور کتاب میں داخل کرنے کے قابل ہیں۔" بند یہ ہیں:

اے خضرِ شوق، راہِ حقیقت بتا مجھے منزل پہ جو پہنچ گئے اُن سے ملا مجھے
جی جاؤں جس کی لَے سے وہ ساغر پلا مجھے جریا ہے جس کی رُخ وہ عالم دکھا مجھے
آئینۂ مرقعِ صدق و صفا کہیں
وہ مرثیہ سُنا جسے سب مرثیا کہیں

باتیں ہوں اس طرح کی تجھے (تری) اے زباں پسند سُن کر جنھیں کریں حکمائے زماں پسند
برسوں سنا کئے ہیں جسے وہ کہاں پسند اب اہلِ بزم کو ہے نئی داستاں پسند
ذوقِ سخن میں ذائقۂ طبع کھو نہ جائے
اتنا نمک رہے کہ مزہ تلخ ہو نہ جائے

یہ بھی تو کچھ سمجھ کہ بلاغت ہے کس کا نام جانے نہ پائے ہاتھ سے اصلیتِ کلام
آساں نہیں ہے لفظ و معنی کا انتظام نظروں میں ہوں تُلے ہوئے سب موقع و مقام
تصنیفِ شعر کے لئے لازم شعور ہے

تقلیدِ بے محل سے کنارا ضرور ہے

داخل مبالغہ بھی محاسن میں ہے مگر　　اتنا نہ ہو کہ نقشِ مطالب کا ہو ضرر
باتیں وہ ہوں پسند کریں جن کو ذی تمیز　　آنکھوں کے آگے عین صداقت ہو جلوہ گر
اظہار مدعا میں کسی جا خلل نہ ہو
مطلب وہ کیا کہ جس کا کوئی ماحصل نہ ہو

مشکل ہے سب سے مرثیہ گوئی ہے جس کا نام　　آسان سمجھ لیا ہے زمانہ نے اب یہ کام
مذہب کی یہ بھی صنف میں داخل ہوا کلام　　لازم یہ ہے کہ دل سے کرے اس کا احترام
مد نگاہ درد و غم جاں گزار ہے
گلدستۂ سخن نہ بنے مرثیا رہے

انیس و دبیر کے بعد بہار اور ساقی نامہ مرثیہ کی جان ہو گئے تھے، ان کے متعلق لکھتے ہیں:

جب دشتِ ماریہ میں خزاں ہو گئی بہار　　مرجھائے پھول گر گئے شاخوں سے برگ و بار
بے آب خشک ہو گیا زہرا کا لالہ زار　　بچوں میں العطش کی رہی تین دن پکار
باقی نہ جان تھی نہ لہو جسمِ زار میں
کیسی بہار، آگ لگا دو بہار میں

ہے یہ بیانِ واقعۂ شاہ خاص و عام　　جانے نہ پائے ہاتھ سے سر رشتۂ کلام
اس ضمن میں شرابِ ولا کا گر آئے نام　　بے جا کبھی نہ جام کے اوپر لنڈھائے جام
قطرے جو اس شراب کے ہوں خونِ ناب ہوں
ساغر تو آنکھ میں ہو پر آنکھیں پُر آب ہوں

مرثیہ کے متعلق شاد کے خیال کو آپ نے دیکھ لیا جس پر ان کے مرثیوں کو پرکھا جا سکتا ہے۔

خیال کو شادؔ نے مجمل صورت میں بیان کیا ہے لیکن اس کی تفصیل ایک طویل نظم میں لکھی ہے یہ نظم ت ۱۸۹۹ء کے معارف میں شائع ہوئی تھی۔ اجمال کی تفصیل کے لئے نظم کا ضروری اقتباس دیا ہے تاکہ شادؔ کی مرثیہ گوئی کو سمجھنے میں اور آسانی ہوجائے:

بہت ہیں نظم کے بارے میں مختلف رائیں — کسی کا قول ہے کچھ اور کسی کا کچھ دعوا
کوئی تو کہنہ روش کو پسند کرتا ہے — کسی کی طبع ہے طرز جدید کی شیدا
ہماری رائے ہے اس باب میں غرض کچھ — خلاصہ اس کا ہم اس جا پہ کرتے ہیں املا

کہ سب سے بڑھ کے سخن میں ہے صنعت تشبیہ — کئی اس کی ہیں اقسام منضبط ہر جا
ادیب لازم معنی پہ سب کے غور کرے — کہ واسطے ہیں کم ان معنیوں میں یا کہ سوا
اگر ہیں لازم و ملزوم میں وسائط کم — تو ایسی شکل سے تشبیہ میں ہے لطف سوا
وسائط اس میں بڑھیں جس طرح کثیر رماد[1] — تو اس سے ہوگا پراگندہ فہم سامع کا
خلاصہ یہ کہ بہت دور کی نہ کوڑی لائے — کہ سننے والوں کو اک انزجار ہو پیدا
یہی ہے رائے کنایات و استعارے میں — کہ جس میں لطف نہ ہو اس سے اجتناب اطا
اسی طرح جو صنائع خلاف فطرت ہوں — کبھی لطیف نہیں نظم و نثر میں حاشا
اسی پہ ختم میں کرتا ہوں بحث معنی کو — کہ ہیں بھی ایسے صنائع میں مختلف حکما
رہی صنائع لفظی تو وہ بھی ظاہر ہے — کہ لفظ پر ہے مقدم لطافت معنیٰ
خلل صنائع لفظی سے جب ہو معنی میں — تو اہل ذوق پہ لازم ہے ترک تام ان کا
نہ کیجے لفظ میں ہو جائیں منہمک ایسے — کہ اصل حاصل مضمون کی بھی نہ ہو پروا

---

[1] کثیر الرماد - بہت سی راکھ جمع رکھنے والا۔ جس کا مطلب ہے کہ آگ بہت جلتی ہے اور کھانا زیادہ پکتا ہے یعنی مہمان زیادہ آتے ہیں۔

جہاں تلک ہے مری دست گاہ اس فن میں — مجھے پسند ہے انداز اہلِ یورپ کا
قلم سے لیتے ہیں وہ لوگ موقلم کا کام — اتار لیتے ہیں گویا ہُو بہُو نقشا
مبالغہ ہے نہ اغراق ان کے مضموں میں — وہ صنعتیں نہیں جو واقعی ہیں بے سروپا
وہ جانتے نہیں اعلیٰ کا آم کر دینا — جسے سمجھتے ہیں معراج ادھر کے سب شیدا
بیاں میں ان کے اثر خیز لفظ سب شیریں — کہ جس کے سنتے ہی سامع کو جوش ہو پیدا
بعینہ مگر اُن کی ضرور کیا تقلید — کہ مقتضیٰ بھی تو ہر ایک ملک کا ہے جدا
رہی یہ بات کہ اردو کی نظم کیسی ہو — کہ خاص و عام کے دل پر اثر کرے پیدا
تو اس میں رائے وہی ہے صاف صاف ظاہر ہے — سیاقِ نظم کو دیکھو میں کہہ رہا ہوں کیا
مذاقِ ملک کو سمجھے ضرورتیں دیکھے — کرے وہ امر جو ہو مقتضیٰ زمانے کا
محاوروں میں دل آویزی و متانت ہو — مفیدِ خلق ہو مضمون حاصلِ معنیٰ
بیاں کرے جو کوئی بات نظم میں اپنی — تو اصل حال کی تصویر کھینچ دے گویا

نظم اور مرثیہ کے متعلق شاؔد کے خیالوں کو جاننے کے بعد ان کے کلام کو ان اصولوں پر پرکھئے۔ شاؔد نے ان ہی پابندیوں کے ساتھ مرثیے کہے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ تصوف شاؔد کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اُن کا پورا کلام بھی تصوف سے رچا ہوا ہے۔

نمونہ

میں خاکِ آستانۂ اہلِ کمال ہوں — میں دُردنوشِ ساغرِ سحرِ حلال ہوں
گزرے ہیں دن ریاض میں دیرینہ سال ہوں — میں سوگوارِ عمرِ سریع الزوال ہوں
سالک کے کام آؤں جو رکھے نگاہ میں
بجھتا سا اک چراغ ہوں تاریک راہ میں
ہے پردہ دارِ رازِ حقیقت سخن مرا — بوئے بہشت دیتا ہے سارا چمن مرا

کیوں دیکھتی ہے غور سے منہ انجمن مرا آدم ہوں، باغ خلد بریں ہے وطن مرا
نظارہ اس دیار کا آنکھوں کو بھا گیا
سیاح ہوں ادھر بھی سیاحت کو آ گیا

چپ اے زباں کہ جوشِ جوانی کا جا چکا شوق اپنے دل سے سحر بیانی کا جا چکا
موسم خزاں میں زمزمہ خوانی کا جا چکا آخر ہے رات وقت کہانی کا جا چکا
تھا جس کا ڈر پہاڑ سی وہ شب بسر ہوئی
آنکھوں کو کھول، چونک مسافر، سحر ہوئی

مہماں سرائے دہر میں اے دوست کیا نہیں ایذا نہیں کہ سر پہ ہجومِ بلا نہیں
کہہ دو یہ قیس سے کہ شکایت روا نہیں لیلیٰ کا فعل لائقِ چون و چرا نہیں
رو رو کے خود کو موردِ خواری بنائے گا
کمل بھگو کے اور بھی بھاری بنائے گا

آوارگانِ کوئے وفا کا نہ پوچھ حال کانٹے نکالیں پاؤں سے اتنی نہیں مجال
پیش نظر ہے منزلِ محبوب خوش جمال کس پر ہیں یہ ستم ادھر آتا نہیں خیال
دل چور ہو کے جسم ہو ٹکڑے بجا ہے سب
اس چشم کا اگر ہو اشارہ روا ہے سب
رکھتے ہیں نینوائے محبت میں جب قدم صدمہ نہ دھوپ کا ہے نہ زخموں کا دل کو غم
پانی ملے نہ راہ میں دو روز یک قلم دم پیاس سے فنا ہو یہ ہوتا نہیں الم
جز نفع دیکھتے نہیں پہلو ضرر کا وہ
سمجھیں ہیں اس شکست کو مژدہ ظفر کا وہ

اے محوِ فات و آئینۂ حق نما حسین لذت شناس نعمتِ صبر و رضا حسین
اے مرکزِ محیطِ فنا و بقا حسین صورت نمائے حُسنِ صفاتِ خدا حسین
برتر جو عرش سے ہے ملی ہے وہ جا تجھے
تو نورِ حق ہے عالم سفلی سے کیا تجھے

جوں جوں تجھے ستاتے تھے درد و غم و ملال ووں ووں خوشی سے ہوتا تھا چہرہ ترا لال
کیا مطمئن تھا دل ترا اے فاطمہ کے لال غیر از رضائے دوست نہ تھا اور کچھ خیال
صدموں سے آب تھا جگر و دل جناب کا
اللہ رے صبر نام نہ تھا اضطراب کا

کس طرح اہل جہل سے ہوتے تھے ہم کلام کیوں کر عدو سے لیتے سادات انتقام
کیا شے رضا ہے، صبر کا ہے کون سا مقام عزم درست و ضبط و صداقت ہر کس کا نام
کٹوا کے حلق خود تو حضورِ خدا گئے
امت کو سیدھی راہ پہ لیکن لگا گئے

وہ مسکرا کے آنکھ اٹھانا سوئے سپاہ نرمی کے وہ سخن وہ محبت بھری نگاہ
مقصود مرتے مرتے بھی اس قوم کی رفاہ وہ دبدبہ، وہ شانِ امامت وہ عز و جاہ
موقع کے ساتھ غیض بھی تھا اور خصم بھی تھا
الفت کی بھی نظر تھی جلال و حشم بھی تھا

وہ گہرے گہرے زخم وہ اُبلا ہوا لہو وہ قلب مطمئن، وہ شہادت کی آرزو
وہ مشفقانہ پند، وہ دل جوئی عدو لہجہ وہ جاں فزا، وہ فصیحانہ گفتگو
حیرت سے منہ کو تکتا تھا وہ خود گروہ بھی
وہ بردباریاں کہ ہو شرمندہ کوہ بھی

شادؔ کے مقررہ اصولوں پر ان کے مرثیہ کے یہ بند پورے اترتے ہیں۔ لفظ و معنی کا جیسا حسین انتظام

شاد کے ہاں ملتا ہے وہ سوائے میر انیس کے دوسری جگہ نہیں۔ تصوف کی چاشنی نے شاد کے اس مرثیہ کو انیس سے بھی بلند کر دیا ہے۔ اُن کے مرثیہ میں "زار و نالی و نوحہ و زاری برخلاف استقلال و صبر" نہیں ملتا۔ امام حسین کے کردار اور کربلا کے واقعات کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ شہادت عظمیٰ کی حقیقت اجاگر ہو گئی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ اس بات کو نیچے کے بندوں میں ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جن سے کربلا کے واقعہ اور اس کے اخلاقی پہلو پر روشنی پڑتی ہے:

سلطان شرع و خسرو گیتی ستان دیں — شاہ زماں، خدیو جہاں، قہرمان دیں
مہر مبین دیں، قمر آسمان دیں — مصباح بزم مغفرۂ گمرہان دیں
شک سو ریا کا وہم تھا وہ وہم بھی گیا
حضرت کے جان دینے سے اسلام جی گیا

پیدا ہوا نہ خلق میں ایسا کوئی شکور — حقا ان ہی سے صبر نبی کا ہوا ظہور
دیتے نہ کربلا میں اگر امتحاں حضور — کافر یہ جانتے کہ ہے اسلام کا قصور
کہتے ہیں کس کو صبر، یہ سب کو بتا دیا
منکر کے دل سے نقشِ نبوت مٹا دیا

آمادہ اپنی مرگ پہ ہو جو فلک مقام — سن سن کے حرف سخت بہ نرمی کرے کلام
ہرگز نہ ہو عدو سے بھی خواہانِ انتقام — ایسا بجز حضور کے کس سے ہو یا امام!
عالم نہ اس کے حال پہ کیوں کربناک ہو
قاتل کے جو مآل پہ افسوس ناک ہو

مولا کی ذات پاک ہے ایماں کا افتخار — آیا اُن ہی کے صبر سے اسلام میں وقار
اس ظلم پر رضا کو نہ کرتے اگر شعار — ہوتے جہاں میں معترض اس دیں کے بے شمار
تھا سامنا جناب کو سخت امتحان کا
دکھلا دیا جہاں کو شرف خاندان کا

لکھ لکھ کے خط بہ شوق تمنا جسے بلائیں
افسوس اس کے ساتھ عداوت پیش آئیں
سب مل کے اس کے قتل پہ یوں آستیں چڑھائیں
واحسرتا! غریب مسافر کو یوں ستائیں
بدلی ستم کی فوج کی مولا پہ چھا گئی
اے دہر تجھ پہ تف ہے قیامت نہ آگئی

گرمی کی فصل اور وہ سولہ پہر کی پیاس
حلقے پڑے تھے چشم میں، تھا رنگِ رُخ اداس
خالی کٹورے لے لے کے بچے کھڑے تھے پاس
اب آئے گا، اب آئے گا، پانی یہی تھی آس
ممکن تھی ایک بوند نہ منہ میں چوانے کو
پانی کہاں تھا آگ لگی تھی زمانے کو

حد بیاں سے بڑھ کے ہیں شاہا ترے صفات
حقا کہ فرد دونوں جہاں میں ہے تیری ذات
ہنگام قتل کیا متزلزل تھے شش جہات
مولا مگر تھا تیرے قدم کو وہی ثبات
رخنہ خضوع میں تو دعا میں خلل نہ تھا
خنجر گلے پہ تھا مگر ابرو پہ بل نہ تھا

تڑپا جو کھا کے ظلم کی برچھی جواں پسر
پھر وہ پسر کہ جس پہ تھا عاشق تمام گھر
یوسف جمال، نورِ نظر، پارۂ جگر
جز شکر منہ سے کچھ نہ کہا آپ نے مگر
روکا نہ آپ کو قلق و اضطراب نے
برچھی کے پھل کو کھینچ لیا خود جناب نے

کھینچا گلے سے اصغر معصوم کے جو تیر
کاری بہت تھا زخم، قضا کر گیا صغیر
اس اپنی کارسازی پہ نازاں تھا وہ شریر
دنیا میں آج تک نہیں اس ظلم کی نظیر
لکھا ہے یوں کہ آپ کا چہرہ اُداس تھا
اپنا نہ تھا، نزول بلا کا ہراس تھا

امت کا دھیان آج تک ایسا کسے ہوا
ہوتے تھے ذبح لب پہ مگر تھی یہی دعا

یارب، بہ حق خونِ شہیدانِ کربلا — اُمت پہ رحم کر کہ نہایت ہے پُر خطا
قاتل پہ رحم کس نے کیا مشرقین میں
شیرِ خدا میں خُلق یہ تھا یا حسین میں

رضائے الٰہی اور پروردگار عالم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے حکم کی بجا آوری اور وہ بھی اس طرح کہ شکوہ شکایت تو ایک طرف، کہیں ان کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، اس دل لگتے اور دل گداز انداز میں پیش کرنا شاؔد ہی کا کام ہے۔ کربلا کی خونی داستان انسانی شرف اور سربلندی کی کہانی ہے، آخری تین بند اس کہانی کو اور زیادہ حسین بنا دیتے ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ بند جذبات کی صداقت اور سچی ترجمانی کے مظہر ہیں۔ یہ مصرع

واحسرتا! غریب مسافر کو یوں ستائیں

بڑے بڑے مرثیوں پر بھاری ہے، "یوں" کا لفظ اتنی اچھی اور خوب صورتی کے ساتھ مصرع میں کھپا ہے جو عموماً نہیں ہوتا۔

چھٹے بند کی منظر کشی بہت کامیاب ہے، پیاس کی شدت اور اس کے ساتھ پانی کی نہ پوری ہونے والی آس اور وہ بھی بچوں کی، بہت دل گداز ہے۔ زبان گھلی ہوئی ہے اور محاورے نے اپنی جگہ پر مصرعوں کے حُسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر صداقت کلام اور مبالغہ سے دامن بچائے رکھنا، قادر الکلامی کی بہت اچھی مثال ہے۔

شاؔد کا یہ کمال مرثیہ کے دوسرے موضوعوں میں بھی اسی طرح نظر آتا ہے۔ منظر نگاری، رخصت، تلوار، گھوڑا، ساقی نامہ وغیرہ میں حقیقت کو ہاتھ سے نہ دینا اور پھر اصل حُسن کو باقی رکھنا شاؔد جیسے قادر الکلام استاد ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ان نمونوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے:

منظر کشی

وہ شور آمد آمد سلطان کج کلاہ — اُٹھ اُٹھ کے زر لٹاتے تھے ذرّے میانِ راہ

نیزے کرن کے لے کے بڑھی نور کی سپاہ   مجرا پکارنے لگا بڑھ کر نقیبِ ماہ

پھیلی ہوئی تھی بن کی ضیا کوہِ طور تک

تھی چاندنی بچھی ہوئی میداں میں دور تک

وہ نیل گوں فلک تو وہ نورِ رخِ سحر   لکھی ہوئی تھی آیت واللیل والقمر

پے چہرۂ شفق نے جو کھینچا فلک پہ سر   کھولا گیا خزانۂ لعل و دُر و گہر

کثرت جو مال و زر کی ہوئی تنگ ہو گیا

آخر خزانہ دارِ فلک دنگ ہو گیا

وہ گرمیوں کی صبح وہ جھونکے ہوا کے سرد   وہ دشت، وہ درخت سب اپنی جگہ پہ فرد

وہ رنگتیں ببول کے پھولوں کی زرد زرد   وہ کربلا کی خاک کہ اکسیر جس سے گرد

تھا گل وہ کون سا کہ جواہر رقم نہ تھا

سبزہ بھی اپنے رنگ میں پنّے سے کم نہ تھا

تھا خلعتِ بہار سے ہر نخل سبزہ پوش   سنبل کی کاکلیں بھی لٹکتی تھیں تا بہ دوش

گل مسکرائے پڑتے تھے تھا کم سنی کا جوش   جنباں تھے برگ صورتِ آویزہ ہائے گوش

سبزے پہ اوس تھی کہ گہر شرم سار تھے

گردن میں نو خطوں کی جواہر کے ہار تھے

سیلاب کی طرح جو بڑھی تابِ آفتاب   بہہ بہہ کے ٹوٹنے لگے انجم کے بھی حباب

گھیرے ہوئے تھے چار طرف نور کا سحاب   ہر نخل منہ پہ ڈالے ہوئے تھا تنک نقاب

جلوہ تھا حسن خیز سحر کے ظہور کا

غازہ تھا ہر نہال کے چہرے پہ نور کا

وہ ہر طرف فرات کی موجوں کا پیچ و خم   تھا سطحِ آب تختۂ سیماب سے نہ کم

پانی میں تھی لطافتِ سرچشمۂ ارم — قطرے تھے یا کہ گوہر و الماس تھے بہم
مینائے نقرئی جو نکالے حباب نے
سونا چڑھا دیا ورقِ آفتاب نے

ریگ زارِ کربلا میں صبح کا منظر، ذرّوں کا اُٹھ اُٹھ کے زر لٹانا، گلوں کا کم سنی کے جوش میں مسکرا پڑنا، پتیوں کا آویزہائے گوش کی طرح ہلنا اور آخری بند کی ٹیپ، ایسی تصویریں ہیں جو کسی زبان کے ادب میں بلند پا سکتی ہیں۔ شاد نے مشرقی طرزِ ادا کے ساتھ صداقت واقعہ کو جس طرح نبا ہا ہے اُسے محسوس کیا سکتا ہے، لفظوں میں بیان کرنا دشوار ہے :

تلوار

کچھ تھم کے یوں چلی وہ عدو کش، قضا نظیر — سن سے نکل کے سخت کمانوں سے جیسے تیر
کھینچی چمک نے دور تک اک نور کی لکیر — جھنکار نے بلند کیا شور دار و گیر
اس چال پر نثار ہر اک حیلہ ساز تھا
اپنی ادا پہ خود بھی جفا جو کو ناز تھا

اللہ ری جاں شکاری و اندازِ دلبری — ہر جا تھا غل کہ تیغ کے پیکر میں ہے پری
مشہور تھی زمانہ میں اس کی ستم گری — اس پر بھی خونِ ناحق انساں سے تھی بری
پہلے توسن سے رو میں سوئے حلق جھک گئی
مانگی اماں جب اس نے تو خط دے کے رک گئی

بجلی سی کوندتی نظر آئی نکل گئی — جہاں سرائے تن میں در آئی نکل گئی
سر میں سمائی، تا کمر آئی، نکل گئی — گھوڑے کو کاٹتی اتر آئی نکل گئی
ہر دم نئی ادا تھی جفا جو کی چال میں
مچھلی تڑپتی پھرتی تھی لوہے کے جال میں

آتش مزاج و خود سر و پُر خشم و تند خو — سحر آفرین و لعل لب و مست و خندہ رو
خوں خوار و ظلم دشمن و عیار و کینہ جو — ہر دم لئے دئے ہوئے آپ اپنی آبرو
عدل اس کے ساتھ امن و اماں اس کے ساتھ ہے
یہ جس کے ہاتھ میں ہے جہاں اس کے ہاتھ ہے

گھوڑا

سج دھج میں ہے جلالتِ شان ید اللّٰہی — گھوڑا دکھا رہا ہے شکوہ شہنشہی
کرتی ہے کیوں نسیم سحر اس کی ہم سری — جاتی رہے گی اور بھی ہمت رہی سہی
اپنی بھی چال کو نہ کہیں بھو لنے لگے
ایسا نہ ہو کہ راہ میں دم پھولنے لگے

وہ جوڑ بند اور عربی ساز کا بناؤ — نور آئے آنکھ میں قدم اس کے اگر لگاؤ
خشکی پہ یوں بہاؤ پہ طوفاں میں جیسے ناؤ — مُردوں میں روح آئے جو دیکھیں یہ آؤ جاؤ
دھوپ اک ذرا کڑی جو پڑی بس ہوا ہوا
سایہ بھی ڈھونڈتا ہے کہ رہوار کیا ہوا

جوزا عناں و نجم خط و مشتری حَشم — کوکب جمال و زہرہ جبین و قمر قدم
بے حد بھی ہو جو بُعد مراحل تو کیا ہے غم — طے کر چکا ہے دشت حدوث و رہِ قدم
ناپے ہوئے ہے قصرِ فلک کے بُرُوج کو
روح الامیں سے پوچھئے اس کے عروج کو

مرثیہ میں تلوار اور گھوڑے کے خاص مقام ہیں۔ کلاسیکل مرثیے ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ شادؔ نے اس کی تکمیل کی ہے۔ تلوار کی تعریف میں پہلا اور آخری بند اور گھوڑے کی تعریف میں پہلا بند، لفظاً و معنیً ا

طرز ادا کے لحاظ سے بلند مرتبہ ہیں :

ساقی نامہ

ساقی سوا ہو جس سے بصیرت وہ مے پلا — روشن کرے جو چشمِ حقیقت وہ مے پلا
افزوں ہو جس سے نشۂ تقدیر وہ مے پلا — دل پر جو وا کرے درِ رحمت وہ مے پلا
ساغر جو ڈگمگا کے پیوں جھومنے لگوں
اٹھ اٹھ کے مے کشوں کے قدم چومنے لگوں

ساقی ترے فدا مئے عرفاں پلائے جا — بس بس کا لے نہ نام مری جاں پلائے جا
کچھ دن تک اور ہوں ترا مہماں پلائے جا — نیت بھری نہیں، ترے قرباں، پلائے جا
اتنی تو اب انڈیل کہ دریا بہاؤں میں
تِرتا ہوا یہاں سے اسی مے میں جاؤں میں

ساقی مجھے کشاکشِ ہستی سے دے نجات — سمجھوں کہ خوابِ مرگ ہے سرمایۂ حیات
پہنچا دے اس جگہ کہ جہاں دن ہو اور نہ رات — کم تر ہو ایک ذرے سے جس جا یہ کائنات
حقّا، وہی تو مامنِ اہلِ نیاز ہے
کیوں کر نہ ہوں خموش کہ سربستہ راز ہے
سو کیف زا وہ مے مجھے بے اشتباہ دے — قطرہ ہر اک بشارتِ عفوِ گناہ دے
اس دورِ بے پناہ میں دم بھر پناہ دے — تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی نباہ دے
گزرے خمار میں بھی اسی آن بان سے
نکلوں جو میکدے سے تو مستوں کی شان سے

ساقی نامہ مرثیہ کا اہم جزو ہو چکا ہے، لیکن اس میں بھی شاد کی انفرادیت جھلک رہی ہے، شرابِ عرفان

کے زندگی بھر ستانے رہے۔ اسی رنگ کو ساقی نامہ میں سمویا ہے۔ حق بھی یہ ہے کہ شاد کے نظریہ کے مطابق یہی رنگ اُن کے ساقی نامہ میں کھپ بھی سکتا تھا۔

شاد کے مرثیوں میں فلسفہ اور تصوف کی چاشنی اکثر ہوتی ہے، اُن سے انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"چار سو بند کا ایک مرثیہ کہا جس کے آغاز میں بہ طور مقدمہ دو سو بندوں میں فلسفۂ مذہب کو بہ ترکیب جدید بیان کر کے شہادت امام حسین کو رزم و بزم کے ساتھ نظم کیا۔"

اس سب کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاد کے کلام میں قدیم و جدید کی لطیف آمیزش ہے۔ وہ قدیم کی اچھائیوں اور جدید کی خوبیوں کو ملا کر کلام میں نئی راہ پیدا کر لیتے ہیں اور اس کو بڑے حسین انداز میں نبھا بھی لیتے ہیں۔ مرثیہ گوئی میں انھیں دوسرا انیس کہہ سکتے ہیں، بعض حیثیتوں میں وہ انیس سے بھی بلند ہیں۔ مرثیہ کے قالب میں انھوں نے نئی روح پھونکی، مرثیہ کو نیا انداز بیان عطا کیا اور اس میں فکر کی چاشنی ملائی اور اس کو زبان اور بیان کے انداز سے حسین تر بنا دیا۔

شاد کی علمی معلومات بہت وسیع تھیں ان کے خطوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جن میں اکبر الہ آبادی، میر نفیس، اقبال اور سر عبدالقادر کی فنی امدادوں کے تذکرے ہیں لیکن ان میں مولانا حالی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر حیرت اس لئے ہوتی ہے کہ حالی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ شاد لکھتے ہیں:

"شاید ۱۸۸۶ء میں جب کہ میں دہلی گیا تھا، مولوی حالی مرحوم نے مجھ سے چند بند مولود کے سُنے، وہ ایسے متاثر ہو گئے کہ میں کیا عرض کروں۔ پہلے وہ مرزا دبیر کے طرز کو پسند کرتے تھے چناں چہ اپنے دیوان کا مقدمہ جو سنایا تو مرزا دبیر کے کلام کی ترجیح میر صاحب پر صاف صاف تھی۔ میں نے برابر دو دنوں تک میر صاحب کا کلام شنا شنا کر رستہ پر لگایا، میر صاحب کے مرثیے دیئے، مجھ پر اصرار کیا کہ اس حصہ کو تم ہی لکھ دو، چناں چہ مقدمہ دیوان حالی میں یہ حصہ

قریب قریب میرا لکھا ہوا ہے۔"

اگر یہ صحیح ہے تو شاؔد کے بلند مرتبہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ مرکز سے دور رہنے کی وجہ سے اس صاحب علم وفن کی وہ قدر نہ ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔

انیسؔ برس کی لگاتار کوشش نے شاؔد کو مرثیہ گوئی کے قابل بنایا مگر اس ریاض نے انھیں اس فن کا مجدد بنا دیا۔ شاؔد نے بگڑتے اور بگڑتے ہوئے ذوق کو انیسؔ کی طرح پھر سدھارا، مرثیہ کی شکل وصورت کو سنوارا اور مرثیہ گوئی کو نئی ڈگر پر لگا دیا۔ ادب پر یہ اُن کا بڑا احسان ہے۔

ادیب مالیگانوی

غزل

اس چمن میں کبھی ایسی بھی فضا ملتی ہے
پھول ہنستے ہیں تو ہنسنے کی سزا ملتی ہے

دردمندانِ محبت سے یہ کہہ دے کوئی
کوئے قاتل سے گذرگاہِ وفا ملتی ہے

کر دیا مصلحتِ وقت نے اتنا محتاط
لالہ و گل سے دبے پاؤں صبا ملتی ہے

کس قدر شوخ ہوا خونِ تمنا میرا
اب تو اس سے ترے ہاتھوں کی حنا ملتی ہے

اختر انصاری دہلوی

یک نہ شد دو شد

(ایک پُراسرار کہانی)

چند روز قبل ایک نجی کام سے میں نے ایک مختصر سا سفر کیا۔ پڑوس کے ایک قصبے میں میری ایک رشتے کی بہن رہتی ہیں، کیونکہ وہاں ایک گلاس فیکٹری میں اُن کا لڑکا اسسٹنٹ انجینیر ہے۔ آدھ گھنٹے کا بس کا سفر اِدھر سے، آدھ گھنٹے کا اُدھر سے، اور گھنٹہ دو گھنٹے کا وہاں کا قیام! صبح کو روانگی کے وقت میں نے سوچا تھا کہ دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔ مگر وہاں ایک عجیب وغریب واقعے سے دوچار ہوا۔ اور دوپہر تک واپس پہنچنا کیا معنی، مجھے رات بھی وہیں گزارنی پڑی اور بالآخر دوسرے دن صبح کو بھانجے نے اپنے کسی انجینیر دوست کی کار میں ساتھ خیریت کے گھر پہنچایا۔ گھر پہنچنے پر میرے ذہن میں صرف دو باتیں تھیں ایک تو وہ واقعہ جو سفر میں پیش آیا اور دوسرے یہ خواہش کہ جلد سے جلد آغا صاحب سے ملاقات ہو، تاکہ میں بلا کسی مزید تاخیر کے سفر کی رُوداد اُن کو سُنا کر اُن کی کچھ ذہنی تواضع کروں اور جی بھر کر اُن کی خبر لُوں۔

آغا صاحب تقریباً پچیس سال سے میرے یہاں آتے جاتے ہیں۔ پہلے اُن کا پھیرا بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہفتہ وار ہوا کرتا تھا۔ پیر کے دن آتے تھے اور شام کے چھ سات بجے سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک جمتے تھے۔ پیر کے دن اس لیے کہ منگل کے روز شہر کا بازار بند رہتا ہے اور وہ اُس زمانے میں شہر کی ایک دوکان پر کام کرتے تھے۔ چنانچہ اگلے روز کی چھٹی کا سہارا لے کر پیر کی رات کا تقریباً نصف یا نصف سے کچھ زیادہ حصہ وہ میرے ساتھ گزارتے تھے۔ اور گھنٹوں اُن کے ساتھ گپ بازی کا شغل رہتا تھا۔ ہفتہ

بھر کے واقعات معرضِ گفتگو میں آتے تھے اور دنیا بھر کے موضوعات پر وہ طرفہ اظہارِ خیال ہوتا تھا۔ میں نے ہفتہ بھر کی سات راتوں میں سے ایک رات ان کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ وہ ایک رات تو اب بھی ان کے لیے وقف ہے لیکن اب پیر کے دن کی کوئی قید نہیں ہے۔ اب پانچویں چھٹے یا ساتویں آٹھویں دن جب بھی اُن کا موڈ ہوتا ہے اور آنا ممکن ہوتا ہے آجاتے ہیں۔ اس تبدیلی کا باعث ایک تو یہ کہ اب وہ شہر کی دوکان پر کام نہیں کرتے اور پیر یا منگل کی کوئی اہمیت اب ان کے لیے باقی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ وہ میرے یہاں ادبدا کے پیر کے روز ہی آتے تھے اس لیے میرے دوستوں کے حلقے میں ان کو شیخ پیرو کے نام سے پکارا جانے لگا۔ پھر شیخ پیرو سے بگڑ کر ان کا نام شیکسپیر ہو گیا۔ (خواہ اُس مشہور ڈرامائسٹ کے ساتھ یہ نہ ہوا ہو، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے) پھر شیکسپیر کے ساتھ لوگوں نے علامہ کا سابقہ نتھی کر دیا۔ اور یوں آغا صاحب علامہ شیکسپیر کہے جانے لگے۔ تو کچھ تو اس قسم کے فضول نام سے بچنے کے لئے اور کچھ اس لیے کہ اب وہ ہفتہ وار چھٹی کا سوال ہی ختم ہو گیا، اِدھر برسوں سے وہ کسی مقررہ دن کی پابندی کے بغیر آتے ہیں۔ مگر آتے بدستور ہیں۔

آغا صاحب کے ذکر میں دو باتیں خاص طور پر کہنی چاہوں گا۔

پہلی بات تو یہ کہ آغا صاحب سخت ملحد قسم کے آدمی ہیں۔ برسوں پہلے چڑھتی جوانی کی عمر میں انھوں نے خدا کے تصور کو اپنے نظامِ فکر سے خارج کر دیا تھا اور آج تک بڑی مضبوطی کے ساتھ اسی مسلک پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ عقلیت اور عقلیت پسندی کے علم بردار ہیں اور سائنسی طرزِ فکر پر جان دیتے ہیں۔ مثلاً ابھی چند روز پہلے اخبارات میں ایک خبر چھپی کہ کراچی میں ڈھائی سال کی ایک بچی کا انتقال ہوا۔ انتقال کے دوسرے یا تیسرے دن بچی کی ماں کو خواب میں ایک بزرگ نظر آئے جنھوں نے غم کی ماری بدنصیب عورت کو یہ بشارت دی کہ جا، تیری بچی زندہ ہے۔ قبر کھود کر نکال لے۔ وہ عورت سو کر اٹھی تو اس نے گھر والوں سے اپنا خواب بیان کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ قبر کو کھول کر دیکھا جائے۔ اُس نے کہا، کیا عجب ہے کہ اللہ میاں کو میرے اوپر ترس آگیا ہو اور میری لاڈلی سچ مچ زندہ ہو، اور مجھے دوبارہ مل جائے۔ سب نے اس کی خواہش کا مذاق اُڑایا اور اس کی باتوں کو ایک دکھیاری ماں کا پاگل پن سمجھا۔ مگر وہ اپنی بات پر اَڑی رہی، اور جب کسی کو

اپنا ہمدرد و ہم خیال نہیں پایا تو رونا پیٹنا شروع کیا اور آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بالآخر لوگ بے بس ہوگئے اور یہ فیصلہ ہوا کہ اس کی ضد پوری کر دی جائے۔ قبر کھودی گئی، اور ـــــ سدا رہے نام اللہ کا! لوگوں نے دیکھا کہ بچی مزے سے قبر میں لیٹی ہوئی انگوٹھا چوس رہی ہے۔ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے والی بات ہوئی۔ سب کے دل جذبۂ عبودیت سے معمور ہوگئے اور خدائے ذوالجلال کی ہیبت سے ہر شخص لرزہ براندام ہوگیا۔ نظریں یکبارگی آسمان کی جانب اٹھیں اور کانپتے ہوئے ہاتھ دعاؤں کے لیے بلند ہوئے۔ بے اختیار ہر زبان سے کلمۂ لا الٰہ کا ورد جاری ہوگیا۔ کچھ دیر یہ کیفیت طاری رہی۔ پھر اللہ کا نام لے کر جھکے اور قبر میں ہاتھ ڈال کر بچی کو اٹھا لیا۔ اور حمد و ثنا کے گیت گاتے ہوئے گھر لے آئے۔ ماں کی اجڑی ہوئی کوکھ آباد ہوئی اور قادر مطلق کی قدرت کاملہ کا ایک اور بدیہی ثبوت فراہم ہوا۔ یہ تھا وہ حیرت انگیز واقعہ جو ایک روز صبح کے اخبار نے پڑھنے والوں کے کانوں تک پہنچایا۔

اس کے دوسرے یا تیسرے دن آغا صاحب میرے یہاں آئے۔ گفتگو کے دوران میں میں نے ان کو سنایا۔ وہ ہوں کر کے خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا، "جناب جس دن یہ خبر اخباروں میں آئی اس کے دوسرے دن اِسی سلسلے میں یہ خبر بھی چھپی کہ کراچی کے ایک ڈاکٹر نے بچی کا طبی معائنہ کیا۔ اخبار نے اس ڈاکٹر کا نام بھی دیا تھا جو مجھے اب یاد نہیں ہے۔ اس ڈاکٹر نے یہ رائے ظاہر کی کہ دراصل بچی کی موت واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کو محض سکتہ ہوگیا تھا اور غلطی سے اُسے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا۔ پھر چونکہ قبر کا پتھر اس کے جسم سے کچھ فاصلے پر تھا اور قبر کی مٹی نرم تھی اس لیے کچھ آکسیجن اندر موجود رہی جس نے بچی کو زندہ رکھا۔ ڈاکٹر نے مزید کہا کہ یہاں تک تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ بچی کا دفن ہونے کے بعد زندہ رہنا سمجھ میں آتا ہے اور کوئی غیر معمولی یا پُراسرار بات نہیں ہے۔ باقی رہا بزرگ کا خواب میں نظر آنا اور بچی کے بارے میں ماں کو بشارت دینا تو یہ بے شک ایک کرامت ہے۔"

میرے اس بیان پر آغا صاحب بولے، "یہ دراصل ماں کی شدید ممتا تھی جس نے خواب میں بزرگ کا روپ دھار لیا۔ شدید ممتا اور گہرے رنج و غم کے دباؤ کے تحت اس کے دماغ نے اس امر کا ادراک کر لیا تھا کہ بچی زندہ ہے اور وہ واپس اس دنیا میں آ سکتی ہے۔ اصل یہ ہے"، انھوں نے مزید

فلسفہ بگھارتے ہوئے کہا کہ انسانی دماغ تو بڑی عجیب وغریب چیز ہے اور اس میں نہایت پراسرار اور حیرت انگیز طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان مستقبلِ بعید میں پیش آنے والے واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے اور وقت آنے پر وہ واقعات بالکل اسی طرح رونما ہوتے ہیں جس طرح ان کا ادراک قبل از وقت کیا گیا تھا۔ آپ کسی نیورو فزیالوجسٹ سے بات کیجیے۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ انسانی دماغ کی قوتیں اتنی بے پناہ اور اس درجہ بے حد و حساب ہیں کہ آج تک دنیا کے کسی ذہین ترین یا عقل مند ترین آدمی نے بھی اپنے دماغ کی تمام قوتوں سے کام نہیں لیا۔ اور عام لوگ تو زیادہ سے زیادہ دس پندرہ فیصدی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں۔ باقی صلاحیتیں یونہی بے کار و بے مصرف خوابیدہ حالت میں پڑی رہتی ہیں اور موت واقع ہونے پر انسان کے ساتھ قبر میں دفن ہو جاتی ہیں۔" اس نہج پر بہت دیر تک آغا صاحب سے بات چیت ہوتی رہی۔ مگر اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ میرا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ آغا صاحب کس طرح سوچتے ہیں اور ان کا سائنسی طرزِ فکر کس طرح کام کرتا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو حقیقتِ امر کچھ اور ہی ہے۔ بھلا اس شخص سے کون جیت سکتا ہے جسے نہ زندگی سے کوئی لالچ ہو نہ موت کا کوئی خوف۔ آغا صاحب بیوی بچوں کے جھنجھٹ سے آزاد ہیں۔ معاشی مسئلہ بھی ان کے لیے وجود نہیں رکھتا۔ سات آٹھ مرفہ الحال بھائیوں میں سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ رہنے کے لیے پشتینی مکان کا ایک کمرہ اور کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی بے غل وغش ہر وقت ان کے لیے موجود ہے، اور ان موروثی حقوق کے چھن جانے یا تخفیف میں آجانے کا بظاہر کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ گھر میں یا گھر سے باہر کوئی ان سے یہ پوچھنے والا نہیں ہے کہ تم کچھ کماتے بھی ہو یا نہیں اور اگر کماتے ہو تو کس طرح اور کہاں خرچ کرتے ہو۔ سگریٹ وہ نہیں پیتے۔ پان کو آج تک منہ نہیں لگایا چائے سے بھی کوئی خاص شغف نہیں۔ جوانی میں شراب مرغوب نہیں، محض گوارا تھی۔ وہ بھی دوسروں کی خاطر۔ اب سونگھتے بھی نہیں۔ کوئی پچھاڑ کے بھی پلا دے تو قے کر دیں۔ کسی زمانے میں عورتوں سے دلچسپی لیتے تھے اور محبوباؤں کے قصے سنایا کرتے تھے۔ لیکن اب برسوں سے وہ باب بھی بالکل بند ہے۔ کبھی بھولے بھٹکے سے کسی طوائف کے بالاخانے پر بھی چڑھ جاتے تھے۔ مگر اب وہ بالاخانے ہی منہدم

ہو گئے اور ادھر یہ بیچارے خود بھی انہدام کے دور سے گزر رہے ہیں۔ لوگ طرح طرح کی علّتیں پالے رہتے ہیں۔ کسی کو لذیذ کھانوں کا شوق ہے۔ کوئی بڑھیا جدید الوضع لباس پر جان دیتا ہے۔ کسی کے سامنے یہ مطمحِ نظر ہے کہ دولت اکٹھی ہو تو دنیا کے خوبصورت اور قابلِ دید مقامات کی سیر کی جائے۔ کوئی اس ارمان کی پرورش کر رہا ہے کہ خدا وہ وقت لائے کہ ایک شاندار و خوش نما مکان بنے جو فریج اور ریڈیوگرام اور ٹی وی سٹ سے آراستہ ہو، جس کے گیراج میں ایک حسین و جمیل کار کھڑی رہا کرے، اور جس کے ڈرائنگ روم کی فضا کسی طلسماتی پرستان کی فضا سے کم نہ ہو۔ کوئی محض دولت کا پرستار ہے اور چمڑی جائے دمڑی نہ جائے کے اصول پر عمل پیرا ہو کر شب و روز زر اندوزی کے شغل میں مصروف ہے اور اس امر کی طرف سے بالکل بے نیاز کہ اس کی خست اس کے چہرے اور حلیہ کو مکروہ سے مکروہ تر بناتی چلی جا رہی ہے اور وہ لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ سامانِ عبرت بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے آغا ان تمام علّتوں سے یکسر آزاد ہیں۔ پھر خدا سے کویا تو وہ لگائے جس کو اپنی زندگی کے ارمانوں کو پورا کرنے کا شوق ہو، یا وہ جسے شب و روز یہ اندیشہ لاحق ہو کہ اگر میں اللہ کو پیارا ہو گیا تو یہ نصف درجن بچے کیا کریں گے اور کہاں جائیں گے اور فلاں بچی جو سدا کی مرضین ہے اور مسلسل علاج کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اس کا کیا حشر ہوگا۔ آغا صاحب کو اس نوع کے کسی مسئلے سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک اکیلی جان ہے جس سے محروم ہو جانے پر وہ ہر وقت آمادہ ہیں۔ اب کسی سے اُن کا کچھ بگاڑا جائے تو بگاڑ لے۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی مابعد الطبیعیاتی گفتگو میں وہ میرے دلائل سے زچ ہو کر پھٹ ہی تو پڑے اور بولے، "صاحب! اگر خدا ہے تو بے شک ہو، اور نہیں ہے تو شوق سے نہ ہو۔ میرے اوپر اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اگر پڑتا ہے تو مجھے اُس کی پروا نہیں۔"

چلو قصہ ہی ختم ہوا۔ اِس جائزے کو ختم کرنے سے پہلے آغا صاحب کے بارے میں یہ اور بتا دوں ـــــ اور یہ کہتے ہوئے میں سچ مچ اپنے سر کو احترام سے جھکتا ہوا محسوس کرتا ہوں ـــــ کہ اگر اس شخص کے دل میں واقعی کسی چیز کی تڑپ ہے تو وہ علم اور صرف علم ہے۔ کتابوں سے ان کا عشق جنوں کی حدوں کو چھوتا ہے۔ اور اُن کا مطالعہ ادبیات کے مختلف شعبوں سے لے کر علومِ صحیحہ کی بیشتر شاخوں

تک پھیلا ہوا ہے۔ اُن کی تعلیم اور پھر ان کے ذاتی مطالعے کا انداز ہی کچھ ایسا رہا کہ وہ آرٹ اور سائنس دونوں سے یکساں شغف رکھتے ہیں۔

آغا صاحب کے سلسلے میں دوسری بات مجھے یہ کہنی تھی کہ اب چونکہ میری اُن کی ملاقات پر ایک چوتھائی صدی کی مدت گزر چکی ہے اس لیے تکلف اور رسمیت کے عناصر اِس دیرینہ تعلق سے بالکل خارج ہو چکے ہیں۔ وہ آتے ہیں۔ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ تسلیم و آداب کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتے۔ اندر پہنچ کر ایک کرسی میں دھنس جاتے ہیں اور سامنے میز پر پڑے ہوئے ہندو پاکستان کے اکناف سے آنے والے ادبی رسائل میں سے کوئی رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دیتے ہیں۔ میں اُن کے آتے ہی اپنا کام سمیٹ کر ایک طرف کر دیتا ہوں اور ان کی جانب رُخ کر کے بیٹھ جاتا ہوں۔ میری گفتگو کا سلسلہ خود بخود شروع ہو جاتا ہے جس پر وہ رسائل کی ورق گردانی کے دوران میں ہوں ہاں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی میری کسی بات پر ذرا سا ہنس دیئے۔ کبھی بزرگانہ شفقت سے کام لیتے ہوئے محض مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ ہاں، میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا تھا کہ آغا صاحب کسی زمانے میں میرے شاگرد بھی رہے ہیں۔ لیکن اب میری اُن کی ملاقاتوں میں اُن کا انداز بزرگانہ اور میرا کسی قدر برخوردانہ ہوتا ہے۔ کئی کئی گھنٹوں کی ملاقات میں وہ بسا اوقات میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ صبح کو شیو کرتے وقت میری مونچھوں کی تراش خراب ہو گئی۔ میں نے ٹھیک کرنے کی کوشش کی تو معاملہ اور بھی بگڑ گیا۔ آخر میں نے جھلا کے مونچھوں پر استرا پھیر دیا۔ اور کچھ دنوں کے لیے اس کھکیڑ ہی سے آزاد ہو گیا۔ اسی دن شام کو آغا صاحب آئے۔ جب ملاقات ختم کر کے جانے لگے تو میں نے کہا، "تم نے میرے چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں پائی؟" اِس پر انھوں نے نظر بھر کر مجھے دیکھا اور مونچھوں کی غیر حاضری پر مسکرائے۔ کوئی بچہ کاغذ کی گاندھی کیپ بنا کر اپنے سر پر منڈھ لے اور آپ کے پاس داد وصول کرنے کے لیے آئے تو آپ جس مربیانہ انداز میں مسکرا کر اُس کو داد دیں گے، کچھ وہی انداز آغا صاحب کی مسکراہٹ کا تھا۔ بہر حال مسکراہٹ کا تحفہ عنایت کر کے وہ رخصت ہو گئے۔

اب یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جس دن میں اپنے مختصر سفر کے بعد گھر پہنچا اسی دن شام کو آغا

ے کا آنا ہوا۔ میں اُن سے ملنے کے لئے بیتاب تو تھا ہی۔ دیکھتے ہی جی خوش ہو گیا۔ وہ آتے ہی اپنی
ی کرسی پر ڈھیر ہو گئے اور سامنے پڑے ہوئے رسائل کے ورق اُلٹ پلٹ کرنے لگے۔ میں بھی سنبھل
لیا اور حملے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔ اور ایک سگار سلگا کر دو چار کش لیے۔ پھر اُن کی طرف دیکھ کر
راجس کا انھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ پھر میں نے ایک زور دار ہوں کی آواز نکالی۔ اس پر بھی ان کے
ئی حرکت پیدا نہیں ہوئی اور وہ رسالوں کی اُلٹا پلٹی میں معروف رہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا،
ے بچے! میں آج تیرا دماغ درست کر دوں گا اور تیری خود اعتمادی کے غبارے میں اس طرح چھید کروں
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پچک کر رہ جائے گا۔ تو ذرا ٹھیر تو سہی!" اِس کے بعد میں شروع ہو گیا۔
کیوں بھئی آغا!" میں نے کہا، تم خارقِ عادت امور پر اعتقاد رکھتے ہو؟ میرا مطلب بھوت پریت،
، آسیب اور بزرگوں کی کرامات وغیرہ چیزوں سے ہے۔"
آغا نے کچھ اس طرح منہ بنایا اور کچھ اس انداز سے اونہہ کی آواز نکالی گویا میں نے اُن سے یہ پوچھا
نے کبھی گلی ڈنڈا کھیلا ہے یا کبڈی وغیرہ سے دلچسپی لی ہے۔
چنانچہ میں نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا، "تم نے وہ قصہ تو سنا ہو گا یا پڑھا ہو گا جس کو دنیا
چھوٹی گھوسٹ اسٹوری خیال کیا گیا ہے۔ یعنی وہی قصہ کہ ایک رات کسی تاریک اور ویران مقام
موں کی ملاقات ہوئی۔ پہلے شخص نے دوسرے شخص سے کوئی بات کہی جس پر دوسرے شخص نے
کویا آپ بھوت پریت کے وجود کو مانتے ہیں؟ پہلے شخص نے کہا، ہرگز نہیں، میں بھوت پریت
خرافات سمجھتا ہوں۔ لیکن شاید آپ اُن کے وجود کے قائل ہیں! دوسرے نے کہا، بے شک
وں کا قائل ہوں۔ اور یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا!"
اچھا لطیفہ ہے،" آغا بولے۔
خیر چھوڑو اِس لطیفے کو،" میں نے کہا۔ "میں تمھیں دوسرا قصہ سناتا ہوں۔ یہ بھی ایک قدیم روایت
ہ اور شاید ایڈون آرنلڈ نے اپنی تصنیف "لائٹ آف ایشیا" میں بھی اس کو لکھا ہے۔ قصہ
ہ کہ ایک دن سلطانِ دمشق کے محل میں ایک نوجوان بے تحاشا دوڑتا ہوا داخل ہوا اور تیر

کی طرح سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں سلطان مع اپنے درباریوں کے موجود تھا۔ وہ فوراً سلطان کے قدموں پر گر پڑا اور التجا کی کہ مجھے بلاتاخیر ایک صبا رفتار گھوڑا عنایت کیا جائے کیونکہ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بغداد پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ یہ نوجوان سلطان کا منظورِ نظر غلام تھا۔ اس لیے اس کی خواہش کو شرفِ پذیرائی بخشتے ہوئے سلطان نے اُس کی پریشانی اور دمشق سے فرار ہونے کے ارادے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے دست بستہ عرض کیا کہ جہاں پناہ! مَیں ابھی محلِ شاہی کے باہر باغ کی سیر میں مصروف تھا کہ مجھے فرشتۂ موت نظر آیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر عجب عجب طریقوں سے منہ بنایا اور مجھے ڈرانے اور دھمکانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ میں اپنی جان بچانے کی خاطر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں سے فوراً بھاگ جاؤں اور اپنے اور فرشتۂ موت کے درمیان کم از کم اتنا فاصلہ ضرور پیدا کر لوں جتنا دمشق اور بغداد میں ہے۔ غلام یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد سلطان نے سوچا کہ کیوں نہ باغ میں جا کر فرشتۂ موت کو بہ نفسِ نفیس دیکھا جائے اور غلام کی شکایت کی تحقیق کی جائے۔ چنانچہ وہ اپنے مصاحبین کی معیت میں ٹہلتا ہوا محل سے باہر آیا اور باغ میں داخل ہوا۔ بلاشک و شبہ فرشتۂ موت وہاں موجود تھا۔ سلطان نے کہا، کیوں حضرت! کیا معاملہ ہے؟ اب آپ ہمارے غلاموں کی جان کے درپے ہو رہے ہیں۔ ابھی میرے غلام نے مجھے خبر دی کہ آپ نے اسے ڈرایا دھمکایا اور مرگِ ناگہاں کی خوش خبری، میرا مطلب ہے خبرِ بد سنائی۔ فرشتۂ موت نے کہا، ہرگز نہیں۔ آپ کے غلام نے بالکل جھوٹ کہا۔ میں نے اُس کو ڈرانے دھمکانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ البتہ میں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی حیرت کا اظہار ضرور کیا۔ سلطان نے اس کی حیرت کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا، میری حیرت کا سبب یہ تھا کہ وہ غلام یہاں دمشق میں موجود ہے، در آں حالے کہ مجھے یہ یہ حکم مل چکا ہے کہ میں آج شام بغداد میں اس کی روح قبض کروں!"

میں قصہ ختم کر کے چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تاکہ آغا صاحب اس کے مفہومِ پنہاں کے لطف کو محسوس کر سکیں۔ لیکن بظاہر انھوں نے کوئی اثر نہیں لیا۔ گویا کوئی بہت ہی طفلانہ بات کہہ دی گئی تھی جس سے متاثر ہونا ان کے لیے ضروری نہیں تھا۔ "خیر یونہی سہی"، میں دل ہی دل میں ان سے مخاطب

ما، آپ کی بے حسی کے قربان! آج میں آپ کو رلا کر ہی رکھ دوں گا۔"

میں نے کہا، "یہ دونوں قصے جو میں نے آپ کو سنائے محض روایتی لطیفے تھے۔ ان کو چھوڑیئے۔ اب میں آپ کو ایک حقیقی واقعہ سناتا ہوں۔ یعنی یہ کوئی روایتی قصہ یا من گھڑت افسانہ نہیں ہے، بلکہ ایک سچی کہانی ہے، ایک اصلی واقعے کی روداد ہے۔ ایک مشہور فرانسیسی مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدے اور ذاتی علم کی بناء پر اس کو ابھی کچھ دن ہوئے ایک ادبی رسالے میں شائع کرایا ہے۔۔۔"

"میں اس فرانسیسی مصنف کا نام معلوم کر سکتا ہوں!" آغا نے گویا مراقبے کی حالت سے برآمد ہو کر سوال کیا۔

"وہ مجھے اس وقت یاد نہیں"، میں نے کہا

"خیر، یونہی سہی۔ آپ واقعہ سنیئے جو ایک حقیقی واقعہ ہے۔ فرانس کے کسی دور افتادہ قصبے میں ایک لڑکی کی شادی ہوئی۔ شوہر ایک متمول گھرانے کا نوجوان تھا جس کے پاس اپنی ذاتی کار تھی۔ دولہا نے پیرس میں ہنی مون منانے کا فیصلہ کیا اور اپنی ذاتی کار میں سوار ہو کر گھر سے چل پڑے۔ مختلف شہروں کی سیر کرتے ہوئے چند روز بعد پیرس کے مضافات میں پہنچے۔ ایک دن کسی خوبصورت مضافاتی گاؤں کے برابر سے گزر رہے تھے کہ لڑکی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے زور سے چلائی، ٹھیرو، ٹھیرو، گاڑی روکو۔ شوہر نے گاڑی روک دی اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ سڑک کے اس پار چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکانوں کی قطار پر نظریں جمائے ہوئے تھی اور مارے جوش کے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ گاڑی کے رکتے ہی اس نے بے اختیار ایک خاص مکان کی طرف ہاتھ بڑھائے اور بولی، یہ تو میرا گھر ہے۔ یسوع مسیح کی قسم، یہی میرا گھر ہے۔ یہی وہ گھر ہے جس کو میں عمر بھر خوابوں میں دیکھتی رہی ہوں۔ بالکل وہی ہے۔ وہی لوہے کی سلاخوں والا اونچا سا دروازہ۔ وہی دیواریں، وہی منڈیر۔ وہی پھاٹک سے اندر کی طرف جاتا ہوا سیدھا راستہ، وہی روشیں۔ ہر چیز بالکل وہی ہے! اُف میرے خدا! شوہر کو معاملے کی تہ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ یہ پورا قصہ سن چکا تھا۔ اور وہاں اس قصبے میں جو اُن کا وطن تھا کون تھا جو اس راز سے واقف نہیں تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ رات کے وقت اور کبھی دن میں بھی

نیند کے عالم میں اس لڑکی کو کوئی چھوٹا سا خوبصورت مکان نظر آتا ہے جس کو یہ اپنا گھر کہتی ہے۔ وہ اکثر صبح کو سو کر اٹھتی تو لوگوں کو بتاتی کہ آج پھر میں نے اپنے گھر کی سیر کی۔ بہت دیر تک روشوں پر ٹہلتی رہی، پھولوں کی مہک سونگھتی رہی، اور لوگوں کو آتے جاتے دیکھتی رہی۔ آج وہ اپنے گھر کو مادی اور سہ ابعادی اجسام کی دنیا میں اپنی مادی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ اس کا اضطراب اور جوش و خروش ایک قدرتی بات تھی۔ وہ اچھل کر کار سے باہر نکلی اور شوہر سے کہا، کیوں نہ ہم فوراً ہی ذرا اندر چلیں اور اپنے گھر کی سیر کریں، اور معلوم کریں کہ اس میں رہتا کون ہے۔ اور ہاں اگر ممکن ہوا اور اجازت مل جائے تو چند روز یہاں قیام بھی کریں۔ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔ شوہر پیچھے پیچھے چلا۔ جب وہ دونوں مکان کے صدر دروازے کی طرف قدم بڑھا رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ مکان کے اندر سے ایک پادری دروازے کی طرف آ رہا ہے۔ اُس نے بڑھتے ہوئے دروازے کے پٹ کھولے اور باہر آیا۔ لڑکی جھک کر آداب بجا لائی اور کہا، کیوں جناب! یہ مکان کس کا ہے؟ کیا ہم اندر جا سکتے ہیں؟ پادری نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ پھر کسی قدر جھکا اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، اور سوال کا جواب دیئے بغیر چپ چاپ مگر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ ایک لمحہ وہ گومگو کے عالم میں رہے۔ اُس کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ سامنے کیاریوں میں ایک مالی کام کر رہا تھا۔ اُس کی پُشت اِن دونوں کی جانب تھی۔ لڑکی نے اُس کے قریب پہنچ کر کہا، کیوں بھئی مالی؟ وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ مالی نے اپنا سر اُٹھا کر اس کو دیکھا۔ پھر وہ اُچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کے چہرے پر نظر جاتے ہی۔ زور سے چیخا اور یک لخت بھاگ کھڑا ہوا۔ اب یہ دونوں اور بھی ہراساں ہوگئے اور سخت حیران کہ آخر یہ قصہ کیا ہے۔ کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور اپنی بے بسی پر غور کرتے رہے۔ آخر لڑکی نے شوہر سے کہا، اب ہم یہاں آئے ہیں تو ایک کوشش اور کر لیں۔ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ یہی میرا گھر ہے۔ میں اس کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ یہ کہہ کر وہ مکان کے برآمدے کی طرف بڑھی۔ شوہر نے اس کی پیروی کی۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ اندر سے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے سناٹا طاری رہا۔ پھر کسی

کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی سیڑھیاں اُترتا ہوا آرہا ہے۔ دروازہ کھلا اور خادمہ کی وضع کی ایک متوسط العمر عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔ ابھی لڑکی نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا اور اندر سے چٹخنی لگا لی۔ اب تو یہ دونوں فی الواقع سراسیمگی کی آخری حد کو پہنچ گئے۔ اور اب اِن کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ چپ چاپ وہاں سے رخصت ہو جائیں۔ چنانچہ نہایت درجہ افسردگی کے عالم میں روشوں پر خاموشی کے ساتھ چلتے ہوئے مکان کے پھاٹک سے باہر آئے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ دو ڈھائی گھنٹے بڑی بے دلی کے ساتھ گاؤں اور اس کے نواحی علاقوں میں گھومتے رہے اور آخرکار دوبارہ اسی سڑک پر آ گئے جہاں لڑکی کو کچھ دیر پہلے یکبارگی اپنا گھر دکھائی دیا تھا۔ گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے لڑکی نے "اپنے گھر" پر ایک آخری حسرت آمیز نظر ڈالی، اور پھر گاڑی کو پیرس جانے والی سڑک پر ڈالنے سے پہلے انھوں نے سوچا کہ کسی ریستوران میں بیٹھ کر کچھ کھا پی لیں۔ ہر چند کہ لڑکی کو "اپنے گھر" میں ایک چائے کی پیالی تک پینے کو نہیں ملی تھی، لیکن اپنے گھر کے پڑوس میں کسی ریستوراں میں بیٹھ کر کچھ کھانے پینے سے کون منع کر سکتا تھا۔ وہ ایک ریستوراں میں داخل ہوئے۔ ریستوراں کا مالک ایک خوش مزاج باتونی بڈھا تھا جو نوجوان جوڑے سے فوراً گھل مل گیا۔ انھوں نے ہلکا سا ناشتہ کیا اور جب ناشتے کے بعد ایک ہلکی سی شراب کا دور شروع ہوا تو اُن کی درخواست پر بوڑھا بھی اس میں شریک ہو گیا۔ گفتگو کا سلسلہ چل نکلا، اور جلد ہی نوجوان شوہر نے مکان کا قصہ چھیڑ دیا، کیونکہ یہی وہ بات تھی جو دونوں کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ مکان کا ذکر چھڑتے ہی بوڑھا چیخ پڑا۔ ارے صاحب! وہ مکان! خدا اپنی پناہ میں رکھے! وہ تو آسیب زدہ ہے۔ برسوں سے اس مکان میں راتوں کو اور کبھی کبھی دن کے وقت بھی ایک نوعمر لڑکی کا بھوت نظر آیا کرتا ہے۔ اگرچہ اُس بھوت نے آج تک کسی سے تعرض نہیں کیا۔ بے چارہ بالکل بے ضرر ہے۔ اور آج تو اُس مکان میں ایک چھوٹی موٹی قیامت برپا ہے۔ میرے باورچی کا لڑکا وہاں مالی کا کام کرتا ہے۔ ابھی وہ وہاں سے ہانپتا کانپتا بھاگا ہوا آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ آج وہ بھوت دن دہاڑے عالم انسانی روپ میں وہاں موجود ہے۔ بلکہ آج تو اُس کے ساتھ نوجوان مرد کا بھوت بھی ہے۔ دونوں بڑے مزے کے

ساتھ وہاں روشوں پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ شوہر نے پریشان ہو کر بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو
تھا اور آنکھیں خوف یا حیرت کے باعث پھٹی پڑ رہی تھیں۔ بوڑھے نے بات کو مذاق میں اُڑانے کی کوشش
کی، لیکن جو کچھ یہ دونوں جانتے تھے وہ بھلا آپ کے کب معلوم تھا!"

"کیا خیال ہے؟" میں نے قصّہ ختم کر کے آغا سے پوچھا۔

"کوئی پُراسرار بات نہیں ہے" وہ بولے۔ "جدید نفسیات نے ثابت کر دیا ہے کہ کسی انسانی ذ
کا کوئی حصہ خاص خاص حالات میں اپنی اصل سے جدا ہو کر خارج میں وجود پذیر ہو سکتا ہے اور......"

میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا، "آغا! تم اپنی نفسیاتی تحلیل و تعلیل کو فی الحال اپنے پاس رکھو
میں تم کو ابھی اپنا واقعہ سناتا ہوں اور اس کے بعد دیکھوں گا کہ تم اس کی کیا نفسیاتی تاویل پیش کرتے

"وہ بھی سنا ڈالیے،" آغا کسی قدر مرعوب ہوتے ہوئے بولے۔

میں نے کہا، "یاد رہے کہ یہ کوئی افسانوی روداد نہیں ہے، بلکہ ایک حقیقی چشم دید واقعہ ہے
خود میرے ساتھ پیش آیا ہے۔ یہ گویا آپ بیتی ہے جس کی صداقت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ

"لاریب! لاریب!" آغا نے چہکنے کی کوشش کی۔

"اچھا تو سنو،" میں نے کہا۔ "میں کل صبح سعیدہ کے یہاں گیا تھا۔ ہولی کے فوراً بعد ہم لگ
جا رہے ہیں اور چند روز مکان بالکل خالی رہے گا۔ اس لیے ضروری سمجھا کہ بیوی اور لڑکیوں کا زیو
سعیدہ کے یہاں پہنچا دیا جائے۔ زیورات کی صندوقچی اپنی اٹیچی میں رکھ کر علی الصباح روانہ ہو گیا۔ او
بھی سوچا کہ واپسی پر اٹیچی میں زیورات کی صندوقچی کی جگہ پانوں کی ایک ڈھولی رکھ کر لیتا آؤں گا۔
شاید پہلی ہی بس تھی جس سے میں نے سفر کیا۔ وہاں پہنچا ہوں تو ناشتے کی تیاری ہو رہی تھی۔ واجد
ڈیوٹی پر جا چکے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کے ساتھ ناشتہ کیا۔ زیورات کی صندوقچی سعیدہ کے حوالے
اٹیچی میں صندوقچی کے نکل جانے سے جو جگہ خالی ہوئی اس کو سعیدہ نے فیکٹری کے بنے ہوئے ایک
گل دان سے پُر کر دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر دس گیارہ بجے وہاں سے چل د
بس کا اڈّا زیادہ دور نہیں تھا۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ کا راستہ ہوگا۔ ابھی دھوپ میں

زیادہ تیزی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ پیدل ہی بس کے اڈے کا رخ کیا۔ وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ بس آچکی ہے اور تھوڑی دیر میں روانہ ہوگی۔ ٹکٹ خریدا اور بس میں جا بیٹھا جو ابھی تقریباً خالی تھی۔ بمشکل تین چار مسافر اپنی جگہوں پر نظر آرہے تھے۔ مجھے بس میں بیٹھے دو تین ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ بس کے باہر سے میرے کان میں ایک کڑک دار آواز آئی، "پیسہ دے"! میں نے مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کوئی معمر سا فقیر تھا۔ اُس نے اس طرح اکڑ کے "پیسہ دے" کی صدا لگائی تھی کہ میں نے اسے کچھ دینا دلانا ضروری نہیں سمجھا اور خاموش اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ عام طور پر لوگ بھکاری کی التجا کو اِس طرح سنتے ہیں گویا کچھ سُن ہی نہیں رہے ہیں اور اُس کے پھیلے ہوئے دستِ سوال کو اس طرح دیکھتے ہیں گو یا کچھ دیکھ ہی نہیں رہے ہیں۔ یہ انتہائی بے حسی کا رویہ ہے جو تم جانتے ہو کہ میرا مسلک کبھی نہیں رہا۔ لیکن اس وقت اس فقیر کا طنطنہ مجھے واقعی برا معلوم ہوا۔ اس لیے میں نے بھی وہی بے حسی کا انداز اختیار کیا۔ کچھ ہی دیر میں "پیسے دے" کی کڑک دار آواز پھر میرے کانوں سے ٹکرائی اور اس دفعہ لہجہ پہلے سے بھی زیادہ کرخت تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا لیکن تحمل سے کام لیا۔ اور یہ طے کیا کہ اگر اس فقیر نے اس مرتبہ پھر یہی حرکت کی تو اس سے اتنا تو ضرور کہوں گا کہ بھئی تم بھیک مانگتے ہو یا نادر شاہی حکم جاری کرتے ہو؟ سر دست میں نے اس کی طرف سے مکمل بے اعتنائی اختیار کی اور اپنی اٹیچی کھولی تاکہ کتاب نکال کر پڑھنا شروع کردوں۔ اٹیچی کھلی تو اس میں پَن دان نظر آیا اور گُل دان نے جو جگہ گھیر رکھی تھی اس کو دیکھ کر یہ یاد آیا کہ میرا ارادہ پانوں کی ڈھولی بھی تو خریدنے کا تھا۔ وہ ارادہ میرے ذہن سے بالکل ہی نکل گیا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بس ابھی نصف سے زیادہ خالی تھی۔ لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ روانگی میں ابھی پندرہ بیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے کچھ عجب نہیں جو آدھ گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ وقت لگ جائے۔ میں نے فوراً فیصلہ کیا کہ لپک کر پانوں کی منڈی تک ہو آؤں۔ ذرا دور تو ہے ہی دس پندرہ منٹ میں واپس آجاؤں۔ چنانچہ ہڑ بڑا کر اٹھا، اٹیچی سنبھالی اور بس سے اُتر پڑا۔ سامنے ہی یکوں کا اڈّا تھا۔ خیال آیا کہ اگر یکے ہی چلا جاؤں تو اور بھی اچھا ہے۔ چند ہی منٹ میں واپس آجاؤں گا۔ یکوں کی طرف بڑھا۔ وہاں کوئی ایسا یکہ نہیں تھا جو دو تین سواریوں کو بٹھائے ہوئے ایک آدھ مزید سواری کے انتظار میں کھڑا ہو۔ مگر

اب چونکہ یکے پر ہی جانے کا موڈ بن چکا تھا، اس لیے ایک خالی یکے میں سوا ہو گیا۔ بلا سے دو چار آنے کا خرچ اور سہی۔ اس سارے ہنگامے میں اُس فقیر کو میں بالکل بھول گیا۔ بلکہ اس کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا۔ پانچ سات منٹ میں یکے نے مجھے پانوں کی منڈی پہنچا دیا۔ یکے سے اُتر کر ایک تھوک فروش کی دوکان کا رُخ کیا۔ وہاں کافی بھیڑ تھی۔ پان فروشوں اور پنواڑیوں کے علاوہ مجھ جیسے عام گاہک بھی خاصی تعداد میں تھے۔ اس ہڑبونگ میں پوری ڈھولی خریدنا کچھ نامناسب معلوم ہوا۔ پھر میری اٹیچی میں زیادہ جگہ بھی نہیں تھی۔ اس لیے صرف ایک مٹھا پانوں کا خرید لیا اور اٹیچی کھول کر اس کو شیشے کے گل دان میں داخل کر دیا۔ جیب سے ایک نوٹ نکال کر دوکان دار کو دیا۔ بقیہ پیسوں کے انتظار میں کھڑا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، پیسہ دے! اور آواز میں وہی گھن گرج جو پہلے تھی۔ مڑ کر دیکھا تو وہی شخص سائے کی طرح میرے جسم سے لگا کھڑا تھا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ میں تو یکے میں سوار ہو کر آیا، لیکن یہ شخص پیدل ہی چل کر میرے ساتھ یہاں تک پہنچ گیا۔ اتنے میں دوکاندار نے بقیہ پیسے دئے جو پورے نہیں تھے۔ اس پر دکاندار سے کچھ جھک جھک ہوئی۔ کچھ تو اس جھک جھک کی بدمزگی اور کچھ یہ خیال کر مجھے فوراً بس میں اپنی جگہ پر پہنچنا چاہیے، میں ہر غیر متعلق بات کو اپنے ذہن سے خارج کر کے وہاں سے چل پڑا۔ سڑک پر کہیں کوئی یکہ نہیں تھا۔ تیزی سے ہانپتا کانپتا پیدل روانہ ہو گیا۔ مشکل سے بیس پچیس قدم آگے بڑھا ہوں گا کہ پیچھے سے ایک یکہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سواریوں سے لدا ہوا تھا، لیکن یکے والے کو مجھے بھی بٹھا لینے میں اپنا فائدہ ہی نظر آیا، اور میں خاصے مزے کے ساتھ یکے کے ایک ستون سے لٹکتا ہوا بس کے اڈے پر پہنچ گیا۔ بس اب تقریباً بھر چکی تھی۔ مجھے پھر آسانی کے ساتھ جگہ مل گئی۔ بیٹھ کر پسینہ پونچھنا شروع کیا۔ رومال ابھی ماتھے تک پہنچا ہی تھا کہ "پیسہ دے" کی دندناتی ہوئی آواز پھر کانوں سے ٹکرائی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بس کے باہر وہ حضرت حسب سابق موجود تھے۔ اب تو میں لرز گیا! میں نے سوچا کہ یہ تو کچھ اور ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو سکے میری مٹھی میں آئے وہ ان کی طرف بڑھا دئے۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا حکم صادر فرمایا ـــ کھانا کھلا! اب میری تابِ مقاومت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ میں بلا پس و پیش اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اٹیچی ہاتھ میں لی اور بس سے نیچے اتر گیا۔ بس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے

کہا بھی کہ اب آپ کہاں چلے؟ اب بس کی روانگی میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ مگر میں نے اس اطلاع کو کوئی اہمیت نہیں دی سفر کی وحشت کی بجائے اب میرے سر پر دوسری وحشت سوار ہو چکی تھی۔ بس سے باہر آکر میں نے اُن سے کہا، آیئے شاہ صاحب! کھانا کھا یئے۔ سامنے دو تین حلوائیوں کی دوکانیں تھیں۔ میں ایک دوکان کی طرف بڑھا۔ مگر پھر سوچا کہ یہ تو ہندو حلوائی کی دوکان ہے۔ خدا جانے اس کے یہاں کی چیز کھانا ان کو منظور ہو یا نہ ہو۔ دوبارہ ان کی طرف پلٹا۔ وہ سڑک کے عین وسط میں سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے کہا، شاہ صاحب! یہاں کوئی مسلمان دوکان دار تو ہے نہیں۔ ہندو حلوائی کی دوکان سے کچھ لے آؤں؟ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر کو کچھ اس طرح ہلایا گویا ان کو کسی چیز پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے کہا، شاہ صاحب! آپ یہاں دھوپ میں کھڑے ہیں۔ وہ سامنے مسجد ہے، وہاں چلیے۔ میں کھانے کی چیزیں لے کر وہیں آتا ہوں۔ میں نے چار پوریاں، دو خستہ کچوریاں اور دو سموسے خریدے۔ ایک الگ دونے میں حلوائی نے آلو کی ترکاری دی۔ تینوں دونے اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے میں سڑک کے اُس پار مسجد کی طرف بڑھا۔ یہ مسجد کیا ہے، قدیم زمانے کی کسی مسجد کے کھنڈرات ہیں۔ کسی مسلمان جاگیردار نے کبھی تعمیر کرائی ہوگی۔ مسجد کے باہر صدر دروازے کے دونوں طرف سُرخ پتھر کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے حجرے ہیں جو اب بغیر دروازوں کی کوٹھریاں معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب ایک حجرے میں دیوار کی ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ میں نے وہاں پہنچکر اپنا رومال اُن کے آگے بچھایا اور تینوں دونے سامنے رکھ دیئے۔ پھر لپک کر مسجد کے اندر گیا اور ایک بدھنے میں پانی بھر لایا۔ شاہ صاحب کھاتے رہے۔ میں سامنے کی دیوار کے سہارے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ چند لقموں کے بعد انھوں نے سر اُٹھایا اور بولے، تیرا سامان کہاں ہے؟ اللہ رے رے! غضب ہو گیا! میں اپنی اٹیچی تو حلوائی کی دوکان پر ہی بھول آیا۔ بھاگا وہاں سے اور تیر کی طرح دوکان پر پہنچا۔ حلوائی اٹیچی کو اپنے زانو کے نیچے دبائے لوگوں کو سودا دے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ہنسا اور اٹیچی میرے حوالے کی۔ میرا اُدھر اکثر آنا جانا رہتا ہے نا۔ اِس لیے وہ مجھے پہچان سا گیا تھا۔ بہرحال اٹیچی لے کر میں شاہ صاحب کی طرف گیا۔ وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ میں نے دونے

اٹھاکر سڑک پر پھینکے۔ اپنا رومال سمیٹا، اور بدھنا مسجد میں رکھ آیا۔ شاہ صاحب! کوئی اور خدمت؟ میں نے ان سے کہا۔ وہ چند سے خاموش رہے۔ پھر بولے، کیا چاہتا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ میرے حواس بجا نہیں تھے۔ میں صرف اتنا کہہ سکا، شاہ صاحب! میرے لیے دعا کیجیے۔ وہ بولے، اچھا جا! جا! جا! یہ سنتے ہی میں وہاں سے پلٹا اور پسینہ پونچھتا ہوا اس جگہ آگیا جہاں کچھ دیر پہلے بس کھڑی تھی اور اب جا چکی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ایک دزدیدہ نظر مسجد کے حجروں کی طرف ڈالی۔ آغا صاحب! کیا آپ میری بات کا یقین کریں گے؟ وہاں شاہ صاحب کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ مگر وہاں کوئی ہوتا تو دکھائی بھی دیتا۔ میری حالت غیر ہونے لگی۔ یہ خیال بھی آیا کہ جب انھوں نے کہا، کیا چاہتا ہے؟ تو میں نے کوئی ٹھوس مفید چیز کیوں نہ طلب کرلی؟ میری عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے؟ اور سٹی گم کیوں ہوگئی؟ جتنا سوچتا اتنا ہی زیادہ پریشان ہوتا۔ پھر مجھے شدید تھکن محسوس ہوئی۔ میں نے طے کیا کہ اِس وقت سفر کو ملتوی کیا جائے اور بہن کے گھر جاکر آرام کیا جائے۔ چنانچہ یکے کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ لیکن اب یہ ہول سمایا کہ اگر راستے میں پھر کسی اجنبی شخص سے ملاقات ہوگئی تو کیا کروں گا ـــــ پھر یہ سوچا کہ اگلی بس بھی آتی ہی ہوگی۔ کیوں نہ اُس سے نکل ہی جاؤں؟ مگر ساتھ ساتھ یہ خیال بھی حملہ آور رہا کہ بس میں بیٹھنے کے بعد اگر باہر سے پھر "پیسے دے" کی کڑک دار آواز سنائی دی تو کیا کروں گا۔ غرض کہ کچھ دیر سخت الجھن اور پس و پیش کی حالت رہی۔ آخر میں حلوائی کے پاس گیا اور اس سے کہا، دیکھنا بھئی! میری طبیعت ذرا خراب ہوگئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تمھاری دوکان میں بیٹھ کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے فوراً میرے بیٹھنے کا انتظام کردیا اور میں دوکان کے اندر ایک دیوار کی ٹیک لگاکر اور سر کو گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ گیا اور ماحول سے غافل ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن حواس کو مجتمع نہیں کر سکا اور طبیعت کو سکون نہیں ملا۔ لہٰذا پھر حلوائی سے مخاطب ہوا۔ دیکھنا بھائی! تم اپنی دوکان کے کسی آدمی کو یہاں سامنے گلاس فیکٹری تک بھیج سکتے ہو؟ وہاں کوارٹروں میں میرا بھانجا رہتا ہے۔ واجد علی انجینیر۔ بس تمہارا آدمی وہاں جاکر یہ کہہ دے کہ تمھارے ماموں کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ جاکر ان کو لے آئے۔ حلوائی کے یہاں تو کوئی ایسا شخص نہیں تھا۔ لیکن دوکان کے سامنے دو تین آدمی کھڑے تھے۔ اُس نے اُن میں سے

ایک نوجوان سے بات کی اور وہ تیار ہوگیا۔ میں نے اُس کو بہن کے گھر کا پتہ ٹھیک ٹھیک بتا دیا اور وہ اپنے مشن پر روانہ ہوگیا۔ چند ہی منٹ میں واجد اپنے ایک انجینیر دوست کے ساتھ کار لیکر آن موجود ہوئے۔ انھوں نے مزاج کی کیفیت معلوم کرنی چاہی۔ میں نے کہا، گھر چل کر بتاؤں گا۔ گھر پہنچے تو وہاں بھی اضطراب کی لہر دوڑی ہوئی تھی اور سعیدہ سخت پریشانی کے عالم میں دروازے پر کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔ میں گاڑی سے اُتر کر سیدھا بستر کی طرف گیا اور تمام مزاج پُرسی کرنے والوں سے کہہ دیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس تھک گیا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ غرضکہ بستر پر دراز ہوا اور چاہا کہ کچھ دیر سو لوں یا آنکھیں بند کیے پڑا رہوں۔ مگر یہ بھی نہیں ہوا، کیونکہ لیٹتے ہی حرارت محسوس ہوئی اور تھوڑی دیر میں اچھی خاصی بخار کی سی کیفیت ہوگئی۔ قصہ مختصر یہ کہ ڈاکٹر آیا۔ دوا پلائی گئی۔ سہ پہر یا شام کو گھر کے لیے روانہ ہونے کا ارادہ بھی ترک کرنا پڑا۔ اور رات وہیں گزارنے پر مجبوراً راضی ہونا پڑا۔ صبح اُٹھا تو طبیعت بالکل صاف تھی۔ بخار رات میں کسی وقت اُتر گیا تھا ــــــ"

"ہیں! کیا کہا؟" آغا اچانک اچھل کر بولے۔ "آپ نے رات وہیں گزاری؟"

"ہاں ہاں! کیوں؟ کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا

"گویا آپ نے رات وہیں بسر کی! یعنی کل شام آپ یہاں نہیں تھے؟ ــــ اچھا خیر۔ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، ہونا کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوکر واپسی کا قصد کیا۔ واجد اپنے دوست کی کار لائے اور مجھے یہاں پہنچایا۔ میں نے ان سے کہدیا تھا کہ اب میں بس میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ غرضکہ میں صبح دس بجنے سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔ دن بھر پڑا رہا اور تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہوتا رہا۔ یہ بھی سوچا تھا کہ جمال کو بھیجکر تمھیں بلوا لوں گا۔ مگر تم خود ہی آگئے۔"

"تو گویا آپ نے کل کا پورا دن گھر سے باہر گزارا اور آج صبح واپس آئے؟" آغا نے پھر کہا۔

"ہاں ہاں بھائی بتایا تو! آخر تم اس بات کو کیوں رٹے جارہے ہو؟ کتنی دفعہ کہوں کہ مجھے رات وہیں گزارنی پڑی اور آج صبح طبیعت ٹھیک ہونے پر میں واپس آیا۔"

اس پر آغا نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔ میں ان کی بے موقع بظاہر بے وجہ ہنسی پر حیران ہوتا رہا

جب اُن کی کھلی ہوئی باچھیں اپنی اصلی جگہ پر واپس آگئیں تو بولے، "یہ واقعہ تو آپ نے گھڑا۔ خاصا زرخیز دماغ پایا ہے آپ نے!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ جناب والا کہ کل شام کو میں نے اپنی آنکھوں سے آپ کو گاندھی روڈ پر دیکھا۔ یہیں، اسی شہر میں موجود تھے۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے؟" میں نے کہا۔ کل شام تو میں بہن کے گھر میں پڑا ہوا تھا۔ فیور مکسچر کی خوراکیں حلق سے اُتار رہا تھا۔ تم نے یہاں گاندھی روڈ پر میرے بھوت کو دیکھا ہو

"ہوسکتا ہے وہ آپ کا بھوت ہی ہو،" آغا نے کہا، "لیکن میں اتنا مخبوط الحواس نہیں ہو ابھی میری بینائی ہی اتنی کمزور ہوئی ہے کہ کسی بجلی کے کھمبے یا کسی عمارت کے ستون پر مجھے آ۔ دھوکا ہو جائے۔ میں سردار کلاتھ ہاؤس میں بیٹھا ہوا مہندر سنگھ سے باتیں کر رہا تھا کہ آ۔ سڑک کے چوراہے کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے۔ آپ بہت لپکے ہوئے چلے جا رہے ت میں کئی آدمیوں میں گھرا ہوا بیٹھا تھا، ورنہ شاید باہر نکل کر میں آپ سے بات بھی کرتا۔"

"بھئی حد ہوگئی!" میں نے کہا۔ "بہر حال اِس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ میں کل شام یہاں نہ یہاں سے کم از کم دس میل کے فاصلے پر تھا۔"

"اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میں نے کل شام آپ کو بازار میں دیکھا۔" آغا صاحب نے دیا۔ "آپ وہی اپنی کتھیا سلک والی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ اُس کپڑے کی شیروانی یہاں او پہنتا ہے؟ کسی دوسرے شخص کے پاس نہیں ہے۔"

"تو یہ تو ایک معمہ ہوا،" میں نے کہا۔ "اب اِس کو کون حل کرے۔"

"اِس معمے کا اگر کوئی حل ہوسکتا ہے تو صرف یہ کہ آپ کے اندر بیک وقت دو جگہ موجود ہو

صلاحیت ہے!" آغا نے جواب دیا۔

"واللہ حد ہوگئی!" میں چیخ پڑا۔ "یعنی یک نہ شُد دو شُد!"

اور پھر ــــ آغا صاحب کے جانے کے بعد ــــ مجھے یاد آیا کہ اُس روز بہن کے یہاں غروبِ آفتاب کے بعد بستر پر پڑے پڑے میری طبیعت کچھ گھبرائی اور جی چاہا کہ گھر سے باہر نکل کر فیکٹری کی سڑکوں پر ذرا دیر چہل قدمی کروں۔ چنانچہ بستر سے اٹھا، شیروانی پہنی اور کمرے سے باہر آیا۔ بہن کو میرے ارادے کا پتا چلا تو انھوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اس حالت میں تو آرام کرنا ہی بہتر ہوگا۔ پھر میری ہمت بھی جواب دے گئی۔ اور میں سخت بے دلی اور کوفت کے عالم میں دوبارہ کمرے میں پہنچا اور شیروانی پہنے پہنے بستر پر پڑ رہا اور اسی حالت میں کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگ گئی۔ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ اُسی نیند کے دوران میں مَیں اپنے شہر کے بازار میں آن پہنچا ہوں اور جس دوکان میں آغا صاحب بیٹھے تھے اس دوکان کے سامنے سے گزرا ہوں۔ ایک دھندلی سی یاد تو ہے کہ اِس قسم کا کوئی خواب دیکھا تھا۔ واللہ اعلم!

میں نے آغا صاحب کو ہلا کر رکھ دینے کا ارادہ کیا تھا، لیکن خود ہی ہل کر رہ گیا!

بیان بابت ملکیت ماہنامہ جامعہ و دیگر تفصیلات

(فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہانہ

۳۔ پرنٹر کا نام : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۴۔ پبلشر کا نام : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۵۔ ایڈیٹر کا نام : ضیاء الحسن فاروقی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پرنسپل جامعہ کالج، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر : عبداللطیف اعظمی

۲ر مارچ ۱۹۷۰ء

d. No. D - 766 March 19..

The Monthly JAMIA
JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سالانہ چندہ
چھ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۱ | بابت ماہ اپریل ۱۹۷۰ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

اڈیٹر: ۷۴۲۵۸ — منیجر: ۷۴۳۷۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائیٹل: دیال پریس

شذرات

(پروفیسر محمد حبیب کا خیال ہے کہ محبوب الٰہی، سلطان الاولیاء حضرت نظام الدینؒ کی اخلاقی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ———) نماز انسان کے لئے بنائی گئی ہے نہ کہ انسان نماز کے لئے۔ نماز کے ساتھ دوسرے اعمال خیر میں زیادہ انہماک رکھو۔ نماز انسان کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس بات پر جس قدر غور و فکر کیجئے، اسرار دین کھلتے جاتے ہیں۔ سچی عبادت کے ذریعے بندے کا خدا سے جو تعلق قائم ہوتا ہے اس کی گوناگوں کیفیتوں کا حال اُن سے پوچھئے جن پر یہ کیفیتیں گذرتی ہیں، اور غالباً وہ بھی بالکل صحیح صحیح انھیں بیان نہیں کرسکتے۔ آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔ خدا سے اس تعلق کا اثر انسان کی زندگی اور اس کی سیرت اور کردار کے ہر پہلو پر پڑتا ہے، اس کا پہلا اثر تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں تواضع، مسکنت اور ندامت کا احساس جاگزیں ہو جاتا ہے، انانیت ٹوٹ جاتی ہے اور اخلاق حسنہ کے لئے دنیائے احساسات کی فضا ہموار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی ہی عبادت اور اس سے پیدا ہونے والی اسی طرح کی وابستگی کو پسند فرماتے ہیں۔ کہیں پڑھا ہے کہ خدا ہر عبادت گزار کی عبادت قبول نہیں کرتا۔ اس کے یہاں تو اسی کی عبادت مقبول ہے جس نے تواضع اختیار کی اور اس کے بندوں پر جبر نہیں کیا، نیز بھوکے اور حاجتمند کو محض اُس کی خوشنودی کے لئے کھانا کھلایا۔ پس خدا سے یہ تعلق انسان کے دل میں یہ جذبہ بھی پیدا کرتا ہے کہ اللہ کے اخلاق کو اپنی زندگی میں پیدا کرنے کی کوشش کرے اور قرب الٰہی کی لذتوں سے بہرہ یاب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء نے خدمتِ خلق کو اصل عبادت قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بے پایاں اور بغیر کسی امتیاز کے تمام مخلوق کیلئے ہیں، یہی اخلاق الٰہی ہے اور اسی ایک کو اگر انسان اپنی عبادات کے وسیلے سے اپنے اندر پیدا کرلے تو حضرت محبوب الٰہی کی مذکورہ اخلاقی تعلیم کی بے پناہ اہمیت کا

اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اس سلسلے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ عبادت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک لازمی جس کا تعلق اور جس کی فیض رسانیاں انسان کی اپنی ذات تک محدود ہیں اور دوسری متعدی جس کا فائدہ عبادت گذار کی ذات سے گذر کر دوسروں تک بھی پہونچتا ہے اور دوسروں تک اسی طرح پہونچ سکتا ہے کہ انسان "تخلقوا باخلاق اللّٰہ" پر عمل کرکے دوسروں کو اپنے رحم و کرم، فیاضی و سخاوت، عدل و انصاف، عیب پوشی و حلیمی سے فائدہ پہونچائے اور معاملات میں سچا اور کھرا ہو۔ بلاشبہ اس دوسری قسم کی عبادت کا اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا درجہ ہے۔ اوپر یہ جو بات کہی گئی ہے کہ سماع کے ساتھ دوسرے اعمال خیر میں زیادہ انہماک رکھو تو اس کا مطلب یہی ہے۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ نیکی کے بدلے نیکی کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے لیکن عام طور پر بدی کے بدلے نیکی کرنے کے لئے رضامند نہیں ہوتی، لیکن بارگاہِ الٰہی میں اس کا بڑا انعام ہے اگر بدی کے بدلے نیکی کی جائے، کوئی بُرائی کرے، آزار پہونچائے، تو عفو اور درگذر سے کام لیا جائے، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت عدل ہے لیکن عفو اور درگذر "احسان" ہے اور اس کا بڑا مرتبہ ہے۔ عام انسانی طبیعتیں اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتیں لیکن انسان کو کوشش یہی کرنی چاہیئے اور یہی اس کا آدرش ہونا چاہیئے۔ اخلاقِ الٰہی بھی یہی ہے، بے شمار لوگ ہیں جو اس کی اطاعت نہیں کرتے، کتنے ہیں جو اس کے وجود کے قائل نہیں، بہتیرے نافرمانی ہی میں اپنی انا کی تسکین کا سامان پاتے ہیں، لیکن وہ سب کا رازق، رب اور پروردگار ہے، منکروں کو بھی رزق اور ان کی محنت کا پھل دیتا ہے، یہ نہ ہو تو دنیا کا کارخانہ چل نہیں سکتا، ہر طرف بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہو کیونکہ دنیا میں نیک، خدا ترس اور فرمانبردار بندے کتنے ہوتے ہیں؟ اسی لئے درویشی یہ ہے کہ انسان اپنی حیوانی قوت کو دبائے اور اخلاق

اور اخلاق کی قوت کو ابھارے جو صلہ رحمی، محبت اور اطاعت حق کا جذبہ پیدا کرتی ہے، حضرت سلطان اللہ اولیاءؒ نے فرمایا ہے کہ درویش کا فرض ہے کہ روح کے تقاضوں کو ترجیح دے، وہ نہ صرف نیکی کے بدلے نیکی بلکہ بدی کے عوض میں بھی نیکی کرے کیونکہ اگر لوگ حیوانی قوت کے تقاضوں پر عمل کریں تو دنیا میں فتنہ وفساد کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا۔ پروفیسر محمد حبیب نے ابھی حال میں دہلی یونیورسٹی میں حضرت محبوب الٰہیؒ اور اُن کی اخلاقی تعلیمات کے موضوع پر جو نظام لکچرز دئے ہیں، اُن میں انھیں باتوں کو اجاگر کیا ہے، انھوں نے کہا کہ فارسی اشعار جو حضرتؒ اکثر پڑھا کرتے تھے آپ کے عفو ورحم کے کامل طور پر آئینہ دار ہیں۔
ان اشعار کا مفہوم یہ ہے "جو میرا یار نہیں خدا اس کا یار ہو، جو مجھے آزار پہونچائے خدا اس کی مسرت میں اضافہ کرے، جو کوئی میری راہ میں کانٹے بچھائے حق تعالیٰ اس کی زندگی کے پھول کو کانٹوں سے بچائے"۔

یہ باتیں دلوں کو جوڑنے والی ہیں، افسوس ہے کہ انسان ان کی طرف توجہ نہیں کرتا اور اپنے اندر کی نفسانی قوت کے اشارے پر چلتا ہے، خودغرضی، خودپروری، بدی اور مردم آزاری اپنا شعار بنالیتا ہے اور انھیں چیزوں کو سرمایۂ حیات سمجھ بیٹھتا ہے، ایک روز حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور بڑی عقیدتمندی سے انھیں ایک قینچی نذر کرنی چاہی۔ آپ نے فرمایا میرا کام جوڑنا ہے جُدا کرنا نہیں ہے، تم مجھے ایک سوئی اور دھاگا لادو ـــــ یہاں بھی وہی 'فصل' کے بجائے 'وصل' کی طرف اشارہ ہے، شیخ رومیؒ نے اس طرح وضاحت کی ہے:

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

مولانا کمال الدین زاہد اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے، علم حدیث میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حدیث کی تعلیم انھیں سے حاصل کی تھی، ایک دن سلطان بلبن نے آپ کو بلایا اور کہا کہ آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا متمنی ہوں، آپ امامت قبول فرمائیے

کہ اس طرح آپ کی امامت میں میری نمازیں قبول ہو جائیں گی۔ مولانا زاہدؔ خوب سمجھتے تھے کہ یہ دنیوی جاہ و جلال کا ایک جال ہے، اس میں پھنس گئے تو نماز اور عبادت کا جو مقصد ہے اسی کے فوت ہو جانے کا امکان ہے، بڑی خوبی سے جواب دیا "ہمارے پاس لے دے کے نماز رہ گئی ہے، سلطان اس کو بھی ہم سے چھیننا چاہتا ہے" سلطان نے پھر اصرار نہیں کیا، معذرت کی اور مولانا کو رخصت کر دیا۔ سوال یہ کہ مولانا زاہد نے اپنی نماز کو اس جنجال سے محفوظ کیوں رکھنا چاہا؟ میرے خیال میں وہ اپنی نماز اور اپنی عبادت کو حضور قلب کی دولت سے محروم کرنا نہیں چاہتے ہوں گے، فقہاء کے نزدیک نماز میں سلطان وقت کی امامت شریعت کے عین مطابق ہے لیکن صوفیانہ زندگی گذارنے والے اپنے اور اللہ کے درمیان کسی ایسی چیز کو آنے دینا نہیں چاہتے جس سے حضور قلب کی ضیا گستری میں کوئی رکاوٹ ہو۔ حضرت حسنؓ نے فرمایا ہے: "جس نماز میں دل حاضر نہیں وہ تو ثواب کے بجائے عقوبت کی زیادہ مستحق ہے" حضرت معاذ بن جبلؓ کا کہنا ہے: "نماز میں جس شخص کو یہ خیال رہے کہ اس کے دائیں بائیں کون کون لوگ کھڑے ہیں اس کی نماز نہیں ہوتی" امام غزالیؒ نے احیاء العلوم الدین میں ایک حدیث نقل کی ہے: "کم من قائم حظہ من صلاتہ التعب والنصب" (کتنے ہی نماز پڑھنے والے ایسے ہیں کہ ان کا حصہ نماز میں بس اتنا ہے کہ اس سے تھکن اور کوفت حاصل کرتے ہیں) —— —— پس یہ جو کہا گیا ہے کہ نماز انسان کے لئے بنائی گئی ہے، تو اس سے مقصود وہی نماز ہے، جس سے حضور قلب کی دولت بیدار ملتی ہے اور اس دولت بیدار کی برکتوں کا شمار نہیں۔ ہمارے "ایماں کی حرارت" والے ہم قوم اور ہم جماعت اگر نماز اور عبادت کے اس مفہوم سے آگاہ ہو جائیں اور اپنی نمازوں اور عبادتوں میں اسے برتیں، تو انفرادی اور جماعتی دونوں طرح کی زندگیوں میں ایک انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

ایمیلی ڈی کنسن

ترجمہ: پروفیسر محمد مجیب

چند نظمیں

(ایمیلی ڈی کنسن (EMILY DICKINSON) امریکہ کی ایک مشہور شاعرہ ہیں، ۱۰ دسمبر ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوئیں اور ۱۵ مئی ۱۸۸۶ء کو وفات پائی۔ ایک عرصے تک ان کی شاعری کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی، ۱۹۱۲ء میں ایک غیر معروف شاعرہ کی حیثیت سے یاد کیا گیا اور اب امریکی ادب میں ان کی شاعری کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور بہت سے ادیبوں اور نقادوں کی نظر میں انیسویں صدی کی سب سے بڑی امریکی شاعرہ ہیں۔)

انساں کے لئے وقت نکل گیا تھا،
مگر خدا کے لئے ابھی آیا نہ تھا
کائنات کے بس میں نہ تھا کہ مدد کرے
مگر دعا ہماری طرف دار تھی۔

کیا خوب وہ جنت

جو ملے جب دنیا نہیں مل سکتی،
کیسا مہماں نواز لگتا ہے چہرہ
ہمارے پرانے پڑوسی، خدا کا!

میں نے کبھی کوئی دشت نہیں دیکھا
کبھی سمندر کو نہیں دیکھا،
مگر میں جانتی ہوں کہ دشت کی جھاڑیاں کیسی ہوتی ہیں
اور سمندر کی لہر کیسی ہوتی ہوگی۔

میں نے کبھی خدا سے بات نہیں کی،
نہ آسمان پر ملاقات کے لیے گئی۔
مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جگہ کہاں ہوگی
جیسے اسے نقشے پر دکھایا گیا ہو۔

کیا ہوگا اگر میں کہوں کہ بس اب اور انتظار نہ کروں گی ؟
کیا ہوگا اگر میں اس گوشت و پوست کے پھاٹک کو توڑ کر
بھاگ نکلوں، تیرے پاس پہنچ جاؤں ؟
کیا ہوگا اگر میں اس فانی عنصر کو جھیل کر
بس اتنا دیکھوں کہ یہ کہاں دکھا رہا تھا
اور آزادی کے پایاب میں چلنے لگوں ؟

اب ہم کو وہ نہیں پکڑ سکتے ـــــ
چاہے زمیں دوز قید خانے بلائیں، چاہے توپیں خوشامد کریں ؟
اب یہ سب میرے لئے بے معنی ہیں،
جیسے ہنسی جو گھنٹہ بھر پہلے آئی تھی
یا الیس، یا شہر شہر پھرتا ہوا تماشا
یا یہ سوال کہ کل کون مر گیا !

مجھے اپنے ٹوٹے ہوئے دل پر ناز ہے، اس لئے کہ تو نے اسے توڑا

مجھے اس درد پر ناز ہے جو تجھ سے ملنے سے پہلے محسوس نہ ہوا تھا،

مجھے اپنی رات پر ناز ہے اس لئے کہ تو نے اس کی پیاس کو چاند دل سے بجھایا،

اور میری درماندگی یہ کہ تیرے شوق میں شریک نہ ہو سکی۔

عشق زندگی سے قبل ہے،

موت کے بعد،

تخلیق کی ابتدا اور

سانس کا ترجماں

یہاں میرے ایک تیر لگا ہے،

میں اُس ہاتھ کو پیار کرتی ہوں جس نے اِس تیر کو چلایا،

تیر کا احترام کرتی ہوں

کہا جائے گا جنگ میں کام آئی !

مگر میری روح کو معلوم ہو گا کہ مجھے فتح کیا

ایک معمولی سے تیر نے

جسے کسی تیر انداز کی کمان نے اڑایا تھا

اے دل، ہم اسے بھلا دیں گے !

میں اور تم، آج کی رات

تم اس گرمی کو بھلا دینا جو اس نے پیدا کی تھی،

میں روشنی کو بھلا دوں گی۔

جب تم اپنا کام کر چکو تو مجھے بتا دینا،

کہ میں اپنے خیالات کی لو دھیمی کر دوں۔

مگر جلدی کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم تیاری میں لگے رہو

اور وہ مجھے پھر یاد آ جائے !

دل لاٹھی سے نہیں توڑا جاتا
نہ پتھر سے
میں نے دیکھا ہے کہ ایک چابک،
اتنا چھوٹا کہ نظر بھی نہ آئے،
اس طلسمی ہستی کو مارتا رہا
یہاں تک کہ وہ گر گئی،
مگر شرافت دیکھئے
کہ چابک کا نام تک نہ بتایا۔
کیا اعلیٰ ظرف ہے اس پرند کا
جسے ایک لڑکے نے شکار کیا
کہ اسی پتھر کو گیت سناتا ہے
جس سے وہ ہلاک ہوا۔

میں اُس خواب کے کامل حسن پر

صبح کا داغ نہ لگاؤں گی،
بس اپنی راتوں کو اس طرح ترتیب دوں گی،
کہ وہی خواب آئے اور پھر آئے۔

موت ایک مکالمہ ہے
روح اور خاک کے درمیاں
موت کہتی ہے، "گھل جاؤ مٹ جاؤ" ۔ روح، "جناب،
میرے سپرد ایک اور کام ہے"

موت اس پر رشک کرتی ہے، زمین کے اندر سے بحث کرتی ہے۔
روح منہ پھیر لیتی ہے،
بس ثبوت کے لئے
خاک کی قبا کو اتار دیتی ہے۔

سمندر نے چشمے سے کہا "آؤ"
چشمے نے کہا، "مجھے بڑھنے دیجئے!"
سمندر نے کہا، "تب تو تم سمندر ہو جاؤ گے،
مجھے چشمہ چاہیئے، ابھی آجاؤ!"

خواجہ غلام السیدین

نامۂ خلوص

دوستو، میرا یہ خط آپ سب کے نام ہے جو پاکستان میں معلمی کا یا لکھنے پڑھنے اور اس کے ذریعے زندگی کی صحیح قدروں کی ترجمانی اور اشاعت کا کام کرتے ہیں۔ میں نے بھی عمر بھر اپنی بساط کے موافق (اور کسی قدر چھوٹی ہے یہ بساط، بساطِ عالم کے مقابلے میں!) اسی قسم کا کام کیا ہے۔ کچھ پڑھا ہے، کچھ پڑھایا ہے، کچھ لکھا ہے، کچھ تقریریں کی ہیں اور اس کے پسِ پشت ہمیشہ یہ جذبہ رہا ہے کہ شریف قدروں کی خدمت کر سکوں۔ یوں تو ہر انسان کا فرض ہے، لیکن ہماری جماعت کا خاص طور پر فرض ہے، کہ وہ اپنی اور اپنے ملک اور قوم کی زندگی کا سختی کے ساتھ محاسبہ کرتی رہے اور سوچے کہ اُس نے زندگی کو، جو ظلم اور ناانصافی، محرومی اور افلاس، جہالت اور تعصب سے بھری ہوئی ہے، سنوارنے اور سدھارنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں، ممکن بھی نہیں، کہ ہر شخص جریدۂ عالم پر اپنے دوام کی مہر لگا سکے۔ یہ خوش نصیبی تو کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ لیکن اپنے قول و فعل سے، اپنی تحریر و تقریر سے، اپنی چھوٹی سی دنیا میں شرافت اور صداقت، رواداری اور فراخدلی، ہمدردی اور محبت کا پرچار کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں بہت سے نبی اور ولی، رشی اور مُنی، مصلح اور مردانِ خدا آئے جنھوں نے زندگی کو ایک حسین قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اس میں انھیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن کچھ مدت کے بعد ان کے ابتدائی فیض اور تعلیم کا اثر کم ہو گیا اور انھوں نے جس شاہراہِ نور کی جھلک دکھائی تھی وہ رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی آنکھ سے اوجھل ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ عام انسانوں کی قلبِ ماہیت کے لئے محض ایک معجزہ کافی نہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے لاکھ

رفقائے کار کی، جو دن بہ دن، سال بہ سال، صدی بہ صدی ان کے پیغام انسانیت کو دنیا کے کونے کونے میں عام کریں اور عام کرتے رہیں۔ اس لئے، باوجود انکسار کے، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ دراصل یہ کام ہمارا ہے، اور وہ سیاسی لیڈروں اور اہلِ قوت و ثروت کے کاموں سے کہیں زیادہ اہم ہے، کم اہم نہیں۔ ان کے کھیل میں اکثر ناپاک مقاصد اور نامبارک ذریعوں کی آمیزش ہوتی ہے جسے ہم لوگوں کے لئے قابلِ احترام ہیں نہ لائقِ تقلید!

ہمارے کام کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نسل اور رنگ، مذہب، ذات پات، تاریخ اور جغرافیہ کی تقسیم اور تفریق سے بلند ہے بلکہ شاید مجھے کہنا چاہیئے کہ اس کو ان سے بلند ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اہلِ علم، اہلِ قلم اور اہلِ فکر نے سیاسی دباؤ اور جبر سے مغلوب ہوکر یا کسی لالچ کے طلسم میں گرفتار ہوکر، بجائے حق اور صداقت کا علم بلند کرنے کے گھٹیا مقاصد کی چاکری قبول کرلی۔ ادیبوں، عالموں اور مفکروں کا ایسا کرنا، میرے نزدیک، نہ صرف علم، ادب اور فکر کے ساتھ بلکہ ہماری مشترک انسانیت کے ساتھ بھی غداری ہے۔

ہمارے ملکوں میں گذشتہ بیس سال سے بہت سے سیاسی اور اقتصادی اختلافات چلے جاتے ہیں۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے لیکن میں اس وقت ان کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میری یہ دعا اور خواہش ضرور ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر آمین کہیں، کہ خدا ہم سب کو اتنی عقل اور توفیق دے کہ ہم اپنے باہمی تعلقات اور مراسم میں اتفاق کو اختلاف پر، وصل کو فصل پر، محبت کو نفرت پر، اعتماد کو شک پر ترجیح دیں لیکن مشکل یہ ہے کہ دعا کرنا کافی نہیں۔ جس دعا کے پیچھے خلوص اور عمل نہ ہو، اس کی قبولیت کا خدا نے کبھی وعدہ نہیں کیا۔ مانتا ہوں کہ ان سیاسی جھگڑوں کو سلجھانا براہِ راست ہمارے بس کی بات نہیں۔ لیکن کیا ہم اپنے دل اور دماغ کی قوتوں کو، اپنے قلم اور زبان کو اس طرح استعمال نہیں کرسکتے کہ رفتہ رفتہ ہمارے ہم وطنوں اور ہم جنسوں کے دل اور دماغ میں فراخی اور رواداری پیدا ہو اور وہ آدمی کا احترام کرنا سیکھیں جس کو اقبال نے آدمیت کی بنیاد کہا ہے، آدمیت جو خدا کے طریقہ کو اپنا کر کفر و دین دونوں کو اپنے حریمِ قلب میں

بخش دیتی ہے، جو حرفِ بد زبان پر نہیں لاتی کیونکہ جانتی ہے کہ کافر اور مومن سب خدا کے بندے ہیں اور ان پر ایک ہی انداز میں شفقت کرتی ہے۔ جس کے نزدیک دل سے دل کا بھاگنا سب سے بڑا گناہ ہے! آج کل ساری دنیا میں سیاسی بدعنوانیوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے جو تاریکی چھائی ہوئی ہے اور انسانیت جن محرومیوں کا شکار ہے، ان کو دور کرنے کی کوشش کرنا ہمارا آپ کا کام ہے، مشترکہ کام ہے۔ جب دوسرے لوگ آگ لگائیں، تعلیم اور ادب کا فرض ہے کہ وہ اس کو بجھائیں، ہوا نہ دیں۔ اگر ہم خلیل اللہ کی سنت تازہ کرنا چاہتے ہیں، جو کسی خاص مذہب کی سنت نہیں بلکہ سنتِ الٰہی ہے، تو ہمیں یاد کرنا چاہئے کہ

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ بہ آتش نکو نشست

دورِ حاضر میں صرف ہندوستان اور پاکستان ہی کی نہیں بلکہ ساری دنیا کی فلاح ایک ہو گئی ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے یا نہیں مانتے وہ نہ صرف مفادِ عالم کے مطالبوں سے ناواقف ہیں بلکہ اپنے وطن کے حقیقی مفاد کو بھی نہیں سمجھتے۔ کسی قوم کی زندگی پائیدار بنیادوں پر صرف اس وقت قائم ہو سکتی ہے جب اس کا رشتہ شرافت اور دیانت کے ساتھ جوڑا جائے۔ یہ بات سچ ہے خواہ کمزور یا ظاہر بیں نگاہوں کو تاریخ میں اس کی شہادت نہ ملے۔ اس بات کو بار بار دہرانا، اس پر زور دینا، ناموافق فضا میں اس کا علم بلند کرنا، ذوقِ نغمہ کم ہو تو نوا کو زیادہ تلخ کر دینا ہم سب کا کام ہے۔ اگر ہم بھی پانی کے ساتھ بہنے اور ہوا کے ساتھ اڑنے لگیں تو انسان کی نجات کس طرح ممکن ہو گی؟ نمک کی کھوئی ہوئی نمکینی کیسے واپس آئے گی؟ انسانوں کے باہمی تعلقات میں جو تلخی، نفرت، تشدد اور نارواداری بڑھتی جاتی ہے، اس کی روک تھام کیسے ہو گی؟ اگر ہم سیاسی مخالفوں کو مارِ آستین کی طرح پالتے رہیں گے تو یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے؟ کبھی نہ کبھی تو عقل اور دانشمندی کی شمع ہاتھ میں لیکر ان کو امن اور آشتی کی فضائیں طے کرنا ہو گا۔ پھر کیوں نہ انھیں سلجھانے کے لئے ابھی قدم اٹھائیں، بجائے اس کے کہ، ہار جھک مار کر، ہر طرح کا جانی اور مالی نقصان

اٹھاکر ایسا کرنے کی کوشش کریں۔ اور یاد رکھئے کہ جان اور مال کے نقصان سے کہیں زیادہ خطرناک ہے شرافت، انسان دوستی اور ذہنی میل جول کا نقصان جو دونوں ملکوں کو گھن کی طرح کھا رہا ہے اور ان کی قدروں کو مسموم کر رہا ہے۔ کیا ہمیں پوری طرح اس بات کا احساس ہے کہ آج کل ہندوستان اور پاکستان میں کتابوں اور رسالوں کی آمد و رفت بھی تقریباً ممنوع ہے یعنی علم اور فکر پر بھی پہرے بٹھا دئیے گئے ہیں ؟ ہم امریکہ اور روس اور جرمنی کی کتابیں اور رسالے پڑھ سکتے ہیں، وہاں کا سفر بھی کر سکتے ہیں لیکن ہندوستانی پاکستانی علم و ادب سے اور پاکستانی ہندوستانی فکر و فلسفہ سے فیض یاب نہیں ہو سکتا !

میں جانتا ہوں کہ ان دونوں ملکوں میں کروڑوں بندگانِ خدا ایسے ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی خاص پرخاش نہیں اور لاکھوں ایسے ہیں جن کے باہمی مراسم عزیزانہ اور دوستانہ ہیں۔ لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے کہ سیاست کی موجودہ فضا میں ایسا کرنا گویا جرم ہے۔ ہندوستان میں کوئی "پاکستان زندہ باد" نہیں کہہ سکتا۔ پاکستان میں کسی کو "ہندوستان زندہ باد" کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ایسا کرنا تو اپنے ملک کے ساتھ غداری سمجھا جائے گا ! دوستو! میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا ہم میں کوئی ایسا ہے جو واقعتاً چاہتا ہے کہ ہندوستان یا پاکستان زندہ نہ رہے ؟ اگر ہمارے مفکروں اور معلموں کی قدریں صالح ہوں تو ہم اپنے بچوں کو نہ صرف فراخدلی سے "ہندوستان زندہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کہنا سکھائیں بلکہ انھیں "انسانیت زندہ باد" کہنے کی، اور دل سے کہنے کی، تعلیم دیں کہ اسی میں سب کا بھلا ہے۔ جو سب کا بھلا نہیں چاہتا وہ کسی کا بھلا نہیں چاہتا۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، مانیں یا نہ مانیں، زمانے کی نئی سائنسی اور اقتصادی قوتوں نے دنیا کو ایک بنا دیا ہے اور ایٹم بم کا کم سے کم یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کی ناقابلِ شکست وحدت کا پیغام آسمان پر آگ کے حرفوں میں لکھ دیا ہے۔ یا تو ہم سب ایک دوسرے کی مدد سے عصرِ حاضر کے تاریک طوفان سے تیر کر نکل سکتے ہیں یا سب کو ایک ساتھ ڈوبنے کی سعادت نصیب ہو گی ! اگر خواص اور عوام اس پیغام کو نہیں پڑھ سکتے یا نہیں پڑھنا چاہتے تو ہمارا اور آپ کا فرض ہے کہ اس کو

معقولیت اور دل سوزی کے ساتھ ان کے دل اور دماغ میں بٹھائیں۔ کامیابی ہمارے ہاتھ میں نہ ہو لیکن کوشش ہمارا کام ہے۔

اگر اجازت ہو تو معذرت کے ساتھ اور دوستی کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک بات اور عرض کر دوں اور یہ جرأت اس وجہ سے کرتا ہوں کہ جب میرے ملک میں بھی کوئی نامناسب یا خلاف انسانیت بات ہوتی ہے تو میں حتی الامکان اس پر تنقید کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ کسی معاملہ کا فیصلہ کبھی بد زبانی کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ابھی تک دنیا نے عام طور پر اور خاص کر ہمارے ملکوں نے اس روشن حقیقت کو تسلیم نہیں کیا۔ میں کبھی کبھی آپ کے ریڈیو کا ایک پروگرام سنتا ہوں جس کا نام ہے "ندائے حق"۔ یقین جانئے کہ مجھے اس سے بہت دکھ ہوتا ہے کہ بعض پاکستانی حضرات اس پروگرام میں ایک پوری قوم، ایک ملک، ایک تہذیب کی شان میں نہایت ناشائستہ لفظ استعمال کرتے ہیں، ایک ایسی تہذیب جس نے دنیا کے تہذیبی کیسہ میں یقیناً بڑی دولت دان کی ہے۔ شاید ہمارے ریڈیو سے بھی نامناسب باتیں کہی جاتی ہوں لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی ایسے رکیک الفاظ پاکستان کے بارے میں اپنے کانوں سے نہیں سنے۔ ہمارے ایک بلند پایہ اور بلند نظر شاعر علی سردار جعفری نے کہا ہے:

کم ظرفیٔ گفتار ہے دشنام طرازی
تہذیب تو شائستگیٔ دیدۂ تر ہے

اور ہمارے اور آپ کے مشترک شاعر اقبال نے ہمیں یہ پیغام دیا تھا:

سخن درشت مگو در طریق یاری کوش
کہ صحبت من و تو در جہاں خدا سازست

دوستو! کیا ہم اور آپ مل کر اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ باوجود مذہبی اور سیاسی اختلافات کے تہذیب کی وضع داری کو ہاتھ سے نہ دیں؟ کیا ہم اور آپ جو لفظوں کا بیوپار کرتے ہیں اور جنس وفا کی طلب گاری کا دعویٰ، کم سے کم اپنے قلم کی زبان کو نفرت اور حقارت کی آمیزش سے پاک نہیں رکھ سکتے کہ ہم

ایک مشترک انسانیت کے امین ہیں؟

میرے عقیدے میں شرافت کی قدروں کا تحفظ ایک ایسا فرض ہے جو جغرافی حد بندیوں کا پابند نہیں۔

جب انسان کی عمر کی کشتی پرے کنارے پر آلگتی ہے اور وقت حساب آنے والا ہوتا ہے تو ڈوبتے سورج کی روشنی میں ایک "لمحۂ صداقت" اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس سے کچھ جواب مانگتا ہے۔ کہتا ہے تم نے زندگی کا مطلب کیا سمجھا، اس کو کس جھنڈے کے تلے بسر کیا؟ اگر ہم بزدلی دکھائیں اور اس کی طرف سے مُنہ موڑ لیں یا بے حسی دکھائیں اور اس کو دیکھیں ہی نہیں تو سمجھ لیجئے کہ ہماری ساری زندگی رائگاں گئی۔ ہم سب کو فرداً فرداً اس سوال کا جواب دینا لازم ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ اس کا کیا جواب دیں گے، خواہ آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں یا پاکستان کے۔ لیکن میں اپنی طرف سے ایک ہی جواب دے سکتا ہوں گو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ میرے قول اور فعل نے ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک حقیقت ہے انسان کی انسان سے محبت، باقی سب فنا کا مال ہے! یہ محبت "جس میں صبر ہوتا ہے اور شفقت، جو رشک سے پاک ہوتی ہے، جو پراپگنڈا سے پرہیز کرتی ہے۔ جو جھوٹے دعوے نہیں کرتی، جو بد زبانی نہیں کرتی، خود غرضی نہیں دکھاتی، جو زچ نہیں ہوتی، جو بُرا نہیں مانتی، جو دوسروں کی غلطیوں پر خوش نہیں ہوتی، جو اُن کی اچھائیوں پر خوش ہوتی ہے، جو عیب جوئی میں تاخیر کرتی ہے، جو دوسروں کے بارے میں خوش فہمی کو سوءِ ظن پر ترجیح دیتی ہے، جو امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی، جو ہر بات میں صبر سے کام لیتی ہے ... تین ہی چیزیں پائدار ہیں، ایمان، امید اور محبت لیکن ان سب میں مقدم محبت ہے!"

یہ تو آپ نے انجیل مقدس کی زبان میں محبت کا گیت سنا، محبت اپنی سب سے پاک اور برتر شکل میں۔ چاہتا ہوں کہ یہی پیغام آپ کو اقبال کی زبانی بھی سنا دوں جیسا آپ یقیناً پہچان لیں گے۔ یہ ان کی لافانی نظم مسجد قرطبہ کا ایک بند ہے:

آنی فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اول و آخر فنا، ظاہر و باطن فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

سید غلام ربانی

فیروز شاہ تغلق کی یادگاریں

شاہ جہاں اپنے جاہ وحشم یا شہنشاہی کے لئے اتنا مشہور نہیں ہے جتنا اپنی عمارتوں کے لئے ہے۔ اتنی خوبصورت عمارتیں شاید ہی کسی تاجدار نے بنوائی ہوں۔ دنیا بھر کے لوگ انھیں دیکھنے آتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں تو دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ان کے حسن کا ایک راز یہ بھی ہے کہ سر سے پاؤں تک سنگ مرمر سے بنی ہیں۔ یہ مرمر بھی اعلیٰ قسم کا ہے جس میں موتی کی سی آب ہے۔ شاہجہاں کو سنگ مرمر اتنا پسند تھا کہ آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں جو عمارتیں اکبر اور جہانگیر نے بنوائی تھیں، ان کو بھی سنگ مرمر کا لباس پہنا دیا، یہی وجہ ہے کہ اس کا عہد "مرمریں عہد" کہلاتا ہے۔

عمارتیں بنوانے کا شوق اس سے پہلے دلی کے ایک اور بادشاہ کو بھی ہوا تھا جس کا نام فیروز شاہ تغلق تھا۔ اس نے اپنے طویل عہد میں بہت سی عمارتیں بنوائیں لیکن یہ عمارتیں خوبصورتی میں شاہجہانی عمارتوں کو نہیں پہونچتیں البتہ ایک بات میں فیروز شاہ تغلق شاہجہاں سے بڑھا ہوا تھا، وہ یہ کہ اس نے پرانی تاریخی عمارتوں کی مرمت کرائی اور ان کے تحفظ کا انتظام کیا اور کہا جا سکتا ہے کہ فیروز شاہ کا یہ عمل آرکیولوجی (علم الآثار) کی طرف پہلا قدم تھا، اس موقع پر اس کی تعمیری سرگرمیوں کا کچھ حال بیان کیا جاتا ہے۔

۱۳۵۱ء میں سلطان محمد تغلق کا انتقال ہوا اس کے کوئی بیٹا نہیں تھا، اس کا چچازاد بھائی فیروز شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بہت رحمدل اور خدا ترس تھا۔ سلطان محمد تغلق نے جن لوگوں کو قتل کرا دیا تھا، ان کے وارثوں کو تلاش کر کے فیروز شاہ نے ان کو خون بہا دیا اور راضی کر کے

ان سے معافی نامے لکھوائے، اسی طرح جن لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے تھے یا جن کو اندھا کر دیا تھا، ان کو بھی روپے دے کر ان سے معافی نامے لکھوائے، ان سب دستاویزوں کو ایک صندوق میں بھر کر محمد تغلق کی قبر کے سرہانے دفن کرا دیا تاکہ اس کی روح کو ثواب پہونچے۔

مقبرہ میں خانہ کعبہ کے پردے چڑھائے اور مقبرہ پر صندل کا چھپر کھٹ چڑھایا اس مقبرہ کا نام دارالامان رکھا، کوئی مجرم خواہ خونی ہی کیوں نہ ہو، اس میں گرفتار نہیں کیا جاتا تھا۔

فیروز شاہ نے رفاہ کے بہت کام کئے جگہ جگہ مدرسے، خانقاہیں، سرائیں، پل، تالاب، مسجدیں حمام بنوائے۔ دارالشفا میں غریبوں اور محتاجوں کا علاج ہوتا تھا اور ان کو کھانا بھی ملتا تھا۔

ملک کی خوش حالی کے لئے ستلج اور جمنا سے دو نہریں نکالیں، ان میں سے ایک (ایسٹرن جمنا کنال) کو ہم نے بھی دیکھا ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ اس نے پچاس ندیوں پر بند بندھوائے اور ڈیڑھ سو پل تعمیر کئے، اپنے تعمیری شوق کے بارہ میں وہ خود "فتوحات فیروزی" میں لکھتا ہے:

"...... خدا نے اس ناچیز بندہ کو جو نعمتیں بخشی ہیں، ان میں تعمیر کا شوق بھی عطا کیا ہے ......"

اس نے چار شہر جونپور، حصار، فتح آباد اور فیروز آباد بسائے۔ یہ چاروں شہر قلعہ بند تھے۔ حصار کو تاریخ نویسوں نے حصار فیروزہ لکھا ہے۔ فیروز آباد بہت بڑا شہر تھا جو دلی کے جنوب میں جمنا کے کنارے آباد کیا گیا تھا اور ہندوراؤ کے باڑہ تک پھیلا ہوا تھا، بھوجلا پہاڑی، بلبلی خانہ، رضیہ بیگم کی قبر، کلاں مسجد سب اس کے محلے تھے۔ شہر میں آٹھ جامع مسجدیں تھیں، ہر ایک میں دس دس ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی، اس سے شہر کی آبادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فیروز شاہ کا تعمیری شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا مگر اس کے پاس شاہجہاں کی سی دولت نہیں تھی، اس لئے کفایت سے کام لیا اور ایسی عمارتیں بنوائیں جن پر کثیر رقم خرچ نہیں ہوتی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ محمد تغلق کے آخری زمانے میں سلطنت کو زوال آگیا تھا۔ اس کی سخت گیری کی وجہ سے کئی صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے، انہی دنوں (۱۳۴۴ء) دلی میں سخت قحط پڑا، بہت لوگ

تلاشِ معاش میں اِدھر اُدھر چلے گئے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ محمد تغلق نے دلی کی جگہ دیوگری (دولت آباد) کو دارالحکومت بنایا اور دلی والوں کو مجبور کیا کہ وہ سب دولت آباد چلے جائیں، چنانچہ سب کے ساتھ نقشہ نویس، معمار، سنگ تراش، پچی کار اور تجربہ کار کاریگر سب چلے گئے بہت سے راستے میں مرکھپ گئے اور جب دلی والوں کو واپسی کے لئے کہا گیا تو بہت سے کاریگر اور معمار واپس نہیں ہوئے اور دکن کے مختلف مقامات میں تتر بتر ہو گئے۔

ایسی حالت میں فیروز شاہ کو عمارتیں بنوانے میں بڑی دقت پیش آئی مگر اس کا شوق ان سب مشکلات پر غالب آیا اور اتنی عمارتیں بنوائیں، کہ اس وقت تک کسی بادشاہ نے نہیں بنوائی تھیں اس نے تعمیر میں ایک خاص طریقہ رائج کیا جو اس کے نام سے "فیروزی طرز" یا تغلق اسٹائل کہلاتا ہے۔

اس سے پہلے عمارتوں میں سنگ سرخ اور سنگ مرمر استعمال ہوتا تھا، اس نے سنگ خارا سے کام نکالا، اس سے پہلے عمارتیں تراشیدہ پتھروں سے بنتی تھیں، اس نے عمارتوں میں اکھڑ پتھر استعمال کرائے۔ دروازے، ستون، چوکھٹ اور سردل وغیرہ ایک ڈال کے پتھر کے لگوائے۔ ان کی سطح کے کھردرے پن کو اس طرح دور کیا گیا کہ ان پر چونے کی تہہ جادی اور مہین چونے کی استرکاری کرادی گئی۔

خاندان غلاماں اور خلجی کے دور میں جو عمارتیں بنی تھیں ان پر اعلیٰ قسم کی منبت کاری ہوئی تھی اور سنگ سرخ میں سنگ مرمر کی لوحیں بڑی نفاست سے بٹھائی جاتی تھیں۔ فیروز شاہ کو اچھے سنگ تراش اور پچی کار میسر نہیں تھے۔ اس کا بدل یہ کیا گیا کہ چونے کی استرکاری میں نقش و نگار بنائے گئے۔

دیواریں سلامی دار ہوتی تھیں یعنی اجارہ سے اوپر تک پتلی ہوتی چلی گئیں۔ اس کی وجہ سے دیواروں کے کونے نوّے درجہ کا زاویہ نہیں بناتے بلکہ کرسی وضع کے پہلودار ہو گئے ہیں۔ دروازے تنگ اور اندر کو دھسے ہوئے ہیں۔ دیواروں میں مخروطی مینار پیوست ہیں جو پشتیبان کا کام بھی دیتے ہیں۔ گنبد چپٹے اور پست ہیں یہ عمارتیں حسن کے معیار سے تو گری ہوئی ہیں مگر مضبوطی اور استحکام

میں چٹان ہیں چنانچہ اس عہد کی مسجدیں اور مقبرے اچھے خاصے قلعے معلوم ہوتے ہیں۔

فیروز شاہ کا یہ طرز تعمیر بہت مقبول ہوا اور مالوہ اور دکن تک پھیل گیا چنانچہ مانڈو، برہان پور، گلبرگہ، بیدر اور گولکنڈہ میں یہی طرز کارفرما ہے۔ قطب شاہی خاندان کے بانی سلطان قلی کے مقبرہ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ محمد تغلق کا مقبرہ دلی سے اٹھا کر گولکنڈہ میں لا رکھا ہے۔ ہندوستان کے اسلامی فن تعمیر کی تاریخی کتابوں میں "تغلق اسٹائل" ایک مستقل باب بن گیا ہے۔

قلعہ بند شہروں میں سب سے زیادہ عمارتیں اس نے اپنے دارالحکومت فیروز آباد میں بنوائی تھیں جس کی فصیل سے جمنا کا پانی ٹکراتا تھا۔

تغلق خاندان کے بانی غیاث الدین نے جب تغلق آباد بسایا تو شہر پناہ کے اندر ایک چھوٹا سا قلعہ بھی بنوایا تھا جس میں شاہی محل تھے قرون وسطی میں یورپ کے بادشاہوں کے لئے اسی قسم کے قلعے بنتے تھے۔ فیروز شاہ نے بھی فصیل کے اندر قلعہ بنوایا جس کو اب "کوٹلہ" کہتے ہیں۔

اس قسم کے قلعے بیدر، گلبرگہ، گولکنڈہ میں اب تک موجود ہیں۔ ان کی اچھی مثال آگرہ، دلی اور لاہور کے قلعے ہیں۔ یہ قلعے نہیں ہیں بلکہ قلعہ نما شاہی محلات ہیں، چنانچہ دلی والے لال قلعہ کو لال حویلی ہی کہتے ہیں۔

فیروز شاہ کا کوٹلہ اب کھنڈر کی شکل میں باقی ہے مگر ان ٹوٹی پھوٹی عمارتوں سے ان کی عظمت کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ یہ کوٹلہ بلند حصار سے گھرا ہوا تھا جس میں جگہ جگہ برج تھے۔ فصیل پر کنگورے تھے دروازہ استحکام کے لحاظ سے دمدمہ معلوم ہوتا تھا اس کی حفاظت کے لئے سامنے گھونگھٹ کی دیوار تھی۔ اندر کی طرف پہرہ داروں کے حجرے یا بارکیں تھیں۔

حصار کا اندرونی رقبہ مربع اور مستطیل احاطوں میں منقسم تھا جن میں تخت محل یا دیوان خاص دیوان عام اور ایسے ایوانات تھے جن میں ارکان سلطنت سے ملکی معاملات یا دوسرے امور پہ مشورہ ہوتا تھا۔ ان احاطوں سے جو بہت بڑا رقبہ بچ گیا اس میں مختلف عمارتیں تھیں۔ جگہ جگہ چمن، انگوری باغ، حوض، تالاب، پولیں، بارہ دری، حمام، بارکیں، اسلحہ خانہ، دینار خانہ

اور شاگرد پیشہ لوگوں کے مکانات تھے وسط میں بہت بڑی جامع مسجد تھی جو اب بھی اچھی حالت میں ہے[1]۔ اس کے علاوہ اور کئی چھوٹی چھوٹی مسجدیں تھیں جن میں ایک بادشاہ کے لئے مخصوص تھی، ا[illegible] کی مسجدیں دو سو برس بعد مغلوں نے بھی بنوائی تھیں۔ آگرہ کی موتی مسجد اور دلی میں لال قلعہ کی موتی شاہی مسجدیں ہیں۔ یہ عبادت گاہیں رومن اور بازنطینی فرمانرواؤں کے "Chapel Royal" کا [illegible] دیتی ہیں۔

کوٹلہ فیروز شاہ میں ایک یادگار عجیب ہے یہ عمارت بیچ میں ایک نمایاں مقام پر بنائی گئی ہے ایک بہت بڑا مربع چبوترہ ہے جس کے چاروں طرف کمانوں کا سلسلہ ہے، اس کے اوپر ذرا چھوٹا چبوترہ اسی وضع کا کمانوں دار بنایا گیا ہے۔ اسی طرح چبوترہ پر چبوترہ بنتا چلا گیا ہے اور بالکل اہرام کی شکل بن گیا ہے۔ اس کی چوٹی پر اس تغلق حکمران نے اشوک کا ایک مینار نصب کیا ہے جو انبالہ کے قریب سے لایا گیا تھا یہ ایک طلال کی کرنڈ کی لاٹھ ہے[2]۔

لاٹھ پر ایک خوبصورت برجی بنائی گئی جس پر سونے کے پترے چڑھائے گئے اور اس کا "مینارۂ زریں" رکھا گیا۔ اس کی تکمیل کی خوشی میں بڑی دھوم سے جشن منایا گیا۔ یہ تعمیر ایک رسم کی تجدید تھی۔ قطب الدین ایبک نے مسجد قوت الاسلام کے صحن میں کمار گپتا کی لوہے کی لاٹھ نصب کی تھی، لاٹھ متھرا سے لائی گئی تھی جہاں وہ چھ سو برس سے قائم تھی۔ بالکل اسی طرح فیروز شاہ نے شاہی محلات کے بیچ میں بدھ مت کی یہ لاٹھ نصب کی جو سولہ سو برس پرانی تھی۔

دلی اور اس کے نواح میں چند مسجدیں ایسی بنوائی تھیں جو تغلق طرز کو اچھی طرح پیش کرتی ہیں

---

[1] ۱۳۹۸ء میں جب امیر تیمور نے دلی میں قتل عام کیا تو اسی مسجد میں پیشوایان دین نے امان مانگی تھی تیمور نے امان دے دی۔

[2] اس لاٹھ کو لانے اور نصب کرنے کا دلچسپ حال شمس سراج نے تاریخ فیروز شاہی میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس [illegible] کے [illegible] معلوم [illegible] جرنل [illegible] بابت نمبر [illegible] ۱۹۳۰ء کے شمارہ میں چھپ چکا ہے۔

ان میں کالی مسجد (۱۳۷۰ء) جہاں پناہ[1] میں، بیگم پوری مسجد (۱۳۷۰ء) تیمور پور میں درگاہ شاہ عالم کی مسجد (۱۳۷۵ء) جہاں پناہ میں کھڑکی مسجد (۱۳۷۵ء) شاہجہاں آباد میں کلاں مسجد۔ ان میں سے آخری دو مسجدیں دیکھنے والے کو متاثر کرتی ہیں۔ یہ دونوں تہ خانوں پر اٹھائی گئی ہیں یہ تہ خانے محرابوں پر قائم ہیں۔ بلند کرسی کی وجہ سے ان میں کچھ شان پیدا ہو گئی ہے۔ ان کا نقشہ صلیب نما ہے۔ چاروں کونوں پر برج بنے ہوئے ہیں داخلہ دروازہ کے پاکھوں میں مخروطی مینار پیوست ہیں۔ ان میں داخل ہوں تو کمانوں اور ستونوں کا ایک جنگل نظر آتا ہے۔ یہ فیل پائے چھوٹے اور موٹے ہیں جن کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے ان کی چھتیں چھوٹے چھوٹے پیالہ نما گنبدوں سے بنائی گئی ہیں۔ ایک کھڑکی کی مسجد کی چھت پر اکیاسی ۸۱ گنبد ہیں جن سے یہ چھت کچھوے کی پیٹھ معلوم ہوتی ہے۔

اس عہد کے مقبروں میں خود فیروز شاہ تغلق کا مقبرہ سب سے نمایاں ہے یہ مقبرہ مہرولی میں حوض خاص کے پاس پر فضا جگہ موجود ہے۔ اس عہد کے لحاظ سے عمارت میں موزونی زیادہ ہے، دیواریں وہی سلامی دار گنبد پست اور چپٹا ہے جو ہشت پہل پایہ پر قائم ہے۔ مقبرہ کا حجرہ مربع ہے جس کے چاروں کونوں میں پکھوائی ڈاٹیں Squinches بنی ہوئی ہیں۔

فیروز شاہ نے عمارتیں تو بہت سی بنوائیں لیکن ایک کام ایسا کیا جو ہندوستان کے کسی بادشاہ نے نہیں کیا وہ یہ کہ اس نے پرانی تاریخی عمارتوں کی مرمت کرائی، وہ خود اپنے قلم سے لکھتا ہے:

"...... میں نے قطب مینار کی مرمت کرائی اور ساتھ
ہی بلندی میں اضافہ کیا ساتواں درجہ میں نے بنوایا
ہے اور یہ لاٹھ مینارہ ہفت منظری کے نام سے

---

[1] سلطان محمد تغلق نے "شہر جہاں پناہ" آباد کیا تھا اس کا ارادہ تھا کہ اس وقت کے چاروں شہروں (مختلف دہلیوں) کو ملا کر ایک فصیل ان کے گرد بنا دے مگر یہ کام ادھورا رہ گیا (۱۳۲۷-۱۳۵۱ء)

مزین ہوئی[1]...."

سلطان علاء الدین کا مقبرہ قطب الدین مبارک کے عہد میں بنا، یہ مسجد قوت الاسلام کی پشت پر تعمیر ہوا تھا۔ اس وقت یہ مقبرہ ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر ہے۔ فیروز شاہ لکھتا ہے:

"....میں نے اس کی مرمت کرائی اور قبر پر صندل
کا چھپر کھٹ چڑھایا....."

موضع ملک پور میں معز الدین بہرام کا مقبرہ تھا اب اس کے صرف آٹھ ستون باقی رہ گئے ہیں اس کی مرمت بھی فیروز شاہ نے کرائی۔

اسی موضع میں رکن الدین فیروز کا مقبرہ ہے یہ بادشاہ سلطانہ رضیہ سے لڑکر پکڑا گیا اور قید میں مرا۔ فیروز شاہ نے از سر نو اس کی مرمت کرائی۔ آگے چل کر لکھا ہے:

"......شمس الدین التمش کے مقبرہ کی عمارت باہر سے سنگ
خارا کی اور اندر سے سنگ سرخ کی ہے کہیں کہیں سنگ مرمر بھی
ہے اس مقبرہ پر ستون دار گنبد بھی تھا جو گر پڑا ہے میں نے اس
مقبرہ کی مرمت کرائی اور قبر پر صندل کا چھپر کھٹ چڑھایا...."

"....حوض علائی یا حوض خاص درحقیقت علاء الدین خلجی کا
بنوایا ہوا ہے۔ یہ حوض مٹی سے بھر گیا تھا میں نے ۷۵۴ھ میں
اس حوض کی صفائی کرائی اور یہاں ایک مدرسہ بنوایا[2]...."

"....درگاہ حضرت نظام الدین میں جو جماعت خانہ ہے اس
کو نئے سرے سے میں نے بنوایا ہے......"

---

[1] فتوحات فیروزی

[2] یہ مدرسہ اب بھی باقی ہے، اس سے ملا ہوا خود فیروز شاہ تغلق کا مقبرہ ہے۔

[illegible]

کھدائیوں پر سعد پیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے اور پرانے زمانہ کی ایک ایک اینٹ کو یہ سینت کر رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کے گورنر جنرل ولیم بنٹنگ نے تجویز کی تھی کہ سنگ مرمر نیلام کر دیا جائے لیکن جب حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ عمارت توڑنے میں اس قدر اخراجات ہوں گے کہ سنگ مرمر کی فروخت سے اس کی پا بجائی نہ ہو اس پر وہ لاچار ہو گیا پتھر بھاری تھا چوم کر چھوڑ دیا۔

اسی طرح کا ایک بُرا وقت دلی کی جامع مسجد پر بھی پڑا تھا یہ ۱۸۵۷ء کے کچھ دنوں بات ہے مگر شاید شاہجہاں کی نیک نیتی کام آئی اور اس کی یہ دونوں پاکیزہ عمارتیں فیروز شاہ تغلق کا چھ سو برس پہلے آثار قدیمہ کی مرمت کرانا اگر تعجب نہیں تو لائق ضرور ہے۔

سید جعفر رضا بلگرامی

ہماری خود غرضیاں

ہر انسان اچھی فطرت کا حامل ہوتا ہے اور اُس میں قدرتاً دو طرح کے جذبے کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک جذبہ تو اپنی خواہشات کی تسکین کا ہوتا ہے اور دوسرا غیروں کی امداد کا۔ یہ دونوں ہی جذبے اپنی جگہ اچھے ہیں کیونکہ اگر ایک سے انسان کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے تو دوسرے سے سماج کی تشکیل لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ دونوں جذبے متضاد ہیں جس کی وجہ سے انسان ہمیشہ اس کشمکش میں مبتلا رہتا ہے کہ اپنی خواہشات کی تسکین کرے یا دوسرے کی امداد۔ اِسی کشمکش سے ضمیر پیدا ہوتا ہے جو ان دونوں جذبوں کے درمیان توازن قائم رکھتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ضمیر خود غیر جانبدار رہے۔ اِس کی غیر جانبداری مستحکم رکھنے کے لئے کچھ اُصول مرتب کر لیے گئے ہیں جن کو بہ حیثیت مجموعی ہم "مذہب" کہتے ہیں۔ چونکہ دوسروں کی امداد کے مقابلہ میں اپنی خواہشات کی تسکین زیادہ آسان و مفید ہوتی ہے اس لئے انسان زیادہ تر اسی جذبہ کی طرف مائل رہتا ہے۔ کچھ دن بعد پھر ضمیر بھی غیر جانبدار نہیں رہ پاتا اور اس کے فیصلے خود غرضانہ ہونے لگتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں جذبے اپنی متعین حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اپنی خواہشات کی تسکین کا جذبہ جب ایک حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو "خود غرضی" بن جاتا ہے۔ اسی طرح جب دوسروں کی امداد کا جذبہ ایک حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو "قربانی" بن جاتا ہے۔ بڑھتی ہوئی "خود غرضی" دوسروں کے استحصال پہ پہنچ لگتی ہے اور بڑھتی ہوئی "قربانی" کسی انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے خود غرضانہ استحصال کا ضامن کوئی انقلاب ہی بڑھ کر جنگ سکتا ہے۔ امریکہ، فرانس اور روس کے انقلابات کسی حد

کسی نوعیت کے خود غرضانہ استحصال کے سدِباب کے لئے ہی تھے۔

اچھی مملکتیں اچھے افراد سے بنتی ہیں۔ اچھے افراد وہ ہیں جو اپنی خواہشات اور دوسرے کی ا
کے فطری جذبوں میں توازن برقرار رکھ سکیں۔ آج کے انتشار کی اصل وجہ یہی ہے کہ افراد یہ تواز
کھو بیٹھے ہیں۔ ہماری خود غرضیوں اور مفاد پرستیوں نے مملکتوں کی ذہنی وحدت کو ختم کر دیا ہے ج
کے نتیجہ میں قومی مملکتوں کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اگر کوئی انسانی گروہ عر
دراز سے ایک ہی جغرافیائی رقبہ میں رہ رہا ہو جس کی وجہ سے اُس میں تہذیبی، سماجی، مذ
اور لسانی ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہو تو ایسے متحدہ اور یکجا گروہ میں وہ "ذہنی وحدت" پیدا ہو جاتی
ہے جو کسی قوم کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم تہذیب، ہم مذہب اور ہم زبا
ہو جانے سے کوئی گروہ قوم بن جائے۔ اگر قوموں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا
اِن ظاہری اسباب کی عدم موجودگی میں بھی قومیں بن جاتی ہیں اور اِن عوامل کے موجود ہوتے ہوئے
بھی قومیں نہیں بن پاتیں۔

ایک ملک میں مختلف مذاہب، تہذیبیں اور زبانیں پرورش پاتی ہیں۔ لیکن اگر ان افراد میں
اپنی خواہشات اور دوسروں کی امداد کے جذبوں میں ایک منصفانہ توازن قائم رکھنے کی صلاحیت
تو مذہب، تہذیب اور زبان کے فرق کے باوجود وہ گروہ قوم بن جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر
افراد میں یہ توازن قائم نہیں ہے تو ہم مذہب، ہم تہذیب اور ہم زبان ہوتے ہوئے بھی وہ گروہ قو
نہ بن سکے گا کیونکہ اس توازن کی عدم موجودگی میں پھر اس کا بھی تو امکان ہے کہ کوئی قوم ہم زبان ہوتے
ہوئے بھی فرقوں میں تقسیم ہو جائے یا ہم تہذیب ہوتے ہوئے بھی الگ الگ وضع قطع اختیار کر لے
اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس توازن کی عدم موجودگی میں وہ عوامل جو کسی قوم کی "ذہنی وحدت" ک
امانت سمجھے جاتے ہیں ہماری خود غرضیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوم محض اِن عوامل کی موجودگی کا نام نہیں ہے۔ دراصل دیکھنا یہ
ہے کہ اِن عوامل سے وہ جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو سکی ہے یا نہیں جس سے قومیں بنتی ہیں۔ اس کے

علاوہ یہ بھی پرکھنا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی یہ جذباتی ہم آہنگی الگ الگ عوامل سے پیدا شدہ جذباتی ہم آہنگی سے بلند و برتر ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ لسانی ہم آہنگی کی طرح رسم الخط کے جھگڑے میں ختم ہو جائے، یا تہذیبی ہم آہنگی کی طرح وضع قطع کے درمیان تقسیم ہو جائے، یا مذہبی ہم آہنگی کی طرح فرقوں میں بٹ کر رہ جائے۔ یہ "جزوی جذباتی ہم آہنگی" کسی انسانی گروہ کو متحد ضرور کر سکتی ہے لیکن وقتی ہوتی ہے اس لیے کسی مستقل قوم کی تشکیل نہیں کر سکتی، اس کے لیے تو ایسی جذباتی ہم آہنگی چاہیئے جو نا قابلِ تفریق ہو اور نا قابلِ تقسیم بھی، جو انسانی گروہ کو ذہنی وحدت بخش کر ایک پائدار رشتہ سے منسلک کر دے اور یہ "ذہنی وحدت" انسان کے انھیں دو فطری جذبوں میں توازن قائم رکھنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ قومی تشکیل کے ظاہری اسباب کے باوجود جب کبھی انسانی گروہ کے افراد دوسروں کی امداد کا فطری جذبہ یکسر بھول کر صرف اپنی خواہشات کی تسکین میں لگ جاتے ہیں اور اس طرح خود غرضی اور مفاد پرستی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں تو قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، کیونکہ اب وہ افراد کا محض ایک گروہ ہیں جس کا ہر فرد اپنی خواہشات کو دوسروں کی خواہشات سے بے غرض ہو کر اور کبھی کبھی ان کو نقصان تک پہونچا کر پورا کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ ایسے نفسی نفسی کے عالم میں وہ "ذہنی وحدت" کب قائم رہ سکتی ہے جس سے قومیں بنا کرتی ہیں۔ آج قومی مملکتوں میں جو انتشار برپا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے جزوِ لازم نہیں بن سکے ہیں۔ امداد و قربانی ہمارا مسلک نہیں رہا ہے اور ہم انسان کے دو فطری جذبوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے کام کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

ہماری خود غرضیاں قومی مملکتوں تک ہی محدود نہیں رہی ہیں۔ انھوں نے ہماری سماجی، معاشی، صنعتی اور بین الاقوامی کوششوں کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ اس کی اگر اصل وجہ معلوم کی جائے تو پتہ چلے گا کہ بعض حالات نے بھی اس جذبہ کو کافی تقویت بہم پہونچائی ہے۔ کوئی دو صدی قبل صنعتی انقلاب نے یورپ اور امریکہ کے ہر فرد کو اچانک دولتمند بنا دیا۔ مشین نے بے حساب دولت پیدا کی۔ اس کی چاٹ ایسی پڑی کہ یہ بجائے خود ایک خدا بن گئی۔ ہماری شرافت، اخلاق، مروّت

اپنا انصاف کے پیمانے بدل گئے۔ خود غرضی اور ہر چیز کو انگیز کر لینے کا رجحان ایسا بڑھا کہ فرد، سماج، قوم اور ملک کوئی اس کے اثر سے نہ بچ سکا۔ اور اب حالت یہ ہے کہ ہم آج جانور کی چربی کے بجائے بناسپتی تیل سے بنے ہوئے صابن سے ہاتھ دھونا پسند کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری یہ ترجیح افریقہ میں لاکھوں مزدوروں کے استحصال کا سبب بن جاتی ہے جو ایسی پیداوار کے لئے مجبور کئے جاتے ہیں۔ مزدوروں کی طاقت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا جاتا ہے تاکہ چیز سستی خریدنے کی ہوس کو پورا کیا جا سکے۔ ربڑ کی پیداوار کے لئے جس پر آج کے رسل ورسائل کا بہت زیادہ انحصار ہے ہم افریقہ میں ہر طرح کے تشدد کو روا رکھتے ہیں۔ تیل جو آج صنعتی معاشی زندگی کا جزو لازم ہے کمپنی اور ملک کے درمیان برابر تنازعہ کا باعث بنا رہتا ہے اور اس کے معیار زندگی کی پستی و بلندی کا انحصار اس تنازعہ میں ہار جیت پر ہے۔ شکر کے لئے کیوبا اور پورٹوریکو کی آزادی خریدی و بیچی جاتی ہے۔ آج انگلینڈ اپنے ملک کے مزدوروں کو اچھی اجرت دینے سے قاصر نظر آتا ہے کیونکہ اب اس کا تسلط ہندوستان، افریقہ اور مشرق وسطیٰ پر باقی نہیں، اور آج فرانس نوآبادیات میں اپنا اقتدار باقی نہ رکھ سکنے کا ماتم کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی نے روس کو صرف اس لئے اپنا نشانہ بنایا تھا کہ دوسروں نے نوآبادیات میں خود اس کے لئے موقع نہیں چھوڑا تھا۔ امریکہ اپنے ڈالر کے ڈھیر پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں دوسرے ہاتھ مار جائیں اور اس ڈھیر کی بلندی کچھ کم ہو جائے۔ یہاں تک کہ روس کے افراد جن کو ان کا نظام سماج میں ضم ہو جانے کی تعلیم دیتا ہے وہ بھی بقول ہرمن فائنر "اس حد تک بے غرض نہ بن سکے کہ گاندھی جی کا طرز زندگی اختیار کر کے ایک چادر کی ستر پوشی پر اکتفا کر لیتے"۔ ہماری یہی خود غرضیاں آج کے بین الاقوامی انتشار کا اصل سبب ہیں۔

صرف یہی نہیں ہوا بلکہ ہمارے مفکروں، مدبروں اور سیاستدانوں نے انسان کے ان فطری جذبوں کو متضاد مان کر اور ان میں ہم آہنگی کو غیر ضروری سمجھ کر الگ الگ ذہنیتیں کی بنائی ہیں۔ آج کچھ مملکتیں ایسی ہیں جن میں فرد کی خواہشات کی تسکین کو اولیت حاصل ہے۔

فرد کا احترام، فرد کی آزادی اور فرد کے حقوق پر زور دیا جاتا ہے اور بہ حیثیت مجموعی یہ انفرادی مملکتیں کہلاتی ہیں جن کی بنیاد فرد کی "اپنی خواہشات کی تسکین" کے جذبہ پر ہے۔ کچھ مملکتیں ایسی ہیں جہاں کہ دوسرے کی امداد کے جذبہ کو مہمیز کیا جاتا ہے، فرد کو خود سپردگی کا جذبہ سکھایا جاتا ہے، اپنی شخصیت کو سماج میں ضم کر دینے کی تعلیم دی جاتی ہے، سماج کی فلاح و بہبود اور دولت کی مساوی تقسیم ایسی مملکتوں کا بنیادی نصب العین ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ اجتماعی مملکتیں کہلاتی ہیں جن کی بنیاد "غیروں کی امداد" کے جذبہ پر ہے۔ چونکہ یہ مان لیا گیا ہے کہ اپنی خواہشات اور غیروں کی امداد کے جذبے متضاد ہونے کی وجہ سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے اس لیے ان بنیادوں پر جو مملکتیں تشکیل ہوئی ہیں ان میں بھی ہم آہنگی مفقود ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی مملکتیں اپنی خود غرضانہ انتہا پر پہونچ کر "سرمایہ دارانہ جمہوریتیں" بن گئیں جس کے ردعمل میں اجتماعی مملکتوں نے اپنی انتہا پسندی میں "اشتراکیت" کا چولا پہن لیا اور افراد کو سماجی فلاح و بہبود کے نام پر قربان کرنے لگیں۔

اب یہ دونوں نوعیتوں کی مملکتیں ایک مستقل نظام حیات ہیں اور ایک دوسرے نبرد آزما بھی ہیں۔ ہماری آج کی بدنصیبی یہ ہے کہ ہم نے اس اختلاف میں مملکتوں کی نوعیتیں تقسیم کر لیں، دنیا تقسیم کر لی، ذہن تقسیم کر لیے، سوچنے سمجھنے کا انداز تقسیم کر لیا، حق گوئی و انصاف پسندی تقسیم کر لی۔ یہ ایک بڑے پیمانہ پر ہماری خود غرضی ہی تو ہے۔ ہم یا تو ایک یا دوسرے نظام حیات کے اندھے مقلد بن گئے ہیں۔ ہماری ذہنیتیں اس حد تک مفلوج ہو چکی ہیں کہ ہم یہ سوچنے سے بھی نفور آتے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی مملکتوں کے دونوں مکتب خیال کے محرک دراصل وہی جذبے ہیں جو ہر انسان میں فطرتاً پائے جاتے ہیں۔ کسی ایک نظام فکر کی تقلید کا مطلب دوسرے جذبے کے وجود سے یکسر انکار ہے جو یقیناً غیر فطری ہے۔ لیکن آج جو علمی کارنامے یا سیاسی کارروائیاں ہو رہی ہیں وہ کلیتاً ایک یا دوسرے نظام فکر کی حامی نظر آتی ہیں۔ کچھ ایسے فلسفی ضرور گزرے ہیں جنھوں نے انسان کے ان دو فطری جذبوں کو تسلیم کرتے ہوئے فرد اور سوسائٹی میں توازن قائم کرنے کی اپنی جیسی کوشش کی ہے، ان میں لاسکی کا نام سرفہرست ہے۔ کچھ سیاسی مدبر بھی گزرے ہیں جنھوں نے انسان کے ان دونوں جذبوں کا احترام کرتے ہوئے

فرد اور سوسائٹی کے تقاضوں میں توازن قائم کرنے کی عملی کاوش کی ہے۔ اِن میں پنڈت نہرو صف اول کے لوگوں میں ہیں۔ لیکن ہماری تقسیم شدہ ذہنیت نے ٹالسٹی کو فلسفی ماننے سے انکار کر دیا اور نہرو کو ناقابل اعتبار گردانا کیونکہ یہ دونوں ایک یا دوسرے نظام فکر کے کلیتاً ہم نوا ہونے کے بجائے ایک ایسے مخلوط نظامِ حیات کے لئے کوشاں تھے جس میں فرد کے اِنھیں دو فطری جذبوں کا توازن جھلکتا ہو۔

آج مملکتوں کے اندرونی خلفشار اور بین الاقوامی انتشار کی اصل وجہ یہی ہے کہ فرد میں تناسب و توازن باقی نہیں رہا ہے۔ ہماری خود غرضیوں نے داخلی حیثیت سے ملکوں کی قومیت کا شیرازہ بکھیر رکھا ہے۔ اور خارجی حیثیت سے یہ مملکتوں کے درمیان تنازعہ کا باعث بنی ہوئی ہیں جس سے امن عالم کو خطرہ ہے۔ اگر ہم انسان کے ان دو بنیادی جذبوں کو متضاد مانتے ہوئے ان میں ہم آہنگی کو ضروری سمجھ لیں تو ایک طرف ہم قومی یکجہتی اور دوسری طرف مملکتوں میں خوشگوار تعلقات پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک ہم فرد میں یہ توازن قائم کر کے ہم آہنگی کی فضا پیدا نہ کر سکیں گے اس وقت تک نہ تو مملکتوں کو ذہنی وحدت" نصیب ہو سکے گی اور نہ امن و سلامتی دنیا کا مقدر بن سکے گی۔

مرزا احسان احمد بیگ

"نوائے عصر"

میرے عزیز ہم وطن یحییٰ اعظمی کا یہ مجموعۂ کلام ہے، جس کا ایک نسخہ عزیز موصوف نے اس خواہش کے ساتھ مجھ کو عنایت کیا ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ اظہار خیال کروں، شاہ معین الدین صاحب ناظم دارالمصنفین نے تعارف کے عنوان سے یحییٰ صاحب کی شاعرانہ صلاحیت کے متعلق جو کچھ سپرد قلم فرمایا ہے، اس کے بعد کسی مزید تبصرے کی چنداں ضرورت نہ تھی، پہلے جی میں آیا کہ خرابی صحت کی بنا پر جس نے مجھ کو مضمون نگاری کے حق میں کچھ کوتاہ قلم بنادیا ہے، معذرت کردوں، لیکن مطالعۂ کلام کے بعد مجھ کو شاعر کی کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نظر آئیں کہ مجبوراً قلم اٹھانا پڑا، جس کو میں نے ذاتی تعلق سے متاثر ہونے نہیں دیا ہے، تبصرہ نگاری کے فرض سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے، کہ صاحب کلام کی شخصیت کو نظرانداز کر کے صرف کلام پر نظر رکھی جائے، اور اسی سے اس کی فکرو نظر کی وسعت اور بلندی کا اندازہ کیا جائے۔

شاعر کی فطری مناسبت سے شاعر کو ایک گہرا تعلق ہے، میرے نزدیک ایک پست فطرت اور بداخلاق شخص کبھی بلند خیال شاعر نہیں ہو سکتا، سب سے پہلے میری نگاہ اپنے عزیز شاعر کی اس قابل احترام افتادِ طبیعت پر ہے، جس نے ان کے دل کو شہرتِ عام کی خواہشِ بے جا سے آلودہ ہونے نہیں دیا، یعنی انھوں نے مشاعروں میں عوام کے سامنے اپنے کو بحیثیت شاعر کبھی پیش نہیں کیا، ان کی بلند نظری اور صحیح المذاقی کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے، میرے خیال میں شاعر کو جب عوام کی واہ واہ سے مسرت محسوس ہونے لگتی ہے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی شاعرانہ صلاحیت کی بربادی کا اب وقت آگیا، اس لئے

کہ خود اس کا کوئی مستقل ذوق نہیں، اور اب اس کی طبع آزمائی دوسروں کے مذاق کے مطابق ہوگی، حقیقت یہ ہے، کہ مجموعۂ کلام زیر نظر کے مصنف کی طرح جو واقعی شاعر ہوتا ہے، وہ اپنا ایک خاص ذوق رکھتا ہے، اور اسی ذوق کے مطابق وہ شعر کہتا ہے، ذوق عام کی اسے مطلق پروا نہیں ہوتی، اس لئے اس کا کلام سطحی، مبتذل اور عامیانہ خیالات سے آلودہ ہونے نہیں پاتا۔

میرے نزدیک یحییٰ صاحب کی صحیح المذاقی کا ایک دوسرا بڑا ثبوت یہ ہے، کہ قدرت نے ان کو جو شاعرانہ استعداد و صلاحیت عطا کی تھی، اس کو انھوں نے عام غزل گو شعرا کی طرح فرضی اور مصنوعی تخیلات پر ضائع نہیں کیا، بلکہ اس سے خود اپنے قلب و روح کے گوناگوں تاثرات کے اظہار کا کام لیتے رہے، "ادب برائے ادب" ان کا کبھی نظریہ نہیں رہا، یہی ان کے جذبات اور افکار و خیالات کی بلندی اور پاکیزگی کا اصلی راز ہے، وقت کی بے کیف اور عامیانہ شاعری سے گھبرا کر ڈاکٹر اقبالؔ بے اختیار یہ سوال کر بیٹھے تھے، "شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے" مذاق عام اس کا کیا جواب دیتا، البتہ زندہ ہوتے تو "نوائے عصر" سے ایک بڑی حد تک جواب مل سکتا تھا!

حالیؔ نے مقدمۂ شعر و شاعری میں واقعیت و اصلیت کو بھی شاعری کا ایک ضروری عنصر قرار دیا ہے، جس کے بغیر کلام موثر نہیں ہو سکتا، چنانچہ ہمارے عزیز شاعر کی نکتہ سنج اور حقیقت پسند طبیعت نے اس کا خاص لحاظ رکھا ہے، یعنی بجائے خیالی دنیا میں رہ نوردی کے انھوں نے اسی عالم آب و خاک سے اپنا تعلق رکھا، اور اسی کے ہر موثر واقعہ اور منظر سے متاثر ہوتے رہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں، اسی وقت کہتے ہیں، جب ان کے دل پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی ہے، ہمارے نزدیک شاعر کا یہی حقیقی نشان امتیاز ہے، منافقانہ فکر سخن کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔

شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں، اس لئے وہی شخص شاعر ہو سکتا ہے، جس کا احساس قوی اور مشتعل ہو، ہمارے عزیز شاعر کی اس خصوصیت کا ناظرین اندازہ کرنا چاہیں تو ان کی وہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں، جو انھوں نے ملک و قوم کی مایۂ ناز ہستیوں مثلاً مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا سید سلیمان، مولانا عبد السلام ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، اقبال سہیل وغیرہ

کی وفات پر سپردِ قلم کی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا جذبات کا ایک آتش کدہ مشتعل ہو گیا ہے۔

حبِّ وطن کا شریفانہ جذبہ ہمارے عزیز شاعر کے دردِ آشنا دل پر جس شدت سے طاری ہے، اس کا اندازہ ان کی ان نظموں سے بخوبی ہو سکتا ہے جو انھوں نے "مستقبل کا ہندوستان"، "لعل و جواہر کے وطن"، "پندرہ اگست کا تاریخی دن" کے عنوان سے سپردِ قلم کی ہیں، ۱۹۵۷ء میں ۱۸۵۷ء کے شہیدانِ وطن کو انھوں نے جو "پیغامِ بیداری" دیا ہے، وہ ان کے سیاسی احساس و ذہنیت کی پاکیزگی اور بلندی کا کافی ثبوت ہے، آزادی سب سے بڑی نعمت ہے، جس دل میں اس کی قدر و احترام کا احساس نہ ہو وہ میرے نزدیک کسی بلند نظر اور صاحب ہمت انسان کا دل نہیں ہے۔

منظر نگاری بھی شاعر کا ایک خاص کمال ہے، اس کے لئے غیر معمولی قوتِ نظم کے علاوہ ایک نکتہ سنج نگاہ بھی درکار ہے تاکہ منظر نگاری کا کوئی خاص پہلو نظر انداز نہ ہونے پائے اور اس کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے، ہمارے عزیز شاعر نے جنت کشمیر، جنت رنگ و بو، تاج محل پر نظمیں لکھ کر اپنی اس صلاحیت کا کافی ثبوت دیا ہے، متفرق خیالات کی ایک غزل تیار کر لینا آسان ہے، لیکن کسی خاص موضوع پر مسلسل نظم لکھنا ایک قادر الکلام شاعر ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

ابھی عزیز شاعر کی ایک اور خصوصیت بھی اربابِ نظر کی توجہ کی مستحق ہے، وہ حسنِ بیان ہے، جو شاعری کی نہایت ضروری شرط ہے، اور جس کے بغیر بلند سے بلند خیال بھی بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے، اقبال سہیل کے فیضِ صحبت نے ان میں فارسیت کا جو ذوق پیدا کر دیا تھا، اس سے اگرچہ وہ خاص طور پر کام لیتے ہیں، لیکن اس موقع پر بھی ذوقِ سلیم ان کو بے راہ رو ہونے نہیں دیتا، یعنی وہ ثقیل، نامانوس اور بے جوڑ ترکیبوں سے کلام کو گرانبار نہیں کرتے، الفاظ کی موزونی، فقروں کی دروبست، بندش کی چستی، روانی، برجستگی کے لحاظ سے ان کے کلام میں کوئی نقص یا ناہمواری نظر نہیں آتی، پڑھتے وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک صاف قدرتی چشمہ ہے، جو پہاڑ کے دامن سے نکل کر بلا کسی اٹکاؤ کے بہتا چلا جاتا ہے، ہمارے شاعر کی نظر اس پر بھی ہے کہ موسیقیت بھی شاعری کا ایک ضروری جزو ہے، یعنی مصرعوں کا باہمی ربط، ترتیب و ترکیب ایسی ہو، کہ شعر میں ایک گونہ خوش نوائی پیدا ہو جائے

اور سامعہ بھی اس سے لطف اندوز ہو سکے ، غرض اس مجموعۂ کلام کی ہر نظم میں خواہ وہ کسی موضوع پر ہو ، شاعر کی قدرت زبان کا جو دلکش سماں نظر آتا ہے وہ عام شعرا کے لئے یقیناً قابلِ رشک ہے۔

یہ مجموعۂ کلام اپنے گوناگوں محاسن کے لحاظ سے دراصل ایک مبسوط تبصرہ کا مستحق تھا ، جس کی افسوس ہے ، اس مختصر مضمون میں گنجائش نہ تھی ، تاہم سطورِ بالا کی نگارش سے ناظرین کو کم ازکم اس کا اندازہ ضرور ہوگا کہ قدرت نے ہمارے عزیز شاعر کو دل و دماغ کی جو صلاحیت عطا کی ہے ، وہ حقیقی شاعری کے لئے کس قدر موزوں اور مناسب ہے ، اور وہ کس خوبی سے اپنے ہر قسم کے لطیف ، بلند اور پاکیزہ قومی سیاسی مذہبی جذبات و احساسات کو ادا کر سکتے ہیں۔

اقبال سہیل کی زندگی میں اکثر یہ خیال آتا تھا کہ شاید یہ اپنے استاذِ محترم علامہ شبلی کے اندازِ سخن کا دور اپنے ہی اوپر ختم کر کے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے ، لیکن ہم کو مسرت ہے ، کہ وہ "نوائے عصر" ، "نوائے حیات" کے مصنف کو اپنا حقیقی جانشین چھوڑ گئے ہیں ، جو نہایت کامیابی کے ساتھ ان کے فیضِ تلمذ کا حق ادا کر رہا ہے ، تمنا ہے کہ اس "غریب شہر" کی "سخن ہائے گفتنی" کا سلسلہ تادیر قائم رہے ، کہ اردو کے چمنستان ادب کو اپنی سرسبزی اور شادابی کے لئے ایسے ہی ابرِ قلم کی گہر فشانیاں درکار ہیں۔

ارادہ تھا ، کہ اس مختصر مضمون کو یہیں ختم کر دوں ، لیکن یہ خیال آیا کہ میں نے شاعر کی امتیازی خصوصیات کا جو اجمالی خاکہ اہلِ ذوق کے سامنے پیش کیا ہے ، اس کی تائید میں کلام کا کچھ نمونہ بھی پیش کرنا ضروری ہے ، تاکہ دعویٰ بلا ثبوت نہ رہے ، اور مجھ پر بے بنیاد مدح سرائی کا الزام نہ آنے پائے۔

مسلسل نظموں کا پورا لطف اسی وقت آسکتا ہے ، جب شروع سے آخر تک پڑھی جائیں ، مگر طوالت کے لحاظ سے پوری پوری کوئی نظم نقل کرنا دشوار ہے ، "جنت کشمیر" ، "جنت رنگ و بو" کے چند بند بطور نمونہ کے ملاحظہ ہوں :

اے شہرِ گل و لالہ اے وادیِ گل پوش — اے خاکِ ارم در بر و فردوس در آغوش
ہے تیری ہواہیں اثر بادۂ سرجوش — ہے تری فضا گل کدۂ مے کدۂ مدہوش

زیبا ہے جو کرتے ہیں تجھے خلد سے تعبیر
اے جنتِ کشمیر

پھولوں کی ہے وادی کہ سجی محفلِ رنگیں — جھیلوں کا ہے پانی کہ بچھی چادرِ سیمیں
ہر گام پہ اللہ رے ہجومِ گل و نسریں — ہے سنبل و ریحاں سے تری خاک کی تزئیں
اِن تازہ عناصر سے ہوئی ہے تری تعمیر
اے جنتِ کشمیر

ہیں خلد نظر سرو و صنوبر کی بہاریں — ہیں جنت نظارہ چناروں کی قطاریں
ہم خلد بریں کہہ کے تجھے کیوں نہ پکاریں — قدرت کے حسیں ہاتھ تجھے کیوں نہ سنواریں
ہے معجزۂ خامۂ فطرت تری تصویر
اے جنتِ کشمیر

خلد بہار در کنار خاکِ حسین کاشمر — خطۂ رنگ و بو ترا کیوں نہ ہو جنتِ نظر
تیرے نہال و نخل تر برگ و شگوفہ و ثمر — میوہ طراز و گل فشاں طیّب و تازہ تر
جھوم رہا ہے شاخ شاخ رقص میں ہے شجر شجر
سبزہ و گل سے ہیں ڈھکے وادی کوہ و دشت و در

باغ و بہار راغ راغ رشکِ چمن دمن دمن — جلوۂ رنگ رنگ سے قوسِ قزح چمن چمن
نکہتوں سے بسی ہوئی وادیٔ گل ختن ختن — ارضِ شقیق و ارغواں بن گئی ہے دلہن دلہن
وادیٔ رنگ و بو تری شانِ جمال مرحبا
سبزۂ و برگ و بار کا حسنِ کمال مرحبا

ہے جو بپا سبزہ پر ابرِ بہار خیمہ زن — جھوم رہے ہیں سبزہ زار، وجد میں ہیں تل و دمن
آتشِ گل سے آج کچھ اور بھڑک اٹھا چمن — اور بھی شوخ ہو گیا رنگِ شقیق و نسترن

نغمۂ نو کی ہے نوید غنچۂ نو دمیدہ کو
نشأۃ تازہ کا پیام سبزۂ آرمیدہ کو

شاعر کے طرز نگارش کی رعنائی ناظرین کو کچھ اور دیکھنی ہو تو "تاج محل" کے بھی دو ایک بند ملاحظہ کریں۔

اے کشورِ تہذیب و تمدن کے حسیں تاج ۔۔۔ زیبائی و رعنائی تعمیر کی معراج
دنیا ہے ترے جلوۂ دیدار کی محتاج ۔۔۔ تو دیدۂ عالم کا ہے مسجود نظر آج

جنت ہے تو نقاش کی تہذیب عمل کی
یا خواب گہہ ناز ہے ممتاز محل کی

یہ نقش دل آویز ترا تاجِ زمیں ہے ۔۔۔ یا خاتم فردوس کا تابندہ نگیں ہے
نقاش کی تخئیل کی فردوس بریں ہے ۔۔۔ یا خامۂ فن کار کا شہ کارِ حسیں ہے

یہ تاج نہیں حسن و تجمل کی ہے معراج
دراصل مصور کے تخیل کی ہے معراج

یہ نخل روش پر ہیں کہ طوبیٰ کی قطاریں ۔۔۔ یہ سرو و صنوبر ہیں کہ جنت کی بہاریں
ہم تجھکو خیابانِ ارم کیوں نہ پکاریں ۔۔۔ کرنوں کے حسیں ہاتھ تجھے کیوں نہ سنواریں

پانی سے بھرے حوض میں یا چادرِ مہتاب
یہ جلوۂ بیتاب ہے یا رقص میں سیماب

ایک دوسرے بند کا آخری شعر ملاحظہ ہو:

ہے دیدۂ زائر میں تو اک نقش طرب خیز
شاعر کی نگاہوں میں ہے اک بیتِ دل آمیز

اس سے بہتر تعریف مشکل ہے، واقعی یہ محل نہیں ہے، بلکہ شعریت کا ایک پیکر مجسم ہے، جس کو

بلند ذوقِ نظر رکھنے والا شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے، شاعر نے آخر میں اپنے متعلق جو کہا ہے، وہ بالکل سچ ہے، اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہے، ملاحظہ ہو:

کرتا ہے ترے تاج کو یہ نظمِ حسیں نذر
الفاظ و معانی کے یہ تابندہ نگیں نذر

"مستقبل کے ہندوستان" کے متعلق ہمارے عزیز شاعر نے جو پاکیزہ توقعات ظاہر کی تھیں، ان سے کچھ ناظرین بھی سن لیں:

اجڑی ہوئی خاکِ وطن بننے کو ہے پھر گلستاں — دشت و بیابان و دمن ہونے کو ہیں پھر گل فشاں
ہر گاؤں ہر دیہات پھر بننے کو ہے باغِ جناں — ہونے کو ہے باغِ ارم ہر قریۂ ہندوستاں
ہوں گی یہاں پھر کوثر و تسنیم کی نہریں رواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں، جنت نشاں

دہقاں کا ہر اک غم کدہ بن جائے گا عشرت کدہ — مزدور کا ہر جھونپڑا ہو جائے گا راحت کدہ
پھر غیرتِ کاشانہ بن جائے گا ہر غربت کدہ — ہوگا ہجومِ نور سے معمور ہر ظلمت کدہ
ہر کلبۂ دہقاں میں موجِ برق ہوگی ضو فشاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنت نشاں

چمکیں گے تعمیر و ترقی کے مظاہر ہر طرف — ہوں گے فروغِ زیست کے آثار ظاہر ہر طرف
مستِ طرب کر دیں گے قدرت کے نوادر ہر طرف — کھینچیں گے دل فطرت کے جاں پرور مناظر ہر طرف
ڈھک جائے گی فرشِ زمرد سے بساطِ خاکداں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنت نشاں

اندازِ بیان کی روانی اور سلاست کا عالم دیکھنا ہو تو "لعل و جواہر کے وطن" کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اے نازش وفخر زمن — سرچشمۂ گنگ وجمن
گہوارۂ سرو وسمن — رنگیں دمن رنگیں چمن
رشکِ خلق جانِ ارم
باغِ جہاں میں محترم
ہر گوشہ تیرا گلستاں — ہر چپہ تیرا گل فشاں
اے سبزہ زاروں کے جہاں — جانِ جہاں رشکِ جناں
سرسبز وشاداب وجواں
گہوارۂ آبِ رواں
اے کوہساروں کے وطن — اے آبشاروں کے وطن
اے مرغزاروں کے وطن — رنگیں بہاروں کے وطن
اے خطۂ رنگ آفریں
فردوس برروئے زمیں

اس نظم سے شاعر کے ذوق خوش نوائی کا بھی کافی اندازہ ہوتا ہے۔

غرض خیالات کے تنوع وبوقلمونی، جذبات کی حرارت ووسعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ "ایک ایسا خوانِ ادب" ہے، جس سے ارباب ذوق کافی لطف اٹھا سکتے ہیں۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ مختصر مضمون لکھ کر اپنے عزیز شاعر کے محاسنِ کلام کا پورا حق ادا کردیا ہے، لیکن اس کی خوشی ضرور ہے، کہ ایک قابل قدر کلام کی قدر شناسی سے میں قاصر نہیں رہا۔

حرمت الاکرام

غزل

وہ دل جو تھا کسی کے غم کا محرم، ہوگیا رسوا
جہانِ بیش و کم میں خوابِ آدم ہوگیا رسوا

نہ چونکا نکہتِ آوارہ کی روداد پر کوئی
یہ کیوں افسانۂ پروازِ شبنم ہوگیا رسوا

دکھائی اہلِ دل کو منزلِ دار و رسن جس نے
تمہاری کجکلاہی کا وہ عالم ہوگیا رسوا

امانت سینۂ لالہ میں کس کی تھی، نہ یہ پوچھو
کہ سعیِ پردہ داری میں مرا غم ہوگیا رسوا

ہے آئینہ کی حیرانی بھی افسانہ در افسانہ
ترے اسرارِ محجوبی کا محرم ہوگیا رسوا

خبر کیا تھی کہ آنسو پی کے بھی جینا نہیں آساں
یہ غم کم ہے؟ گدازِ شیوۂ غم ہوگیا رسوا

پسند آئی غزل کو میر کی آشفتہ سامانی
ترا رازِ آشنا، اے زلف برہم! ہوگیا رسوا

بسانا تھا کسی حیلے سے دنیا کے خرابے کو
یہ ایسی مصلحت تھی جس پہ آدم ہوگیا رسوا

عجب طرزِ مداوا تھا ہمارے چارہ سازوں کا
کہ حرمت ارتباطِ زخم و مرہم ہوگیا رسوا

کوائف جامعہ

محمد عتیق صاحب کا انتقال

جامعہ کے ایک سابق استاد اور ہم میں سے بہتوں کے ساتھی اور دوست، جناب محمد عتیق صاحب کا، وطن سے دور لندن میں ۷ر جنوری کو یکایک انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

عتیق صاحب ایک طویل عرصے سے لندن میں مقیم تھے اور وہاں کے کسی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے دسمبر کے پہلے ہفتہ میں اطلاع آئی کہ ان پر دل کا حملہ ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں داخل کر دئے گئے ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ مشیر فاطمہ کو، جو جامعہ نرسری اسکول کی ڈائرکٹر ہیں، اس وحشتناک خبر سے، فطری طور پر، سخت پریشانی ہوئی، انھوں نے ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ پہلے سے بہتر ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے آفاق احمد نیویارک (امریکا) میں زیر تعلیم ہیں، وہ لندن پہنچے، ان کے پہنچنے تک ان کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی، کچھ دنوں میں اور بہتر ہو گئی، اب یہ سوچا جا رہا تھا کہ انھیں جامعہ لایا جائے، امید تھی کہ حالات کی تبدیلی اور گھریلو ماحول کا ان کی صحت پر زیادہ خوشگوار اثر پڑے گا، مگر ۷ر جنوری کو یکایک دل کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ۱۳ر جنوری کو ہوائی جہاز کے ذریعہ میت دلی آئی اور اسی روز جامعہ نگر کے قبرستان میں سپرد خاک کی گئی۔

عتیق صاحب مسلم یونیورسٹی کے ان چند ممتاز طالب علموں میں سے تھے جو قوم پرور اور ترقی پسند تھے وہاں سے وہ ۱۹۳۹ء میں جامعہ تشریف لائے۔ ایک عرصہ تک مدرسہ ابتدائی کے نگراں کے فرائض

انجام دئے اور اپنی پرخلوص کوشش سے مدرسہ کی شہرت کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ چار چاند لگا دیئے۔
۵۲ء میں مزید تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے اور وہیں کے ہوگئے۔

جناب شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں، ۶ر فروری کو جلسۂ تعزیت منعقد ہوا اور مرحوم کے ساتھی اور دوست ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب، پرنسپل استادوں کا مدرسہ نے تقریر کی اور مرحوم کے کردار کی بلندی اور ان کے علمی ذوق وشوق پر روشنی ڈالی۔

مرحوم کی رفیقۂ حیات مشیر فاطمہ صاحبہ، ان کے صاحبزادے آفاق احمد اور صاحبزادی رضوانہ خاتون کے غم میں شریک ہیں، خدا سے دعا ہے کہ ان کو صبر جمیل کی توفیق دے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

پروفیسر مجیب کی بیرونی مصروفیات

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی تعلیمی، تہذیبی اور علمی مصروفیات دلی میں اور دلی کے باہر اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ اگر انھیں پابندی کے ساتھ قلم بند کیا جائے تو ایک دلچسپ اور مفید کتاب تیار ہو جائے گی۔ مثلاً پچھلے دنوں ملک کے مختلف حصوں میں مہاتما گاندھی اور حضرت غالب کی صد سالہ اور جناب گرونانک کی پانچ سو سالہ تقریبات منائی گئیں اور اس سلسلے میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے دہلی اور بیرون دہلی اردو اور انگریزی میں متعدد تقریریں کیں اور مقالے پڑھے، مگر ماہنامہ جامعہ کے محدود صفحات کی وجہ سے ہر ماہ پابندی کے ساتھ کوائف جامعہ کا کالم باقی رکھنا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے ان کی علمی وتعلیمی سرگرمیوں سے قارئین جامعہ کو آگاہ نہیں کیا جا سکا۔ اس مرتبہ اتفاق سے کوائف جامعہ کے لئے جگہ نکل آئی ہے، اس لیے ہم ان کی چند سرگرمیوں کا یہاں ذکر کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے اہم موصوف کا وہ انگریزی مقالہ ہے، جو "اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام" کے عنوان سے بمبئی میں پڑھا گیا۔ انجمن اسلام بمبئی کے ماتحت ایک اسلامک ریسرچ

ایسوسی ایشن ہے، جس کے صدر جناب آصف اصغر فیضی اور جنرل سکریٹری جناب سید شہاب الدین دسنوی ہیں۔ اس ایسوسی ایشن میں ہر سال اسلام کے کسی پہلو پر ملک کے کسی عالم یا مفکر کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ امسال پروفیسر محمد مجیب صاحب کو دعوت دی گئی۔ چنانچہ ۱۴ اور ۱۵ فروری کو موصوف نے اپنا مقالہ پڑھا، جسے بہت پسند کیا گیا۔ یہ مقالہ غالباً کتابی صورت میں وہاں سے شائع ہوگا، مگر اس کا ترجمہ ہم رسالہ جامعہ میں شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سے پہلے موصوف نے بھوپال میں غالب پر مقالہ پڑھا اور تقریریں کیں۔ بھوپال میں "اکھل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن" کے اہتمام میں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں جلسے اور نمائش کا انتظام کیا گیا تھا جس میں سمیلن کے سکریٹری جناب ستیش چتر ویدی صاحب کی دعوت پر پروفیسر مجیب صاحب نے شرکت کی۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیفیہ کالج میں بھی جلسے کا انتظام کیا گیا جس میں مجیب صاحب نے غالب کی عظمت پر تقریر کی۔ اس موقع پر کالج کے ایک استاد جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے بھی تقریر کی تھی، جس میں غالب کے کلام کے ان مخطوطوں کا ذکر کیا، جو بھوپال میں دریافت ہوئے ہیں۔ پہلا مخطوطہ "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہو چکا ہے اور دوسرا مخطوطہ جو پہلے سے زیادہ اہم ہے، ۱۸۱۶ء کا نوشتہ ہے، ابھی حال میں بھوپال سے دستیاب ہوا ہے، جو ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔

اب اپریل کے دوسرے ہفتہ میں امریکہ تشریف لے جا رہے ہیں، جہاں ایشیا سوسائٹی اور فورڈ فاؤنڈیشن کے مشترک اہتمام میں غالب صدی کے سلسلے میں وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں میں جلسے، نمائش اور شعر خوانی کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

پروفیسر مجیب صاحب نے ان جلسوں کے لئے تین مقالے تیار کئے ہیں، دو مقالے غالب اور ان کی شاعری پر ہیں اور تیسرے مقالے کا عنوان ہے: "دو ہم مزاج شاعر۔ غالب اور ایملی ڈی کنسن" ابھی حال میں نیویارک سے جو خط آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ تیسرا عنوان

وہاں بہت پسند کیا گیا۔ پروفیسر مجیب صاحب سے اب مزید درخواست یہ کی گئی ہے کہ لوگوں کی خواہش اور اصرار کے پیش نظر "ہندوستانی مسلمانوں" پر کچھ مقالے پڑھیں یا تقریریں کریں۔ چونکہ مجیب صاحب نے انگریزی میں ہندوستانی مسلمانوں کے علمی اور فکری کارناموں پر بہت بسوط اور مفصل کتاب لکھی ہے، اس لیے ان سے اس موضوع پر تقریر کرنے کی فرمائش کرنا قدرتی بات ہے۔ ایشیا سوسائٹی کی معرفت اور براہ راست بھی کناڈا سے بھی فرمائشیں آرہی ہیں کہ مجیب صاحب وہاں کی یونیورسٹیوں میں بھی لوگوں کو اسلام پر اور غالب پر اپنے خیالات سے استفادہ کا موقع دیں۔ امید ہے کہ امریکہ اور کناڈا میں مجیب صاحب کا یہ علمی سفر کوئی چھ ہفتے جاری رہے گا۔

حضرت جگؔر کی یاد میں ٹرافی

حضرت جگؔر مرحوم کی یاد میں، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحؔر نے جامعہ کالج کی بزم ادب کو ایک بڑی شاندار ٹرافی عطا فرمائی ہے، جس پر حضرت جگؔر کے دستخط کندہ ہیں۔ اس ٹرافی کے مقابلے کے لئے، طے پایا ہے کہ ہر سال کالج کی سطح پر غزل سرائی کا مقابلہ ہوگا اور اول آنے والے کالج کو ایک سال کے لئے یہ ٹرافی دی جائے گی۔ امسال ۱۱ر مارچ کو اس کا پہلا مقابلہ ہوا، جس میں دلی کے متعدد کالجوں نے شرکت کی۔ مقابلے میں شرکت کرنے والے طلباء اور طالبات کی بڑی تعداد نے حضرت جگؔر کی غزلیں پیش کیں، اس کے بعد غالؔب کی، غزلوں کا انتخاب اچھا اور بحیثیت مجموعی پڑھنے کا انداز اور تلفظ قابل ستائش تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ حصہ لینے والوں میں اچھی خاصی تعداد غیر مسلم طلباء اور طالبات کی تھی۔ پہلا انعام لیڈی شری رام کالج کی ایک طالبہ مس دینا کپور کو (ان کی دوسری ساتھی کسی مجبوری کی وجہ سے پہنچ نہ سکیں)، دوسرا انعام دلی یونیورسٹی کی ایک طالبہ انیس بیگم کو، تیسرا انعام جامعہ کالج کے ایک طالب علم سہیل احمد اور خصوصی انعام ہندو کالج کے طالب علم روپ کمل جیتلی کو ملا، اور ٹرافی دلی یونیورسٹی کو گئی۔

فرانسیسی سفارت خانہ کا قیمتی عطیہ

دہلی میں غیر ملکی سفارت خانوں کے شعبۂ اطلاعات و ثقافتی تعلقات تعلیمی و علمی اداروں سے اپنا رابطہ قائم کرتے ہیں اور مختلف صورتوں میں تہذیبی و علمی لین دین ہوتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں جامعہ کے اعزازی لائبریرین پروفیسر محب الحسن صاحب کی کوشش ہوتی ہے کہ مختلف سفارت خانوں سے عطیہ کے طور پر کتابیں حاصل کی جائیں۔ ان کی اسی کوشش کے سلسلے میں فرانسیسی سفارت خانے نے کتابوں کا قیمتی تحفہ عنایت فرمایا ہے، یہ کتابیں فرانسیسی زبان میں ہیں اور چند فرانسیسی سے انگریزی ترجمے ہیں۔ اس سلسلے میں ۲۵ مارچ کو کتب خانہ میں ایک سادہ تقریب ملی اور پر تکلف چائے پر سفارت خانہ کے کلچرل کونسلر جناب فرانس ڈورسے نے شیخ الجامعہ کو یہ کتابیں عنایت فرمائیں۔

جشن زریں کی تیاریاں

جامعہ کے جشن زریں کی تاریخیں جوں جوں قریب آتی جاتی ہیں، اس کی تیاریوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جامعہ نے اس موقع پر جو منصوبے بنائے ہیں، ان کی کامیابی کا دار و مدار عطیوں اور چندوں پر ہے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے اور حالات یقیناً سازگار نہیں ہیں، لیکن ان منصوبوں اور مقاصد کی اہمیت کے پیش نظر جن کے لئے عطیوں کی اپیل کی گئی ہے، امید ہے کہ قوم اور ملک مایوس نہیں کرے گا۔

مسجد کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے، اگرچہ رفتار خاصی سست ہے، کیونکہ جو روپے پہلے سے جمع تھے، وہ تقریباً ختم ہو گئے ہیں اور چندے کی رفتار بہت سست ہے۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ جب کام شروع کر دیا جائے گا تو قوم بڑھ چڑھ کر اس کی تعمیر میں حصہ لے گی اور منتظمین کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو گی، مگر اب تک کا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ خدا کرے کہ یہ صورت حال وقتی ہو۔

(عبد اللطیف اعظمی)

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

کالا پانی یا تواریخ عجیب — مؤلفہ: مولانا محمد جعفر تھانیسری مرحوم

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۱۲۰ صفحات، غیر مجلد۔ تاریخ اشاعت: یکم نومبر ۱۹۶۹ء، قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ: مولانا وحید الدین قاسمی۔ مکان نمبر ۵۲۲۳ کوچہ رحمان چاندنی چوک۔ دہلی ۶

مولانا محمد جعفر تھانیسری مرحوم اُن علمائے کرام میں سے ہیں، جنھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور شدید تکالیف اور مصائب سے دوچار ہوئے تھے۔ مولانا تھانیسری مرحوم دسمبر ۱۸۶۳ء میں، جب ان کی عمر کوئی ۲۵ برس تھی، گرفتار کئے گئے اور ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو پھانسی کی سزا دی گئی اور ۱۶ ستمبر تک پھانسی گھر میں قید رہے، مگر پھانسی کی یہ سزا، سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدل دی گئی مگر بیس سال کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی ۳۰ دسمبر ۱۸۸۲ء کو رہائی کا حکم ہوا، ۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو یہ حکم انڈمان پہنچا اور دوسرے علماء کے ساتھ جو تحریک آزادی میں شرکت کرنے کی وجہ سے وہاں قید کی سزا کاٹ رہے تھے، مولانا تھانیسری بھی رہا کیے گئے، ان کی چھوٹی اہلیہ بھی عمر قید کی سزا کاٹ رہی تھیں اور ان کی مدت ابھی صرف ۱۴ سال پوری ہوئی تھی اور رہائی کا حکم نہیں آیا تھا، اس لیے موصوف کو وہاں رکنا پڑا، بالآخر یکم مئی ۱۸۸۳ء کو موصوفہ کی رہائی کا بھی حکم آگیا، مگر بعض نجی اسباب کی بنا پر وہ نومبر ۱۸۸۳ء کو وہاں سے روانہ ہوئے، ۲۳ نومبر ۱۸۸۳ء کو کلکتہ پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ریل انبالہ آئے، جہاں ان

کا شاندار استقبال کیا گیا۔

مولانائے محترم نے اپنی گرفتاری اور کالے پانی کے زمانے کے حالات زیر تبصرہ کتاب میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ کتاب کے بارے میں خود موصوف لکھتے ہیں:

"میں نے اس کتاب کو بطور روزنامچہ روزمرہ بول چال میں لکھا ہے اور دوسرے لوگوں کے مقولوں اور قصص کو جہاں تک مجھے یاد تھے بعینہٖ ہوبہو نقل کیا ہے۔"

یہ کتاب بڑی اہم ہے اور تاریخ آزادی کی اہم کڑی ہے۔ مولانا وحید الدین قاسمی نے گاندھی جی کی صد سالہ سالگرہ اور خان عبدالغفار خاں کی ہندوستان میں آمد کے موقع پر شائع فرمایا ہے، انھوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "..... ان حضرات کی یاد کے ساتھ ان حضرات کو بھی یاد کرلینا چاہیئے جو جنگ آزادی کی تحریکات کے بنیادی ستون ہیں اور جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے جیلوں میں ناقابل برداشت سختیاں جھیل کر حبس دوام اور کالے پانی کی سزائیں پاکر پھانسی کے تختوں پر چڑھ کر سامراج کی گولیاں سینوں پر کھاکر اپنی جانیں قربان کی ہیں۔"

کتاب تاریخی لحاظ سے تو اہم ہے ہی، لیکن بیان اور واقعات کے لحاظ سے اتنی دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ شروع کر دینے کے بعد ختم کئے بغیر رکھنا مشکل ہے۔

اذان سحر — از انور اعظمی مرحوم

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$، حجم ۲۴۴ صفحات، کتابت وطباعت وکاغذ عمدہ، مجلد، قیمت سات روپے

تاریخ اشاعت: اگست ۱۹۷۰ء، ناشر: انور اکیڈمی۔ سرائے میر۔ اعظم گڈھ (یوپی)

انور اعظمی اعظم گڈھ کے ہونہار نوجوان شعراء اور ادیبوں میں سے تھے، افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور عین جوانی کی حالت میں وفات پائی، ورنہ ان کی ادبی اور صحافتی صلاحیتوں اور ملی و قومی جذبۂ خدمت کی بنا پر توقع تھی کہ وہ اپنا اور اپنے دیار کا نام روشن کرتے۔ ان کے عزیزوں اور دوستوں نے ان کی یادگار میں ایک اکیڈمی قائم کی ہے اور ان کے کلام کا مجموعہ "اذان سحر" کے نام

سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے کے ساتھ مرحوم کے دوست اور قدر دان کوثر اعظمی کا ۲۷ صفحات کا ایک مبسوط تعارف شامل ہے، جس میں تفصیل کے ساتھ، ان کی سیرت و شخصیت اور صحافتی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تعارف نگار کے بقول "جس میدان میں انور مرحوم کا جوہر صلاحیت سب سے زیادہ چمکا، وہ ان کی شاعری کا میدان ہے۔" کوثر صاحب نے، جو خود بھی ایک خوشگو شاعر ہیں، مرحوم کی شاعری کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انور کی شاعری ایک عظیم مقصدیت کی حامل ہے، وہ مشق سخن برائے داد سخن کے قائل نہیں، تحسین و آفریں کو انھوں نے کبھی اہمیت ہی نہیں دی، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام کبھی واہ واہ کی سطح پر گر کر سطحی عوامی لے قبول نہ کر سکا... ان کے کلام میں بڑا ٹھہراؤ اور گہرائی ہے، ان کے یہاں سامنے کی بات میں بھی ایک گہرا فلسفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔" (صفحہ ۸۷)

مرحوم کی شاعرانہ خصوصیات کو سمجھنے کے لئے ان کے کچھ اشعار بطور نمونہ۔۔۔ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، اس مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم صرف نظم کے شاعر ہیں اور کوئی نظم جب تک مکمل طور پر سامنے نہ ہو، اس کا حسن کامل پوری طرح محسوس نہیں کیا جا سکتا، مگر طوالت کے ڈر سے ایسا کرنا مشکل ہے، اس لیے مختلف نظموں کے انتخابات پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک نظم کے آخری دو بند ملاحظہ ہوں:

اٹھ! رہ شوق کا سامانِ سفر تازہ کریں
محفلِ دہر میں اندازِ نظر تازہ کریں

حسنِ افرنگ نہیں تیری نظر کا مقصود
ظلمتِ شب نہیں ہو سکتی سحر کا مقصود
یاس انگیزی نہیں دردِ جگر کا مقصود

نالۂ صبح کے افسردہ شرر تازہ کریں

ختم ہونے کو ہے یہ مملکتِ شب کا نظام
دے گئی موجِ صبا آکے سحر کا پیغام

میری امید پہ ہے آتشِ نمرود دلیل
پختہ ہوتے ہیں اسی آگ میں جذباتِ خلیل
ٹھوکریں کھا کے ابھر جاتی ہے آوازِ رحیل

کارواں کرنے کو ہے پھر جلوۂ منزل کو سلام

ایک نظم کا عنوان ہے "دارالعلوم"۔ آخری دو بند ملاحظہ ہوں:

تجھ کو کیا مشرق و مغرب کی حکایات سے کام
تو سجا نالۂ برباد سے محفل اپنی
تیری ہستی ہی کے اجزا ہیں پریشاں ہر سو
موج بھی اپنی ہے، خاموشیٔ ساحل اپنی
دشتِ حالات میں آوارہ بھٹکنے والے
کاش تو دیکھ سکے آنکھ سے منزل اپنی

مل سکے نالۂ بیتاب سے گرمی شاید
دلِ مایوس میں ہیں خفتہ شرارے اب بھی
تیرے ہی دل کو بھروسہ نہیں ان پہ ورنہ
راہ دکھلاتے ہیں قرآن کے پارے اب بھی

جی چاہتا ہے کہ ابھی اور کچھ شعر پیش کروں، مگر نظمیں طویل ہیں اور خیالات مربوط، جب تک پوری نظم نہ ہو، شاعر کے صحیح جذبے اور اس کے اصلی فن کو سمجھنا ممکن نہیں، اس لئے چند قطعات پر اس تبصرہ کو ختم کرتا ہوں:

فضا پر ہے شب تاریک طاری
نگہ میں دھند ہے وہم و گماں کی
دعاؤں سے سحر پیدا نہ ہوگی
ضرورت ہے مجاہد کی اذاں کی

چھپا چھپا کے نہ رکھ ان جگر کے داغوں کو
انھیں ستاروں سے اک آفتاب پیدا کر
نہ ہو سکے، تو شکایت نہ کر زمانے کی
جو ہو سکے تو کوئی انقلاب پیدا کر

مجھ کو بے ننگ و نام کہتا ہے
میری مے کو حرام کہتا ہے
یہ وہی شیخ ہے جو دولت کو
زر علیہ السلام کہتا ہے

بھوپال اور غالب

از عبدالقوی دسنوی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۲۸ صفحات، غیر مجلد، قیمت: ڈھائی روپے۔ تاریخ اشاعت:
فروری ۱۹۶۹ء — ناشر: شعبۂ اردو، سیفیہ کالج - بھوپال

لب کبھی بھوپال نہیں گئے تھے، مگر نہ غالب کے حالات زندگی میں یا غالب کے خطوط میں کا ذکر ملتا ہے کہ غالب نے کبھی بھوپال جانے کا ارادہ یا خواہش کی ہو۔ مگر مولوی سید ماحب اشہری کے حوالے سے زیر تبصرہ کتاب کے مصنف جناب دسنوی صاحب نے لکھا

ہے کہ "نواب سکندر جہاں بیگم نے انھیں بھوپال بلانے کی کوشش کی اور تمام اخراجات کی ذمہ
لی" اس بیان پر یقین نہیں آتا، کیونکہ ایسی صورت میں غالب کے سوانح نگار اس کا ضرور ذکر
اس کے علاوہ اس کتاب میں بھوپال سے غالب کے جس تعلق کی نشان دہی کی گئی ہے وہ حسب ذ

"بھوپال سے غالب کا تعلق ملنے والوں، شاگردوں، نسخہ فوجدار محمد خاں وغیرہ کے علاوہ ان
کے سسرالی خاندان سے بھوپال کی قرابت بھی ہے۔ ڈاکٹر حامد حسین نے اس رشتہ کی کھوج
اس طرح لگائی کہ لیس محمد خاں، نواب قدسیہ بیگم کے بھائی معز محمد خاں کے بیٹے تھے جن کی
شادی غالب کی اہلیہ کی بھتیجی کی بیٹی اور داغ کی بھانجی خسرو جہاں بیگم ملقب بہ سردار دلہن بیگم
سے ہوئی تھی، میاں معظم محمد خاں انھیں کے بطن سے تھے" (صفحہ ۷)

بھوپال سے تعلق کی ایک صورت یہ ہے کہ وہاں ان کے بہت سے شاگرد تھے، یہ ت
اگرچہ براہ راست نہیں ہے، مگر شاگرد معنوی اولاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے اس کی ا
سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دسنوی صاحب نے اس کتاب میں اختصار سے ان شاگردوں پر روش
ڈالی ہے اور چند کے فوٹو بھی شائع کئے ہیں۔ بھوپال کے فخر کے لئے یہ امتیاز کافی ہے کہ غالب
دو نایاب مخطوطے وہیں سے دریافت ہوئے ہیں۔ پہلے کا جو ۱۹۲۱ء میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے
ہوا ہے، زیر تبصرہ کتاب میں ذکر ہے، مگر دوسرے کا جو آج کل مقدمہ بازی کا سبب بن گیا ہے،
سے ذکر نہیں ہے، شاید اس کی اشاعت تک اس کی تفصیلات سے محترم مصنف واقف نہیں ہوئے
چنانچہ ابھی حال میں انھوں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ "نسخۂ بھوپال ثانی اس سے پہلے کہ ہم
دیکھ پاتے وطن سے بے وطن ہو گیا" (ہماری زبان مورخہ ۲۲ مارچ)

مختصر یہ کہ غالب یا غالبیات کا بھوپال سے جو گہرا تعلق رہا ہے، اس پر اس مختصر کتاب
اچھی طرح سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کتاب کی اشاعت سے غالبیات میں ایک
اضافہ ہوا ہے۔

شاعر ــــ مہاتما گاندھی نمبر   مدیر اعلیٰ : اعجاز صدیقی

ئز ۲۰×۲۶/۸ ، حجم ۲۷۸ صفحات ، سالانہ چندہ : ۹ روپے ، گاندھی نمبر کی قیمت :
روپے ، ملنے کا پتہ : ماہنامہ شاعر، قصر الادب ، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ،
ئی ۴ بی سی

اتما گاندھی کی صد سالہ جینتی کے موقع پر اردو کے بعض رسالوں نے مخصوص نمبر نکالے یں ماہنامہ جامعہ کے علاوہ اور کوئی نمبر مجھے پسند نہیں آیا، زیادہ رسالوں نے حکومت کلمۂ اطلاعات کے بھیجے ہوئے ترجموں کو شائع کیا ہے اور یہ ترجمے بہت اچھے نہیں رچہ شاعر کے گاندھی نمبر میں ایسے چند مضامین شامل ہیں، مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ا نے بحیثیت مجموعی بہت اچھا نمبر نکالا ہے ، اس نے محض فرض پورا کرنے کی نہیں کی ہے، ذمہ داری کا حق ادا کیا ہے ۔

اصل گاندھی جی پر کچھ لکھنا بہت مشکل کام ہے، ان کی زندگی میں ان کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا وقت تک ان کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں، جب تک ملک کی گروہی سیاست کے اثرات ہمارے کو آزادی کے ساتھ سوچنے اور دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے، یا ہم میں مکمل طور پر معروضی انداز فکر ہوتا۔ زیر تبصرہ شمارہ کے مضمون نگاروں میں، میرے خیال میں، کوئی شخص ایسا نہیں ہے، جسے ہم کا مخالف یا فرقہ پرست کہہ سکیں، مگر نقطۂ نظر کا اختلاف بہت سے مضامین میں موجود ہے۔ ظ انصاری نوان مجھے بہت پسند آیا، واقعی انھوں نے محنت سے لکھا ہے، مگر مختلف مسائل پر انھوں نے جو رکے ہیں یا بعض واقعات سے جو نتیجے نکالے ہیں ان میں سے بعض سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ ذیل کے ات ان ہی باتوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن سے مجھے اختلاف ہے :

ندھی جی کے طرح میں جو ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ بھرا ہوا تھا، جب وہ پہلی دوسری بار مجاہدانہ انداز سامنے آیا تو جس پتھر کو چھوا پارس بنا دیا، علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کیسی کیسی آرزوؤں سے تھی، لیکن بائیکاٹ کے اعلان کا اثر جتنا اس پر ہوا، آخانہ تو آسوتوش مکرجی کی کلکتہ یونیورسٹی

پر ہوا نہ مالوی جی کی بنارس یونیورسٹی پر ــــ دہلی، لکھنؤ اور بمبئی کی شاندار ہڑتالوں اور جلوسوں میں بھی مسلمان ہی آگے رہتے تھے، نان کوآپریشن کے ہنگامی زمانے میں شہروں کے مسلمان وردیاں پہن کر پریڈ کرتے ہوئے نکلتے اور دوکانوں پر پہرہ دیتے، لیکن یہ سیاسی ہیجان ایک روپ تھا، اصلیت نہ تھی، اس کے پس پردہ معاشی اور سماجی اصلیت کو گاندھی جی نے نظر انداز کیا تو روپ بھی ان کے منتر سے نکل گیا۔"

"جس شدت سے انھوں نے اچھوتوں کو اعلیٰ ذات کے ہندؤں کے ساتھ مخلوط انتخاب میں رکھنے کی کوشش کی اور اس کے ہر جانے میں جو حقوق ان کو دینے پر آمادہ ہوگئے، وہ انھوں نے سات کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو دلوانا گوارا نہ کیے تھے، بلکہ ۱۹۳۲ء کے بعد تو وہ صاف طور سے کہنے لگے تھے کہ پہلے میں ہندوؤں کو ساتھ لے لوں، رہا ہندو مسلم مسئلہ، اقلیت اکثریت کے حقوق کا سوال تو وہ انگریزوں کے اقتدار تک ہے، اس کے بعد خود بخود دور ہو جائے گا۔"

میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے کہ ۲۱ء کی تحریک عدم تعاون کا اثر صرف مسلم یونیورسٹی پر پڑا، کسی اور یونیورسٹی پر نہیں۔ ویسے تو مسلم یونیورسٹی بھی اسی طرح باقی رہی جیسے کلکتہ اور بنارس یونیورسٹی۔ اسی طرح "ہڑتالوں اور جلوسوں میں بھی مسلمان ہی آگے رہتے تھے" میں مجھے "ہی" سے اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، مگر یہ اس کا موقع نہیں۔ "شاعر" کے اس شمارے میں جناب آصف فیضی کا مضمون "گاندھی جی اور اقلیتیں" بھی چھپا ہے۔ اس کے دو مختصر اقتباسات ذیل میں پیش کرتا ہوں:

"تقسیم ملک کے بعد گاندھی جی کے بارے میں مسلمانان ہند کے متضاد خیالات سننے میں آتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ مسلم اقلیت کے زبردست حامیوں اور مخلص دوستوں میں تھے۔ مذہبی معاملوں میں ان کے خیالات نانک اور کبیر کی طرح کسی مخصوص عقیدے تک محدود نہ تھے۔"

"..... ہندستان کے اتحاد کے لئے عمر بھر کام کرتے رہے، ان سے ایک دو غلطیاں سرزد ہوئیں، مگر اس کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ تمام سمجھدار مسلمانوں کی رائے میں وہ مسلمانوں کے گہرے دوست اور مدد گار تھے۔"

فاضل مدیر نے "جرعات" میں بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "گاندھی جی کی تعلیمات کو جس طرح پامال کیا گیا، اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔" مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گاندھی صدی کی تقریبات پر لاکھوں ــــ بلکہ شاید کروڑ سے زیادہ روپے صرف کئے گئے، مگر اس موقع پر اردو کی طرف وہ توجہ نہیں کی گئی، جس کی وہ مستحق تھی، شاید یہ کہنا بھی صحیح ہو کہ اس کو بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا۔ مگر اس کے ساتھ مجھے مسلمانوں اور اردو والوں سے بھی شکایت ہے۔ مسلمانوں میں بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جو دل سے گاندھی جی کے خیالات اور تعلیمات کی قدر کرتے ہیں، اسی طرح اردو والوں میں بہت کم ہیں جو ہندوستان کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات پر عمل کرتے ہوں۔ پھر شکایت کی جائے تو کس سے اور کیوں ؟!

(عبد اللطیف اعظمی)

Regd. No. D - 768 April 1

The Monthly JAMIA
JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

[illegible]

[redacted]

[illegible]

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۱ | بابت ماہ مئی ۱۹۷۰ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ :

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلی فون :

اڈیٹر: ۷۴۲۵۸　　منیجر: ۷۴۴۷۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: ڈیال پریس دہلی

شذرات

۳ مئی ۷۰ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات پر ایک سال گذر جائے گا۔ ایک سال گذرنے کو تو گذر گیا۔ اور وقت کی یہی خوبی ہے کہ وہ گذر جاتا ہے ۔۔۔ مگر شاید ہی کوئی اہم موقع آیا ہو اور ذاکر صاحب یاد نہ آئے ہوں۔ جامعہ کے حالات اور ماحول میں ان کی یاد کا آنا ایک قدرتی بات ہے، کیوں کہ اس کے چپے چپے پر ان کے ایسے گہرے اور تابندہ اثرات ہیں، جنھیں کوئی شخص نظرانداز کرنا چاہے بھی تو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ مگر ملک کے ان حلقوں میں بھی، جن سے ان کا تعلق بہت گہرا اور دیرینہ نہیں تھا، ان کی کمی بہت محسوس کی گئی۔ تہذیبی اور تعلیمی اداروں اور شعبوں سے مرحوم کا تعلق ہمیشہ سے رہا ہے اور ان میں وہ بڑی قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، مگر سیاست سے وہ ہمیشہ کتراتے تھے، اس کی تلون مزاجی اور وقت پرستی ان کے مزاج کے خلاف تھی، مگر عمر کے آخری زمانے میں جب انھیں گورنری، نائب صدارت اور صدارت کے عہدے قبول کرنے پڑے اور ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا جو ان کی طبیعت، شرافت اور مزاج سے میل نہیں کھاتے تھے، تب بھی انھوں نے اپنی امتیازی شان کو باقی رکھا اور ملک و قوم کے مفاد میں جہاں اور جب ضرورت محسوس کی اپنے اثرات کو استعمال کیا۔ ہمارے دستور کے لحاظ سے صدر جمہوریہ کو حکومت کے معاملات میں مداخلت کرنے اور اس کی پالیسی میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ صدر راج قائم ہو جائے، مگر عظیم شخصیتیں مداخلت کئے بغیر اہم معاملات پر بہرحال اثرانداز ہوتی ہیں، ان عظیم شخصیتوں میں، جن کے اثرات قبول کرنے پر لوگ مجبور ہوتے ہیں، یقیناً ذاکر صاحب کا شمار بھی ہوتا ہے اور جب "رموز مملکت" پر کسی "دانائے راز" نے کبھی روشنی ڈالی تو اس وقت معلوم ہوگا کہ ذاکر صاحب کی وفات سے ملک و قوم کو کتنا بڑا نقصان پہنچا ہے اور آج ملک میں جو انتشار ہے اور حکومت

جس طرح ڈانواں ڈول نظر آتی ہے، یہ سب نہ ہوتا اگر ذاکر صاحب کی سرپرستی اور سربراہی قائم رہتی۔ ذاکر صاحب نے اپنے دور صدارت میں شرافت اور مروت، انسانیت اور خلوص، تدبر اور مصلحت پرستی، غیر جانبداری اور انصاف پسندی، سیکولرزم اور مذہبی اقدار سے محبت اور حمایت کی ایسی روشن مثالیں قائم کیں جنھیں ایک طویل عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔

ذاکر صاحب نے آزاد قومی تعلیم کی ترویج و اشاعت کو مقصد زندگی بنایا تو راہ کی مشکلات سے بخوبی واقف تھے، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جس ملک میں خدمت کا عہد کررہے ہیں، وہ خود ان کے الفاظ میں "بڑا بدنصیب ملک ہے، وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی کا ملک ہے، افلاس ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے" وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ "اس دیس کی سیوا میں قدم قدم پر خود دیس کے لوگ مخالفت کریں گے" مگر یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ جو کام خلوص اور دیانتداری سے کیا جائے، حالات کتنے ہی ناساعد اور لوگ کتنے ہی مخالف ہوں، کامیابی بہرحال ہوتی ہے۔ یہی معاملہ ذاکر صاحب کے ساتھ پیش آیا، ۱۹۲۶ء سے، جب انھوں نے جامعہ کی خدمت کا عہد کیا ۱۹۴۸ء تک، جب مسلم یونیورسٹی کی حفاظت ان کے سپرد ہوئی، کٹھن سے کٹھن مشکلات کا سامنا ہوا اور بڑی سے بڑی مایوسیوں اور ناکامیوں سے واسطہ پڑا، مگر بہرحال وہ دن آیا جب ان کے خلوص اور محنت کی قدر کی گئی، ان کے نصب العین اور مقصد حیات کو فروغ اور حسن قبول حاصل ہوا، ان کی دن و رات کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ان کی ذات کو وہ مراتب ملے ـــ اور بغیر کوشش اور جوڑ توڑ کے ـــ جو بہت لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ مگر ان ترقیوں کے بعد بھی نہ تو سادگی اور شرافت میں کوئی فرق آیا اور نہ ان کے جذبۂ خدمت میں کوئی کمی آئی۔ وہ جہاں بھی رہے ـــ چاہے راج بھون میں یا راشٹرپتی بھون میں ـــ معلم کے فرض کو انجام دیتے رہے اور تعلیم کی خدمت کا جب بھی موقع ملتا اس سے ضرور فائدہ اٹھاتے۔

اونچے عہدوں کی سبھی عزت کرتے ہیں، صحیح عزت وہ ہے جو عہدۂ بلند سے ہٹنے کے بعد کی جائے۔ ذاکر صاحب کی وفات کے بعد عوام نے ـــ جن میں سبھی مذہب و ملت اور طبقوں کے لوگ شامل تھے۔

س عقیدت اور محبت کا ثبوت دیا اور حکومت نے جس احترام و اعزاز سے نوازا، وہ صرف پرخلوص اور بے غرض خدمت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ آج ذاکر صاحب کو مرجعِ خلائق کا جو بلند مرتبہ حاصل ہے، وہ یا تو بزرگان ند صوفیوں کے مزاروں پر نظر آتا ہے یا قوم کے بلند ترین خادموں کی آخری آرام گاہوں پر۔

ہماری قوم پر جہاں یہ الزام ہے کہ وہ مردہ پرست واقع ہوئی ہے، یعنی اپنے محسنوں کی ان کی زندگی یں وہ قدر نہیں کرتی جس کے وہ مستحق ہیں، وہاں یہ الزام بھی ہے کہ وہ زود فراموش ہے، اس نے اپنے ہنمائی مخلص رہنماؤں کو اس طرح بھلا دیا ہے کہ اب بھولے سے بھی یاد نہیں کرتی۔ امید ہے کہ ذاکر صاحب کے ساتھ یسا نہیں ہوگا۔ ان کی یاد کو زندہ رکھنے اور ان کے اصولوں اور آدرشوں پر عمل کرنے اور عمل کرانے اولیں ذمہ داری جامعہ ملیہ پر ہے، جس کی نشو و نما اور ترقی میں ذاکر صاحب کا خون پسینہ شامل ہے، ہمیں یقین ہے کہ جامعہ ملیہ اپنی اس ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی انجام دے گی، دوسری ذمہ داری حکومت پر عائد تی ہے جس کی خدمت کے دوران انھوں نے وفات پائی۔ حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کو حوم کے شایانِ شان یادگار قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ کمیٹی اپنے فرائض سے آگاہ ہے اور ہمیں مید رکھنی چاہیئے کہ وہ ذاکر صاحب کی خدمات کو سامنے رکھکر ایسی یادگاریں قائم کرے گی جو ملک و قوم کیلئے مفید ہوں۔

جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں ذاکر صاحب کا جو حصہ ہے وہ سب کو معلوم ہے، لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر ذاکر صاحب نے توجہ نہ کی ہوتی تو آج شاید دہلی کالج کا وجود باقی نہ ہوتا، اور اگر ہوتا تو اس کی شکل و صورت کچھ اور ہوتی۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی ایجوکیشن سوسائٹی کے تمام عہدہ دار اور بیشتر اراکین پاکستان چلے گئے تھے۔ ذاکر صاحب نے ہی اسے کسی نہ کسی طرح سنبھالا اور سوسائٹی جامعہ سے تعلق پیدا کر کے اسے محفوظ کر دیا۔ ادھر کئی سال سے دہلی کالج کی مالی حالت خراب تھی اور اس کی وجہ سے کچھ عجیب پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، ذاکر صاحب کی توجہ اور کوشش سے حکومت نے سے جامعہ ملیہ کی معرفت نو لاکھ کی گراں قدر رقم عطا کی۔ ذاکر صاحب کی اسی توجہ کا اثر تھا کہ ان کے

انتقال کے بعد محترم وزیر تعلیم نے ایک جلسے میں فرمایا کہ چونکہ ذاکر صاحب کو دہلی کالج بہت عزیز تھا اس لیے ان کے انتقال کے بعد یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کی بہبودی اور ترقی کا خیال رکھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اب اس کا نام ذاکر حسین میموریل دہلی کالج رکھا جانے والا ہے اور ذاکر صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر یہ اعلان کیا جائے گا۔ ظاہر ہے اس تجویز سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا مگر ذاکر صاحب کی روح اسی وقت خوش ہوگی جب یہ کالج اپنے تعلیمی معیار اور حسن انتظام کے لحاظ سے اگر مثالی نہیں تو کم از کم دہلی کے بہترین کالجوں میں سے ہو۔

ذاکر حسین میموریل کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ ذاکر صاحب کی انگریزی میں ایک مبسوط سوانح حیات لکھی جائے اور اس کا ترجمہ ملک کی تمام زبانوں میں شائع کیا جائے۔ یہ اہم کام ذاکر صاحب کے مدت العمر کے ساتھی اور عزیز ترین دوست پروفیسر محمد مجیب صاحب کو سپرد کیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب ان چند انے گنے لوگوں میں سے ہیں، جنھیں ذاکر صاحب پر کچھ لکھنے کا حق ہے۔ ذاکر صاحب کے دوستوں اور قدر دانوں کو یہ سن کر یقیناً خوشی ہوگی کہ اس بڑے اہم کام کا آغاز ہو گیا ہے۔

ذاکر صاحب کی آخری کتاب "کچھوا اور خرگوش" ہے جو ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ بظاہر یہ معمولی کہانی ہے، مگر مرحوم نے کہانی کے انداز اور اپنے مخصوص اسلوب میں بڑی حکیمانہ باتیں کہی ہیں۔ تعلیمی خطبات کے بعد ان کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں ان کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس میں ان کے قلم کی شگفتگی اور زندگی پر کبھی ہلکا اور کبھی بھرپور طنز قدم قدم پر ملتا ہے اور بقول رشید احمد صاحب "بہت سی باتیں سرِ دلبران اور حدیث دیگراں کے راستے سے آگئی ہیں، سرگذشت سے ذاکر صاحب کے فضائل پر روشنی پڑتی (ہے اور) اس تصنیف سے ان کے فضائل کی روشنی کا مینارہ سامنے آتا ہے۔" یہ کتاب اور اس کا انگریزی ترجمہ نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہو رہا ہے اور امید ہے کہ پہلی برسی کے موقع پر یہ دونوں چیزیں شائع ہو جائیں گی۔ بعد میں ملک کی دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہوگا۔

اس تمام تفصیل کا مدعا صرف یہ بتانا ہے کہ اس ایک سال کے اندر ذاکر صاحب کو قوم اور ملک نے یاد رکھا اور ان کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے، وہ ایک خاص مقصد کے لئے جیے اور آخر عمر تک اس کی تکمیل و تحصیل میں لگے رہے، ان کی صحیح یادگار وہی ہوگی جو ان کے مقصد زندگی کی تکمیل کرے۔ جامعہ نے چند منصوبے بنائے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کو قابل عمل بنایا جائے، اس سے ذاکر صاحب کی روح بھی خوش ہوگی اور قوم و ملت کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

پروفیسر محمد مجیب

اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام

(۱)

جب کوئی مسلمان اسلام کے بارے میں تقریر کرتا ہے یا لکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کا کام کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے مغربی عالموں کی رائے میں تعصب نظر آتا ہے یا ادب اور لحاظ کی کمی، اور اسلام کو پیش کرنے کے روایتی طریقے یا تو اس کے نزدیک موجودہ زمانے کے علمی معیار پر پورے نہیں اترتے یا حالات سے بے تعلق معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے جن کی رہنمائی کرنا ضروری ہے، اور اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اسلام کو صحیح طریقے پر پیش کرے۔ میرا مقصد اصلاح کرنا نہیں ہے، بلکہ صرف اس کا جائزہ لینا کہ اسلام کے بتائے ہوئے حقوق و فرائض پر غور کرنے کا جو ہمارا طریقہ ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، اور وہ بھی اس لئے کہ اگر ہم اپنے عقیدے اور عمل کو محض عادت بنا کر لاحاصل یا بے جان نہیں کر دینا چاہتے تو ہم کو کسی نہ کسی قسم کا جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیئے۔ حساس مسلمانوں اور خاص طور سے صوفیوں کو برابر اس کا خیال رہا ہے۔ شیخ عین القضاۃ ہمدانی رحؒ نے فرمایا ہے کہ عادت پرستی بت پرستی ہے، سچی عبادت وہ ہے جو ہم کو عادت سے آزاد کرے، اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ نماز، روزہ اور حج ایسے کام ہیں جنھیں ایک بڑھیا بھی کر سکتی ہے، مرد آدمی وہ ہے، جو ان سے زیادہ کا حوصلہ کرے۔ لیکن پچھلے تین سو برس میں جو اصلاحی تحریکیں ظہور میں آئیں، ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ معنی سے ہٹ کر لفظ کی زیادہ سختی سے پابندی کرنے لگے۔ بیشک ان تحریکوں کی بدولت اصلاح بھی ہوئی، اوہام پرستی کے بہت سے طریقے چھوڑ دیئے

گئے، شرعی حقوق کا احساس دلایا گیا اور حقوق کے سلسلے میں مجھے خاص طور سے سید احمد شہیدؒ کا یہ کارنامہ یاد آتا ہے کہ بیوہ کو دوبارہ نکاح کرنے کا حق مل گیا، مگر ان تمام اصلاحی تحریکوں میں ان کا ضمیر کا منصب یہ تھا کہ وہ روایتی انداز فکر کو تقویت پہنچائے۔ یہ صحیح معنوں میں ایک قسم کی تقلید ہی تھی جس سے صرف یہ تسلی حاصل ہو سکتی تھی کہ شرعی قانون کی زیادہ صحیح اور زیادہ مکمل پیروی کی جا رہی ہے۔ سوچنے کی ترغیب دلائی گئی تو بس اس لیے کہ پیروی یا تقلید کا اصول زیادہ مستحکم ہو جائے۔

سید احمد خاں روایتی معیار کے مطابق دینیات کے عالم نہیں تھے، مگر انھوں نے جو بحث چھیڑی اس کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے کہ انھوں نے شرعی مسائل میں عقل ناقد سے کام لیکر خود تقلید کے اصولاً صحیح نہ ہونے کا سوال اٹھایا۔ ان معاملات کو چھوڑ کر جنھیں وہ دین کی بنیاد مانتے تھے، انھوں نے کسی بات کو بغیر غور اور تحقیق کے ماننے سے انکار کر دیا۔ ہم ان کے اس خیال کے بارے میں جو بھی رائے رکھیں کہ قرآن کی تعلیم جدید سائنس کے مطابق ہے یا جن اور فرشتے در اصل جن اور فرشتے نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ اور ہیں، لیکن قرآن اور حدیث کی جو تفسیر یا شرح انھوں نے لکھی، وہ اس کا اعلان ہے کہ دینی معاملات میں ہر مسلمان کو سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق ہے۔ سید احمد خاں کی ساری بحث اس وجہ سے ناقص ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ترقی کا ایک غلط معیار پیش کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ حقیقت کی تلاش میں مصروف ہیں، اور ان کے خلوص میں شک نہیں کرنا چاہیے لیکن جسے وہ حقیقت سمجھتے تھے وہ صرف ان کے زمانے کے سائنٹیفک تصورات تھے اور ایک طرح کی مادیت جس کی بنیاد عقلیت پسندی پر تھی۔

سید احمد خاں نے ایک تعلیمی ادارے کو قائم کرنے کی خاطر مذہبی بحث سے توبہ کر لی۔ ان کے مقابلے میں مولانا آزاد کا علم ان سے بہت زیادہ تھا اور سائنس یا ترقی کا کوئی تصور ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن گیا تھا، لیکن وہ ایسے اہم مسئلے کی طرف بس اشارہ کر کے رہ گئے کہ مسلمانوں کو ایک الگ دینی یا سیاسی جماعت بن کر رہنا چاہیے یا نہیں، پھر بھی انھوں نے ایک نظریہ پیش کیا جو اختیار کیا

جاتا تو ہماری زندگی میں بڑا انقلاب پیدا کر سکتا تھا۔ نظریہ یہ تھا کہ مسلمان کو جو رب العالمین کا نام لیوا ہو، اپنی دنیا میں اپنے طریقے پر انسانوں کو فیض پہنچانا اپنا خاص منصب سمجھنا چاہیئے۔ مولانا آزاد کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ انھوں نے اس نظریے کا اپنے بس بھر حق ادا کیا تو بھی یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ یہ نظریہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا، کیونکہ اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیاوی معاملات میں بہ یک وقت مصروف بھی رہے اور اپنے دل کو آزاد بھی رکھے اور یہ صفت پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کے اس نظریے پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔

اصل میں وضاحت طلب یہ مسئلہ نہیں ہے کہ مسلمان اچھا مسلمان کیسے ہو سکتا ہے، بلکہ یہ مسئلہ کہ اسے کس حد تک اور کن معاملات میں اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرنا اور کس حد تک روایتی تصورات کا پابند رہنا چاہیئے۔

یہاں ضمیر سے مراد غلط اور صحیح، اچھے اور برے کا وہ احساس ہے، جو روزمرہ کی زندگی میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اور جس کی وجہ سے ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ صحیح بات پر عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔ بعض لوگوں میں یہ احساس بہت قوی ہوتا ہے، عام طور پر لوگ دوسروں کی مثال اور جماعت کی رائے کا سہارا لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ہم اپنے لیے طے کریں کہ صحیح اور غلط کیا ہے، بس ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔ تاریخ کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مسلمان جنھیں ان کے ضمیر نے مجبور کیا کہ عام رواج یا عام خیالات سے اختلاف کریں، وہ اپنی تائید میں قرآن کا حوالہ دیتے، لیکن قرآن کا حوالہ دینے کا حق بھی محدود تھا۔ اس سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے، جن کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ ان کا علم کافی ہے۔ مگر ایسے عالم خود کسی فقہی مذہب کی پابندی کرتے تھے، اور ان کی مثال سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ دینی عقائد اور عمل کے معاملے میں صحیح اور غلط کی تمیز عام رائے اور رائج اور مستند تصورات کے مطابق کی جاتی تھی۔ انفرادی طور پر ہر مسلمان کا ضمیر مجبور تھا کہ قرآن اور حدیث کی تشریح کے

کسی رائج طریقہ کے مطابق ذہنی تسلی حاصل کرے۔

قرآن نے کسی ایسی تقلید کا حکم نہیں دیا ہے، اس کی نظر میں ملت بھی ہے اور افرادِ ملت بھی، اور اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے کہ افراد کی طرح ملت بھی غلطی کر سکتی ہے، جس کی مثالیں تاریخ سے دی گئی ہیں۔

رسول اللہ صلعم کی مثال اور ان کی ہدایتوں کی پوری تقلید در اصل وہی لوگ کر سکتے تھے جو ان کے ہم عصر تھے، جو ان کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آتی اس کے بارے میں ان سے سوال کر سکتے تھے۔ ہم تک جو حدیثیں پہنچی ہیں، ان پر اس زمانے کے رائج تصورات اور عمل کا اثر پڑ چکا تھا جب وہ یکجا کی گئیں۔ چاہے ہم سید احمد خاں کے اس خیال سے اتفاق نہ کریں کہ تمام حدیثیں رسول اللہ صلعم کے قول اور عمل کے بارے میں دوسروں کے بیانات ہیں اور اس لیے ہمارے اوپر ان کی پابندی اسی حالت میں لازمی ہے جب کہ ہماری عقل انھیں قبول کرے، لیکن ہم سید احمد خاں کی اس رائے کو بالکل نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ حدیثوں کی جانچ کے لیے شروع ہی سے خاصے سخت قاعدے بن گئے تھے، صرف اس لیے کہ ہر راوی اور ہر روایت قابلِ اعتبار نہیں تھی۔

تقلید کے اس سارے مسئلے کو اس نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ دین کا مقصد انسان کے ذہن کو ایک حالت پر قائم رکھنا ہے یا اس میں نمو کی طاقت پیدا کرنا۔ اس سوال کو اٹھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقیدے کو وقت کے ساتھ بدلنا چاہیے، بلکہ اس مسئلے کی طرف متوجہ کرنا کہ خود عقیدے میں کوئی مادہ ایسا ہے یا نہیں جو خود بڑھتا اور نشو و نما پاتا رہتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے بارے میں ہمارے جو روایتی عقائد ہیں ان میں کوئی ایسی جمہوری صفت ہے کہ جو ہمیں ملک کی موجودہ زندگی کا ایک تندرست، حیات آفریں عنصر بنا سکتی ہے؟ حالات کے مطابق قرآنی ہدایتوں کی جو تشریحیں کی گئی ہیں، ان میں سے کئی اب ہمارے زمانے کے اعتبار سے کار آمد نہیں ہیں۔ ہندی مسلمانوں کے اب ایسے مخالف نہیں ہیں، جنھیں مکّے کے قریش کا نمونہ

مانا جا سکے، انھیں اب یہودی اور نصرانی قبیلوں سے معاملات طے کرنے نہیں ہیں، ان کے پاس بڑھنے اور پھیلنے کے وہ موقعے نہیں ہیں، جو مسلمان عربوں کو ساتویں اور آٹھویں صدی میں حاصل تھے اور وہ ایک ایسی ریاست نہیں ہیں جو غیر مسلم ریاستوں سے صلح یا جنگ کر سکے اب ہندوستان دار الاسلام ہے نہ دار الحرب، اور اگر اسے دار الامن مانا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم مجبور ہو کر جو حالات ہیں، انھیں تسلیم کرتے ہیں، اپنے آپ کو شہریت کے فرائض کو انجام دینے کا پابند نہیں سمجھتے اور مذہبی آزادی اور جان و مال کے تحفظ کے سوا دوسرے حقوق سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ اس موقع پر کیا ہمیں طے کر لینا چاہیے کہ ہمیں کوئی ہدایت نہیں دی گئی ہے جو حسب حال ہو، یا یہ سوچنا چاہیے کہ ہدایت موجود ہے، صرف روایتی تصورات کو چھوڑنے کی ضرورت ہے؟ اگر ہم مان لیں کہ ہمارے عقائد میں نمو کی طاقت ہے تو ہم اپنے آپ کو برابر یاد دلاتے رہیں گے کہ "قوامین بالقسط شہداء للہ" سے ہمارا منصب واضح ہوتا ہے اور ہمیں یہ منصب صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی خاطر ادا کرنا ہے۔

یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کے ضمیر نے مسلمانوں کے ذہن کو اس خیال سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں کی صرف دو قسمیں ہیں، مسلمان اور گمراہ۔ شیخ ابن عربی عقیدۂ وحدت الوجود کی علامت بن گئے ہیں، لیکن وحدت الوجود کے ماننے والے ان سے پہلے بھی تھے۔ اس عقیدے کو شیخ ابن عربی نے جس طرح پیش کیا ہے، وہ بہت پیچیدہ ہے اور اس نے لوگوں کے تصورات کو اتنا متاثر نہ کیا ہوتا اور وہ صوفیوں کے عقائد اور شاعروں کے کلام میں اس جوش اور شوق سے بیان نہ کیا گیا ہوتا اگر مسلمانوں میں ایک غیر شعوری، مگر قوی میلان نہ ہوتا کہ اپنی نظریں اونچی کر کے مسلمانوں کے علاوہ باقی انسانوں کو بھی دیکھیں اور غیر مسلموں کو اس کا حق دیں کہ وہ اپنے الگ عقیدے رکھیں اور ان پر عمل کریں۔ مسلمانوں کے ضمیر ہی نے عقیدے کی سچائی کا معیار، خلوص اور وفاداری کو بنایا اور محض زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہنا کافی نہیں سمجھا۔ یہی ضمیر تھا جس نے اکبر کے ذہن میں یہ سوال اٹھایا کہ انسانوں کے عقیدوں میں کوئی مشترک قدر بھی

ہیں یا نہیں ؟

البتہ سیاست کے میدان میں مسلمانوں کے ضمیر نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ بنو امیہ نے ایسے تمام خیالات اور رجحانات کو کچل ڈالا جن سے ان کے خاندانی اقتدار کو نقصان پہنچ سکتا تھا، اس سے بھی زیادہ مہلک معتزلہ کی یہ کوشش تھی کہ حکومت کی مدد سے اپنے عقائد کو تسلیم کرائیں، اس لیے کہ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علماء اور حکومت کے درمیان ایک اتحاد سا ہو گیا اور حکومت اور علماء کی مداخلت کی ایسی نظیریں قائم ہوئیں جنھوں نے ذہن کی آزادی بلکہ علمی تحقیق کو ایک خطرناک چیز بنا دیا۔ ہم اقتدار پرست علماء کو معاف کر سکتے اگر وہ مروّجہ سیاسی اور سماجی نظام کے مخالفوں کی مدد کے لیے فقہی دلیلیں دینے سے انکار کرتے، لیکن وہ تو اس سے بہت آگے بڑھ گئے اور ملت اسلامی اور حاکم وقت کے مفاد کو مترادف قرار دیدیا اور محکوموں کو حاکم اور حکومت کی اصلاح کرنے کے حق سے بالکل محروم کر دیا۔ مساوات اس شکل میں تو قائم رہی کہ خدا کے سامنے سب برابر مانے گئے لیکن عملاً حاکموں کی پالیسی مساوات کے اصول کی خلاف ورزی کرتی رہی، یہاں تک کہ یہ اصول ہی بے معنی ہو گیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا اگرچہ وہ خود ایک اقلیت تھے، لیکن اپنے آپ کو اکثریت کا نمائندہ سمجھ کر اس کے خیالات اور رجحانات کے محافظ بن گئے اور چونکہ یہ ایک عقل کی بات تھی کہ عقیدے اور عمل کے معاملے میں اکثریت کی رائے مانی جائے اس لیے اکثریت کو اقلیت پر پوری طرح سیاسی اور دینی اختیار ہو گیا۔ ایک فرضی اکثریت پوری جماعت کی اور یہ پوری جماعت رائج سیاسی اور سماجی نظام کی مترادف قرار دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ اس جماعت کا مفاد اور امت اسلامی یعنی اسلام کا مفاد ایک ہے۔ ایسی حالت میں تقلید کے معنی یہ تھے کہ انفرادی طور پر کسی مسلمان کو اس کا حق نہیں تھا کہ غلط اور صحیح، نیک اور بد کے بارے میں اپنی الگ رائے رکھے، یعنی دوسرے الفاظ میں اس کے ضمیر کو بحث سے خارج کر دیا گیا۔ ایسی تقلید کیسا تماشا بن سکتی تھی، انیسویں صدی کے نصف آخر میں واضح ہو گیا، جبکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار بالکل نکل گیا

تھا اور مذہبی لوگ اس طرح بات بنانے پر مجبور ہو گئے تھے، جس کا مذاق اکبر الٰہ آبادی نے اڑایا ہے:

قائم یہی بوٹ اور موزہ رکھئے
دل کو مشتاق مس ڈی سوزہ رکھئے
ان باتوں پہ ہو گا نہ معترض کوئی
پڑھئے جو نماز اور روزہ رکھئے

اسی زمانے میں عقیدے کی تخلیقی قوت کو ان کتابوں اور نظموں نے اور بھی کم کر دیا، جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی خوبیوں کو واضح کریں۔ موجودہ دور کے مسلمانوں کی سستی اور بے حسی، اپنے مفاد اور مستقبل سے بے پروائی اور ایک بڑے دینی اور تہذیبی ورثے سے بے وفائی کا بہت موثر انداز سے مقابلہ کیا گیا اس یقین اور ہمت اور جاہ و جلال سے جو مسلمانوں کے ماضی میں نظر آتا ہے۔ اس طرح کی نظموں اور کتابوں نے مسلمانوں کے ذہن پر ایسا جادو کیا کہ گذرا ہوا زمانہ معلوم ہوتا تھا کہ پھر زندہ ہو گیا ہے، اس کے دوبارہ زندہ ہو جانے کا احساس اتنا قوی تھا کہ حال ماضی میں بالکل گم ہو گیا، یہاں تک کہ برطانوی راج کا غلام اپنے آپ کو ایک فاتحانہ عالمی قوت سمجھنے لگا۔ مسلمانوں میں عام طور پر ایک طرح کا تکبر پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے لگے اور کبھی ان کو حقیقت سے آگاہ کیا جاتا تو یہ کہکر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے کہ ان سے بھی بدتر لوگ موجود ہیں۔ اسلام کی مدح سرائی کا ایک سبب وہ غصہ تھا کہ جو مستشرقوں کے اسلام پر اعتراض کرنے سے پیدا ہوا۔ لیکن بجائے اس کے کہ دین اور شریعت کا اور گہرا مطالعہ کیا جاتا، تاکہ علمی اعتراض کا علمی جواب دیا جا سکے، مسلمانوں کی قابل قدر خصوصیات کو اور زیادہ سراہا جانے لگا، تاریخی حقیقتوں کو نظر انداز کر کے ایسی اتفاقی باتوں کو جو بذات خود بہت اہم نہیں تھیں، مستقل صفات کی مثال قرار دیا جانے لگا، مثلاً اگر محمد تغلق ایک مرتبہ خود قاضی کے سامنے اپنے کسی فعل کی عذرداری کے لیے آیا یا جہانگیر نے اپنے محل میں ایک گھنٹی

لگادی، جس کو ہر انصاف کا طالب آکر بجا سکتا تھا، تو مسلمان بادشاہوں کو انصاف پرست اور حق پرست ثابت کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا، ایسی اور مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی اس طرح کی حمایت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے سرسری مطالعہ سے بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، وہ حقیقت سے بہت دور ہے۔

اب خیالات اور احساسات کے اس دلدل سے ہمیں مسلمانوں کے ضمیر کو باہر نکالنا ہے۔ اس کی کوشش کہاں سے اور کیسے شروع کی جائے؟

اس سوال کا روایتی جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ عقیدے اور عمل کا ہے اور علماء کو بحیثیت مجموعی یا پھر کسی امام یا لیڈر کو بتانا چاہیئے کہ ہم کیا کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کرنا ہے ساری ملت کو بہ یک وقت کرنا چاہیئے، ورنہ ہمارے سامنے بہت سی متضاد رائیں ہوں گی، جن کی پشت پر کوئی شرعی حیثیت نہ ہوگی۔ مگر دوسری طرف دیکھیے تو علماء صدیوں سے اسلامی شرع کے کامل اور ہمہ گیر ہونے پر اصرار کرتے رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات بہت مشکل سے آئے گی کہ اس میں کسی اصلاح اور ترمیم کی ضرورت ہے، اس لیے کہ علماء کسی زمانے کے حالات کو یا کسی دور کے تقاضوں کو ایسی سند نہیں مان سکتے جو شرعی مسائل پر غور کرتے وقت پیش کی جا سکے۔ ہندستانی مسلمانوں کا اس وقت جو حال ہے، اس کی بنا پر وہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ شرعی احکام پر دوبارہ غور کرنا چاہیئے، دنیا میں جو سماجی اور معاشی انقلاب ہوئے ہیں، ان کا تو ذکر کرنا ہی بیکار ہے۔ اگر کبھی بحث مباحثے میں علماء مجبور ہو جاتے ہیں کہ شرعی مسائل پر دوبارہ غور کرنے کی یا از سر نو غور کرنے کی ضرورت کو مان لیں تب بھی وہ اصرار کریں گے کہ جو کچھ کیا جائے، علماء کی اجتماعی رائے کے مطابق کیا جائے۔ یہ شاید ثابت نہیں کیا جا سکے گا کہ انھیں دینی مسائل میں پنچ بن کر فیصلے کرنے کا حق ہے اور فقہی کتابوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے مسائل میں اختلاف رہا ہے اور جو رائے صحیح مانی جاتی ہے وہ صرف یہ کہکر کہ اسے دوسری رایوں پر ترجیح دینا چاہیئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام طور پر علماء میں کسی نہ کسی حد تک اختلاف

ہی رہا ہے اور اگر سوچنے سمجھنے والے مسلمانوں کے دلوں پر خوف طاری نہ ہوتا اور وہ اپنی رائے خود قائم کرتے تو علمار کی نہ کوئی حیثیت ہوتی نہ اختیار۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی کتاب میں بھی یہ واضح نہیں کیا گیا ہے کہ امام کا منصب کیا ہے۔ فقہ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اور امیر ہم معنی اصطلاحیں ہیں، گویا حاکم کو امام بھی کہا جا سکتا تھا، جیسے کہ اسے خلیفہ بھی کہہ سکتے تھے، اُس روایتی نمونے کے مطابق کہ ملتِ اسلامی کا حاکم خلیفہ، امام اور امیرالمومنین ہوتا ہے۔ دراصل علمار حاکموں کے زیرِ اثر بلکہ ان کے ماتحت تھے اور اسی وجہ سے سلطانِ وقت کے خلاف بغاوت کرنا شرعی اعتبار سے ناجائز قرار دیا گیا ہے، سوائے اس کے کہ سلطان کافر ہو جائے اور کفر کو رائج کرنا چاہے۔ اکبر نے اس سلسلے میں یہ دلچسپ سوال اٹھایا تھا کہ سلطانِ عادل کی کیا حیثیت ہو گی، لیکن یہاں اس پر بحث نہیں کی جا سکتی۔ البتہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علمار سلطان کو غیر مشروط سیاسی اختیار دینے پر تیار تھے، لیکن انھیں یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ اس کی کوئی دینی حیثیت بھی ہو۔

ہمارے لیے زیادہ مفید مطلب یہ بحث ہے کہ مذہبی اعتبار سے کیا مسلمانوں کا اور تمام مسلمانوں کا نہیں تو ستیوں کا ایسا کوئی رہنما ہو سکتا ہے، جسے اس کی دینی اور روحانی عظمت کی بنا پر اس کا اختیار دیا جائے کہ وہ اجتہاد کرے، یعنی ایسی رائے دے جو چاروں مذاہب کی رائے سے مختلف ہو؟ ایسے اشخاص ہوئے ہیں، جنھیں ان کے علم کی بنا پر امام یا مجتہد کہا گیا ہے، مگر ان کی وفات کے بعد ہی۔ میرے خیال میں اگرچہ ایسے رہنما کا تصور موجود ہے جو اس قابل ہو کہ اجتہاد کر سکے، لیکن کسی کو اجتہاد کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں اجتہاد کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ زمانے کے غور و فکر کو نظرانداز کرکے دینی مسائل پر نئے سرے سے غور کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک اجتہاد صرف ایک شرعی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جو علم اور اعتبار رکھتا ہو، کسی شرعی مسئلے میں ایسی رائے دے سکتا ہے جو علم اور اعتبار رکھنے والے علمار کی رائے سے، جسے مستند

مانا جاتا رہا ہے، مختلف ہو۔ اگر کوئی رائے دینے میں مستند کتابوں کو نظر انداز کرتا تو وہ بدعتی اور قابل مذمت سمجھا جاتا۔ اس معیار کے مطابق سید احمد خاں کے نظریے، اجتہاد کی نہیں بلکہ بدعت اور گمراہی کی مثال ہیں۔ مولانا آزاد کے تصورات کو بھی اجتہاد نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر اقبال، اس وقت جب اسلام کی مدح سرائی مقصود ہوتی، اجتہاد کو ذہنی جمود دور کرنے کے لیے کافی سمجھتے تھے، لیکن وہ تھوڑی بہت آزاد خیالی سے بھی ڈرتے تھے۔ وہ بہت بڑے شاعر تھے جنھوں نے چند نشتوں تک مسلمانوں کو خود ستائی میں مست رکھا، لیکن اگر دیکھا جائے کہ انھوں نے فکر دینی کے میدان میں کیا کچھ کیا ہے، تو معلوم ہوگا کہ ان کا کوئی تصور، کوئی رائے اجتہاد کہلانے کے قابل نہیں۔

اگر کسی نے اجتہاد کو اپنا حق سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہا، تو اس سے پوچھا جاتا کہ اس کو یہ حق کیسے ملا۔ اس کے ذہن کا بیدار ہونا، اس کے اخلاقی شعور، اس کا حوصلہ کہ اپنی جماعت کو ایک بہتر جماعت بنائے، یہ شرعی سندیں نہیں تھیں اور اس کے حق کی بنیاد نہیں بن سکتی تھیں۔ اس کی ایک مثال سید محمد جونپوریؒ ہیں، جن کا زمانہ پندرھویں صدی کا نصف آخر ہے۔ ان کی علمی قابلیت غیر معمولی، ان کی نظر عارفانہ، ہمت بلند تھی، وہ اپنے زمانے کی بے دینی اور اخلاقی بگاڑ سے بہت متاثر ہوئے اور چاہتے تھے کہ جو بھی اپنے آپ کو مسلمان کہے، وہ غیر مشروط طور پر دین کی روحانی اور سماجی قدروں کی خدمت کا پابند ہو۔ علمار سے جو ان کے مباحثے ہوئے، ان کی تفصیل ہم تک نہیں پہنچی ہے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ بحث میں انھیں کوئی قائل نہ کر سکا لیکن علمار کی مخالفت یا ان کے پیرؤوں کے جوش یا اس یقین نے کہ وہ ملت کی اصلاح کے لیے پیدا ہوئے ہیں، انھیں مجبور کیا کہ مہدی آخر الزماں ہونے کا دعویٰ کریں۔ اس کے بعد یہی سوال کہ وہ مہدی ہیں یا نہیں، علمار کے حملے کا مرکز بن گیا اور اس سے ایک ہنگامہ برپا ہوا، جس میں سید محمد کی اصل تعلیمات کی حیثیت خود ان کے پیرؤوں کے لئے ثانوی ہو گئی اور مسلمانوں کی عام جماعت اور اس کے طریق زندگی میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ ہمارے اپنے زمانے میں

مرزا غلام احمد قادیانی نے اصلاح کی کوشش کی، ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو سید محمد جونپوری کے ساتھ ہوا تھا۔ انھوں نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور قرآن کی اس آیت کی نئی تاویل کی، جس میں رسول اللہ صلعم کو خاتم النبیین کہا گیا ہے۔ اگر ہم ٹھنڈے دل سے مرزا غلام احمد کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اسلام کو پیش کرنے کا جو رائج طریقہ تھا، یعنی جس طرح علماء اسے پیش کرتے تھے، وہ خود اسلام کے لیے خطرے کا باعث بن گیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مغربی تہذیب کی پشت پر کچھ ایسی سماجی اور اقتصادی قدریں ہیں، جنھیں مسلمانوں کو کسی نہ کسی شکل میں ماننا چاہئے اور خود اسلام میں اتنی طاقت ہے کہ مسلمان قوموں کے انحطاط کے باوجود اس کی مغربی ملکوں میں تبلیغ کی جاسکے۔ یہاں مجھے اُن دعوؤں سے کوئی بحث نہیں جو مرزا غلام احمد نے اپنے بارے میں کئے ہیں، مگر یہ مسئلہ ضرور قابل غور ہے کہ انھوں نے یہ دعوے کیوں کئے۔ ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ انھیں شروع میں کامیابی ہوئی اور کامیابی ایسی شراب ہے جس کے نشے کو بہت کم لوگ برداشت کرسکتے ہیں، ممکن ہے انھوں نے یہ سمجھا ہو کہ اصلاح اور مناظرے کے میدانوں میں انھوں نے ایسا کچھ کر لیا ہے کہ اب وہ آگے بڑھ کر پیغمبری کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کے علماء کی علمی استعداد کا اندازہ کرلیا تھا اور سمجھتے ہوں گے کہ وہ ان کا مقابلہ نہ کرسکیں گے۔ لیکن ایسی حالت میں جب عقل اور ضمیر کو اصلاح کا محرک بنانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اگر انھوں نے پیغمبری کا دعویٰ نہ کیا ہوتا تو ان کی کیا حیثیت ہوتی۔ وہ محض ایک دینی عالم ہوتے، جن کے خیالات بہت سے لوگ پسند کرتے، مگر کوئی ان کی پیروی نہ کرتا، وہ ایک سیاسی لیڈر ہوسکتے تھے، جس پر مذہبیت غالب ہوتی، لوگ انھیں سرکار کا وفادار سمجھتے، ایک قسم کا دینی خان بہادر جسے سرکار کی خاص حمایت حاصل تھی، انھیں کسی قسم کا اختیار نہ ہوتا، وہ نہ ہدایت دے سکتے، نہ حکم۔ انھوں نے جو تحریک شروع کی تھی وہ بہرحال اختلافات پیدا کرتی اور وہ دماغوں میں ایک ابال سا پیدا کرکے ختم ہوجاتی۔

مرزا غلام احمد کا دعویٰ مسلمانوں پر اتنا شاق گذرا اور اتنا شدید ردعمل ہوا کہ انھوں نے

جو صحیح اور مفید باتیں کہی تھیں وہ بھلا دی گئیں، لوگوں کو بس یہ یاد رہا کہ انھوں نے ایک مذہبی جرم کیا ہے، جسے کسی حالت میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ مرزا غلام احمد کی مخالفت کرنے سے مسلمانوں کا بھلا ہوا یا نہیں، ہاں انھوں نے ایک مذہبی جماعت ضرور قائم کر لی جو بہت منظم تھی اور اپنی بہبودی کے لیے خود تدبیریں کر سکتی تھی۔ اسی جماعت کا ایک حصہ ایسا تھا جو مرزا غلام احمد کی پیروی میں کٹر نہیں تھا اور یہ ان کی تبلیغی منصوبوں پر عمل کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ پھر بھی قادیانی فرقے نے اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ایسی بحثیں چھیڑیں، جن کی وجہ سے اسلام کا تصور وسیع ہونے کے بجائے اور تنگ ہو گیا۔

اس سے خیال ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ذہن اور جذبات کو دلدل سے نکالنے کے لیے نہ علماء کی رہنمائی کام آسکتی ہے اور نہ کسی فرضی امام کی۔ اگر کام آسکتا ہے تو یہ اصول کہ مسلمان کے ضمیر کو اور صرف اس کے ضمیر کو رہنما مانا جائے۔

قرآن میں بہت سی ایسی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعتوں پر مجموعی حیثیت سے عذاب نازل ہوا، یہ مسئلہ تاریخ سے متعلق ہے، خود قرآن میں پوری ذمہ داری تمام اچھے اور برے اعمال کی فرد پر ڈالی گئی ہے:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ

(سورۃ عبس آیت ۳۴ ـ ۳۷)

جس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی جورو اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن فکر لگا ہوگا کہ وہ بس کرتا ہے۔

(ترجمہ: شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

اور یہ بھی کہا گیا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً

جس کسی نے اچھا کام کیا، خواہ مرد ہو خواہ عورت، اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو ہم ضرور اسے اچھی

طَيِّبَةً ج وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ — زندگی بسر کرائیں گے اور ضرور اسے اجر دیں گے، انھوں نے جیسے جیسے اچھے کام کیے ہیں، انکے مطابق ہمارا اجر بھی ہوگا

(سورہ النحل (۱۶) آیت ۹۷) (ترجمہ : مولانا ابوالکلام آزاد)

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ پر بھی یہی نازل ہوا تھا کہ :

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى — کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں لے گا اور یہ کہ انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی اور یہ کہ اس کی کوشش آگے چل کر دیکھی جائے گی۔

(سورہ النجم آیت ۳۸ ــ ۴۰) (ترجمہ : شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

اگر فرد پر اس طرح سے صاف صاف ذمہ داری ڈالی گئی ہے تو پھر وہ رہنمائی کے لیے دوسروں کے پاس کیسے جا سکتا ہے یا جب حساب کا وقت آئے گا تو کیسے کہہ سکتا ہے کہ اسے دوسروں نے غلط ہدایت دی۔

علماء کے طرز بحث کے بارے میں میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، یہ مناسب نہیں ہے کہ میں خود قرآن کی آیتوں کو دلیل کے طور پر پیش کروں ۔ دراصل یہ مناسب نہیں اور خود قرآن کے ساتھ ایک طرح کی بے انصافی ہے کہ اس کی ایک آیت کو لیکر اپنی دلیل کی سند بنائیں۔ قرآن سے ہم کو بصیرت اور ہمت حاصل کرنا چاہیئے، وہ ایسی کتاب نہیں ہے کہ جس سے حوالے دیئے جائیں۔ بیشک اس کی بعض آیتیں ایسی ہیں کہ جو اس کی پوری تعلیمات کا خلاصہ کہی جا سکتی ہیں، لیکن کسی آیت کا سیاق و سباق وہ آیتیں نہیں ہیں جو اس سے پہلے یا اس کے بعد آتی ہیں بلکہ پورا قرآن ہے۔ رسمی دین داری یا عادت یا اس جبلت نے جو ہمیں ایسی ذمہ داریوں سے نکلنے پر آمادہ کرتی ہے جنھیں برداشت کرنے کی طاقت ہم میں نہیں ہے قرآن کی تلاوت کو ایک بے اثر عمل بنا دیا ہے، ہم اس کی تلاوت اس پر غور کرنے کے لیے نہیں کرتے بلکہ ثواب کی خاطر۔ یہ ثواب معلوم نہیں ملتا ہے یا نہیں، لیکن غور کرنے سے جو فیض حاصل ہوتا

تھا اس سے ہم محروم رہتے ہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ قرآن واردات قلبی کا محرک ہے اور یہی واردات قلبی ہیں جو قرآن کو ہماری آج کل کی زندگی میں رہنمائی کا ذریعہ بنا سکتی ہیں، یعنی ایک ایسی طاقت جو ہماری شخصی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل میں اپنا پورا اثر دکھا سکے۔

میں نے علمی مطالعے کے بجائے قرآن کے واردات قلبی کے محرک ہونے پر اس لیے زور دیا ہے کہ انسان کے اختیار کے نازک معاملے میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے:

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً	اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا،
وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِيْ مَنْ	لیکن وہ جس کسی پر چاہتا ہے راہ گم کر دیتا ہے، جس کسی
يَّشَاءُ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ	پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے اور ضرور ایسا ہوتا ہے
تَعْمَلُوْنَ	کہ تم سے ایسے کاموں کی بازپرس ہو جو کرتے رہتے ہو۔
(سورۃ النحل آیت ۹۳)	(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

اسی انداز کی اور آیتیں بھی ہیں۔ اگر ہم منطقی بحث کریں تو اس سے صرف الجھن پیدا ہو سکتی ہے، اگر ہم ایسی آیتوں کو عین حقیقت مان لیں، خدا کے اختیار مطلق اور ان نتیجوں پر جو اس کو مان لینے سے نکلتے ہیں غور کریں تو یہ تضاد دور ہو جاتا ہے۔ ایمان ایسی چیز نہیں ہے جو خود سے پیدا ہو، جیسے سر پر بال، ایمان لانے اور ایمان رکھنے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ ہم قرآن کو روحانی فیض اور ہدایت کے لیے پڑھیں تو یہ بھی ایک عمل ہے جو اپنے ارادے سے کیا جاتا ہے، اگر ہمارا ارادہ شامل نہ ہو تو ہماری حیثیت وہی ہوگی جو منافقوں کی، جن کے بارے میں کہا گیا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ	کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ اتنا کہنے پر چھوٹ
يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ	جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	نہ جائے گا اور ہم نے ان لوگوں کو آزمایا ہے جو
فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	ان سے پہلے تھے تو خدا ان لوگوں کو ضرور معلوم

وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ — کر کے رہے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی ضرور

سورۃ العنکبوت آیت ۲-۳ — معلوم کر کے رہے گا۔

(ترجمہ: شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

قرآن میں انسان کا اختیار فرض کر لیا گیا ہے، جس بات کو ماننے کو کہا گیا ہے، وہ خدا کا مطلق اختیار ہے۔ یہ صحیح معنی میں اسی وقت مانا جاتا ہے، جب اس کو ماننے کا ارادہ کیا جائے۔ قرآن میں یہ سمجھا گیا ہے کہ اس طرح ارادہ کرکے جو ہم مانتے ہیں وہی اصل حقیقت بھی ہے اور اسی وجہ سے قرآن میں ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ

(سورہ یونس آیت ۹۹)

اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں، سب کے سب ایمان لے آتے۔ کیا تو ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاؤ میں چھوڑنے والا نہیں؟

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ

اور کسی جان کے اختیار میں نہیں ہے کہ یقین لے آئے مگر یہ کہ اللہ کے حکم سے اور وہ ان لوگوں کو گندگی میں چھوڑ دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

(سورہ یونس (۱۰) آیت ۱۰۰) (ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

قرآن ایک لحاظ سے مکالمہ ہے خدا اور انسان کے درمیان۔ انسان کو جو کچھ کہنا ہے، تاریخ میں اپنے عمل کے ذریعہ کہہ چکا ہے، خدا اس کے عمل کی جانچ کرتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ اسے ہر چیز پر ہر طرح کا اختیار ہے۔ اسلام کا مطلب اگر خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مسلمان جو کچھ ہو یا نہ ہو اس پر بے جس ہستیوں کی طرح راضی ہو جائیں، یعنی اپنی سستی اور بے مقصد زندگی کا ذمہ دار خدا کو بنا دیں، اسلام کے معنی ہیں انسان کا اپنے

ارادے سے خدا کی تقدیر میں شریک ہونا اور اپنی فطرت کے مطابق جس قدر دینی اور دنیاوی ترقی کر سکتا ہے اتنی کرنا :

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمائے رکھے گا۔

(سورہ محمد آیت ۷)

انسان کے ضمیر کی حیثیت اور اس کے منصب پر ہمیں اسی آیت کی روشنی میں غور کرنا چاہیئے نہ اس خوف میں کہ ہم کوئی غلط رائے قائم کرلیں گے۔ عام طور پر جسے غلطی سمجھا جاتا ہے، وہ دینیات کی ایک اصطلاح ہے یعنی قانون میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہٹ جانا اور جو قانون کے الفاظ پر ایمان لاتے ہیں، وہ ایسی غلطیوں سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں اس لیے کہ وہ ایسی تاکید نہ کریں تو ان کا بنایا ہوا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ قرآن کا نقطۂ نظر بالکل دوسرا ہے :

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ ○ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ

سورۃ العنکبوت آیت ۶ و ۷

اور جو کوشش کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے کوشش کرتا ہے، خدا تو دنیا جہان کے سب لوگوں سے بے نیاز ہے، اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم ضرور ان کے گناہ ان سے دور کر دیں گے، اور جو نیک عمل کرتے رہے ہیں ان کو ان کا بہتر سے بہتر بدلہ دیں گے۔

(ترجمہ: شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی)

ایک اور آیت میں کہا گیا ہے :

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا

جن بڑی بڑی برائیوں سے تمھیں روک دیا گیا ہے، اگر تم ان سے بچتے رہو گے تو ہم تمہاری لغزشوں اور غلطیوں کے اثرات تم پر سے محو کر دیں گے اور

كَرِيمًا ٥ — تمھیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیں گے جو عزت و خوبی کا مقام ہوگا۔

(سورۃ النساء آیت ۳۱)

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

یہاں جن گناہ کبیرہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ، مذکورہ بالا آیت کے علاوہ دوسری آیتوں سے بھی اخذ کیے گئے ہیں، لیکن یہاں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو اپنے ارادے سے اور زندگی کے معاملات کو پوری طرح سمجھ کر، خدا کے دوست بنتے ہیں[1] اور اس کے کاموں میں شریک ہوتے ہیں، اسی معنی میں کہ جس طرف ان آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ

پھر اُن امتوں کے بعد ہم نے تمھیں ان کا جانشین بنایا، تاکہ دیکھیں تمھارے کام کیسے ہوتے ہیں۔

(سورۃ یونس (۱۰) آیت ۱۴)

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ڮ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥

اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں جانشین بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض پر مرتبے دیے تاکہ جو کچھ تمھیں دیا ہے، اس میں تمھیں آزمائے۔ بلاشبہ تمھارا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ وہ بخشنے والا، رحمت والا ہے۔

(سورۃ الانعام (۶) آیت ۱۶۵)

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

یہاں مراد تمام مرد اور عورتیں ہیں، صرف وہ لوگ نہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، بلکہ

---

[1] اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

یاد رکھو، جو اللہ کے دوست ہیں، ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

(سورۃ یونس (۱۰) آیت ۶۲)

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

وہ تمام لوگ جن کا ضمیر بیدار ہے اور جو ہر کام اپنے ضمیر کے مطابق کرتے ہیں، مگر اس میں ان سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی ہدایت ہے کہ انھیں ان غلطیوں کے خوف سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہنا چاہیئے، بلکہ اپنے بس بھر جدو جہد کرنا چاہیئے۔

اس جدو جہد کی نوعیت کیا ہوگی، یہ وضاحت سے نہیں بتلایا گیا ہے، بلکہ صرف نیک اور صالح عمل کا ذکر ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔ یہ خود ایمان لانے والے کا کام ہے کہ اپنے ضمیر کے مطابق ان حالات میں کہ جن میں وہ زندگی گذار رہا ہے، طے کرے کہ نیک عمل کیا ہے اور معروف اور منکر سے مراد کیا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا ذکر ایک ساتھ اتنی مرتبہ آیا ہے کہ ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ایمان کے بغیر نیک عمل ممکن نہیں ہے۔ دینیات کا عالم اصرار کرے گا کہ ایمان پہلے آتا ہے اور ایمان کے ساتھ اطاعت کی تمام شکلیں جیسے کہ روزہ، نماز، حج، لیکن اسے اس کا حق نہیں ہے کہ وہ یہیں پر رک جائے، اسے اس کی بھی وضاحت کرنی چاہیئے کہ عمل صالح کیا ہیں اور عمل صالح کی اتنی ہی سختی کے ساتھ تاکید کرنا چاہیئے، جتنی کہ وہ روزہ اور نماز کے لیے کرتا ہے۔ شاید دینیات کے عالموں نے ایسا کیا بھی ہوتا، لیکن ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ دراصل یہ ان کا منصب نہیں ہے۔ انھیں مطلب ہے قانون سے نظریے اور معلوم فرائض کی صحیح صحیح ادائیگی سے۔ ان کا معیار ایسے میدان میں کام نہیں آتا، جہاں انسان کو خود اپنے لیے فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی یہ رائے قائم ہو گئی ہے کہ ایسا کوئی میدان ہی نہیں اور ہماری شریعت، کامل اور ہمہ گیر ہے۔ یہاں پر ہمیں اس کو اور شریعت کے اس بے لوچ تصور کو جو وہ پیش کرتے ہیں، خیرباد کہنا چاہیئے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ضمیر کے مطابق عمل کریں اور ان تمام ذمہ داریوں کا حق ادا کریں جو قرآن نے ہم پر ڈالی ہیں اور جن کے لیے ہم میں سے ہر ایک انفرادی طور پر خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

(باقی آیندہ)

عبدالسلام قدوائی

صاحب قاموس مجدالدین فیروزآبادی

(عربی زبان کے مشہور لغت القاموس المحیط کے مصنف مجدالدین محمد بن یعقوب فیروزآبادی کے سوانح حیات اور علمی کارناموں کے بارہ میں حسب ذیل مضمون اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اجلاس اعظم گڈھ (منعقدہ دسمبر ۱۹۶۹ء) کے لئے لکھا گیا تھا بعض احباب کی خواہش پر اسے رسالہ جامعہ میں شائع کیا جارہا ہے۔ معلومات کا بڑا ماخذ مصنف کی کتاب بصائر ذوی التمییز کا مقدمہ ہے، جابجا دوسرے ماخذوں کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔)

نام ونسب

محمد نام مجدالدین لقب ہے والد کا نام یعقوب تھا سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے:

محمد بن یعقوب بن ابراہیم بن عمر بن ابی بکر بن احمد بن محمود بن ادریس بن فضل اللہ ابن الشیخ ابی اسحٰق ابراہیم فیروزآبادی[1]۔

ابواسحٰق شیرازی کے آگے کا نسب نامہ محفوظ نہیں ہے لیکن خود صاحب سوانح (شیخ مجدالدین) نے اپنی بعض تصانیف میں اپنے صدیقی ہونے کی تصریح کی ہے اگرچہ بعض ناقدین کو اس کے قبول کرنے

---

[1] الضوء اللامع للسخاوی

میں تامل ہے کیوں کہ سلسلہ نسب کے بارہ میں ان کے بیان کی دوسرے ذرائع سے تصدیق نہیں ہوتی لیکن شیخ خود صاحب علم وتحقیق ہیں، ان کی صداقت ودیانت مسلّم ہے وہ لغت وادب ہی کے نہیں حدیث وتفسیر کے بھی امام ہیں، تراجم رجال ان کا خاص موضوع ہے، ایسے صاحب نظر شخص کے بارہ میں یہ کیسے خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے حسب ونسب اور خاندانی حالات سے ناواقف ہے اور یہ توہم بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ایسا متقی اور دین دار اس درجہ کا شیخ وقت کذب بیانی سے کام لے گا جب کہ اسے معلوم ہے کہ اپنا سلسلہ نسب کسی غیر شخص سے ملانا کتنا بڑا گناہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے بارہ میں کتنی سخت وعید بیان فرمائی ہے، ان اسباب کی بنا پر ہمیں بدظنی سے پرہیز کرنا چاہیئے اور شیخ مجد الدین کے بیان پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

جد اعلیٰ شیخ ابواسحٰق (متوفی ۴۸۶ھ) کے وقت سے ان کا خاندان ایران میں آباد تھا شیخ ابواسحٰق فقہ شافعی کے بہت نامور عالم اور صاحب تصانیف تھے التنبیہ، المہذب اور طبقات الفقہاء[1] ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

ان کا اصل وطن فیروزآباد تھا لیکن تحصیل علم کی غرض سے شیراز آئے یہیں انھیں علمی شہرت حاصل ہوئی اس زمانہ میں بغداد دنیائے اسلام کا مرکز تھا اگرچہ ہارون ومامون کا سنہرا دور ختم ہوچکا تھا اور عباسی حکومت روبہ زوال تھی لیکن پھر بھی بغداد کو بڑی حد تک مرکزیت حاصل تھی اس بنا پر شیخ ابواسحٰق نے تحصیل علم کے بعد وہاں قیام کیا اور اپنے فضل وکمال سے اہل علم کو اتنا متاثر کیا کہ آج تک ان کے کمالات کا شہرہ ہے۔

شیخ مجد الدین کے والد شیخ یعقوب بھی اپنے زمانہ کے ممتاز عالم تھے اور شیراز میں ان کا حلقہ درس مشہور رہا تھا۔

پیدائش

اس علمی ماحول میں ربیع الآخر ۷۲۹ھ مطابق ۱۳۲۹ء میں مجد کی پیدائش ہوئی ان کے مولد

---

[1] الاعلام للزرکلی

کا نام کارزین[1] ہے یہ شیراز کے اطراف میں میں ایک قصبہ تھا عرصہ سے ان کا خاندان یہاں آباد تھا ان کے والد تعلیم وتدریس کے مشاغل کی وجہ سے زیادہ تر شیراز میں رہتے تھے لیکن وقتاً فوقتاً کارزین آتے جاتے رہتے تھے۔

تعلیم

سات سال کی عمر تک کارزین میں قیام رہا یہیں قرآن مجید حفظ کیا اور لکھنا پڑھنا سیکھا اس کے بعد آٹھ برس کی عمر میں اپنے والد کے پاس شیراز گئے اور ان سے صرف ونحو اور ادب کی ابتدائی کتابیں پڑھیں شیراز کے دوسرے علماء سے بھی فیض حاصل کیا ان میں قوام عبد اللہ بن محمود بن النجم اور محمد بن یوسف زرندی خاص طور پر قابل ذکر ہیں زرندی سے حدیث شریف پڑھی۔

۷۴۵ھ میں مزید تحصیل علوم کی غرض سے شیراز سے واسط گئے یہاں شہاب احمد بن علی الدیوانی سے دسوں قراتیں سیکھیں واسط سے بغداد گئے یہاں سراج عمر بن علی قزوینی سے بخاری شریف کی سماعت کی یہ عراق کے بہت بڑے محدث تھے۔ امام صاغانی سے مشارق الانوار پڑھی۔ قیام بغداد کے دوران قاضی عبد اللہ بن بکتاش کے معید کی حیثیت سے مدرسہ نظامیہ میں کام کرتے تھے۔

۷۵۰ھ میں عراق سے شام گئے اور دمشق کے علماء و محدثین سے فیض حاصل کیا جن میں شیخ تقی الدین سبکی اور ابن خیار خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

درس وتدریس

دمشق کے علاوہ شام کے دوسرے شہروں اور علمی مرکزوں میں بھی گئے اور اہل علم سے استفادہ کیا پھر بیت المقدس میں ٹھہر گئے یہاں علماء سے اکتساب فیض کے علاوہ متعدد مدرسوں میں خود

---

[1] علاوہ دوسرے مورخین کے خود مصنف نے القاموس المحیط میں زیر لفظ کرز اس کا ذکر کیا ہے۔

بھی درس دیا دس سال بیت المقدس میں قیام رہا اور ان کے فضل وکمال کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی درمیان میں کبھی کبھی قاہرہ بھی جاتے تھے اور مشاہیر اہل علم سے ملاقات اور علمی صحبتیں رہتی تھیں ان میں الفیہ کے شارح ابن عقیل اور دوسرے مشہور نحوی ابن ہشام عبداللہ بن یوسف خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

حج

بیت المقدس ہی کے قیام کے زمانہ میں ۷۶۰ھ میں پہلی مرتبہ مکۂ معظمہ کی زیارت کی اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اس کے بعد پھر ۷۷۰ھ میں دوبارہ مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور مسلسل پانچ چھ سال وہاں مقیم رہے ۷۹۰ھ کے بعد تیسری بار مکہ مکرمہ گئے اور ۷۹۲ھ تک وہاں قیام رہا، اس وقت تک ان کی علمی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی مکہ معظمہ میں بھی ان کے قدردانوں کی کمی نہ تھی ان لوگوں کی حسب خواہش درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور متعدد مدرسوں میں درس دیا جن لوگوں کو ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا ان میں العقدالثمین فی تاریخ البلدالامین کے مصنف محمد بن احمد فاسی بہت ممتاز تھے وہ شیخ مجدالدین کے علم وفضل سے بہت متاثر تھے۔ اس سفر میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ طائف بھی تشریف لے گئے آخری مرتبہ ۸۰۲ھ میں حج وزیارت کی سعادت حاصل ہوئی مکہ معظمہ میں کوہ صفا پر ایک مکان بھی بنالیا تھا یہیں اپنی مشہور کتاب القاموس المحیط مکمل کی۔[1]

علمی منزلت

لغت وادب کے علاوہ علوم قرآن، علوم حدیث، تاریخ وسیر تمام علوم منقولہ میں مہارت تامہ

---

[1] قاموس ذکر صفا

رکھتے تھے۔ کتابوں کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا اس بارہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ بھی انھیں کم معلوم ہوتا تھا آمدنی کا اچھا خاصا حصہ کتابوں کی خریداری پر صرف کرتے تھے۔ خود ان کا بیان ہے کہ :

"میں نے کتابوں کی خریداری پر پچاس ہزار مثقال[1]
سونا صرف کیا ہے۔"

ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے اس حساب سے پچاس ہزار مثقال ۱۸۷۵۰ تولے کے برابر ہوئے اتنی خطیر رقم وہی صرف کر سکتا ہے جسے کتابوں کے مطالعہ کا عشق ہو ان کے شوق کا یہ حال تھا کہ سفر میں بھی کتابوں کی بڑی تعداد ساتھ رکھتے تھے اور صرف رکھتے ہی نہیں تھے بلکہ ان کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔

کتابوں کے مطالعہ کے ساتھ مشاہیر اہل علم سے ملاقات بھی کرتے رہتے تھے اس زمانہ میں حجاز، عراق، شام، مصر، یمن وغیرہ میں شاید ہی کوئی محدث، مفسر، مورخ، لغوی اور ادیب ہو جس سے وہ نہ ملے ہوں مطالعہ کی کثرت اور اہل علم کی ملاقات نے انھیں بڑا وسیع النظر اور کثیر المعلومات بنا دیا تھا۔ ان کے علمی کمالات کے اظہار کے لئے متنبی کا یہ شعر کیسا حسب حال ہے :

ادیب رست فی ارض صدرہ ۔۔۔ جبال جبال الارض فی جنبہا قف[2]

ایسا ادیب ہے کہ اس کے سینہ کی زمین میں ۔۔۔ (ایسے بلند) علم کے پہاڑ ہیں کہ جن کے پہلو میں زمین کے پہاڑ ٹیلے (کی حیثیت رکھتے) ہیں

شاعر بھی بہت اچھے تھے عربی ان کی علمی اور فارسی وطنی زبان تھی اس طرح وہ دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے اور دونوں میں شعر کہتے تھے ان کے اشعار میں حسن الفاظ، حسن

---

[1] الضوء اللامع

[2] متنبی نے دوسرے شخص کے متعلق کہا ہے یہاں شیخ مجد الدین کے مطابق حال ہونے کی وجہ سے ذکر کر دیا گیا ہے۔

الفاظ، ندرت خیال اور حلاوت بیان کے ساتھ صنائع و بدائع کی چاشنی بھی ہوتی ہے [illegible] سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

شہرت

ان کے ان کمالات کی وجہ سے ان کی شہرت دور دور تک پہونچ گئی اہل علم ان سے ملاقات کی کوشش کرتے بڑے بڑے فضلاء ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کی آرزو کرتے اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے۔

وہ محض اہل علم ہی کی عقیدت کا مرکز نہیں تھے بلکہ سلاطین و امراء بھی ان کی زیارت کے متمنی اور ان سے اکتساب فیض کے آرزومند تھے۔ شاہ مصر سلطان اشرف شعبان بن حسین، والی بغداد احمد بن اویس، امراء شام و مصر... شاہ یمن سلطان اشرف اسمٰعیل بن عباس، حاکم عراق شجاع بن محمد بن مظفر یزدی، شاہ دہلی سلطان ناصر الدین محمد بن فیروز تغلق اور اس کے بیٹے سلطان ناصر الدین محمود تغلق، سلطان روم سلطان بایزید بن مراد اور جہاں کشا امیر تیمور سبھی نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور عزت و تکریم سے پیش آئے۔ تیمور لنگ کی سفاکی کا حال کون نہیں جانتا لیکن شیخ مجد الدین کے علمی کمال نے اسے بے حد متاثر کیا اور اظہار عقیدت و اعتراف کمال کے ساتھ اس نے ان کی خدمت میں ایک لاکھ درہم کا نذرانہ پیش کیا تیمور سے شیخ کی ملاقات شیراز میں ہوئی تھی۔

والی بغداد احمد بن اویس ان کے فضل و کمال کا بے حد معترف تھا اس کے یہ اشعار اس کی عقیدت کے گواہ ہیں:

القائل القول لو فاہ الزمان بہ	کانت لیالیہ ایاما بلا ظلم
والفاعل الفعلۃ الغراء لو مزجت	بالنار لم یك ما بالنار من حمم
وہ ایسی بات کا کہنے والا ہے کہ اگر زمانہ	وہ بات کہے تو اس کی راتیں دن بن جائیں اور تاریکی باقی نہ رہے
وہ ایسے روشن کام کرتا ہے کہ اگر اسے آگ	میں ملا دیا جائے تو آگ میں کوئلے باقی نہ رہ جائیں

ایک بار ان کی خدمت میں تحفہ بھیجا تحفہ شاہانہ تھا مگر ان کی عظمت کے سامنے وہ اس کی نگاہ میں ایسا حقیر نظر آتا ہے کہ کہتا ہے۔

ولو نطیق لنهدی الفرقدین لکم — والشمس والبدر والعیوق والفلکا

اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم آپ کی خدمت میں — عیوق (ثریا کے بعد کا ستارہ) فرقدین (قطب شمالی کے مشہور ستارے) چاند، سورج اور فلک کے تحفے پیش کرتے

ن تحائف اور اظہار نیاز مندی کے ساتھ اس نے ملاقات کی درخواست کی چنانچہ حج کے بعد عراق گئے ور بغداد میں اسے ملاقات کا شرف بخشا احمد بن اویس بہت مسرور ہوا اور اظہار عقیدت کے طور بہت کچھ پیش خدمت کیا۔

ناہ یمن کی قدردانی

۷۹۶ھ میں ہندوستان کی سیاحت سے واپس آرہے تھے عدن میں شاہ یمن اشرف اسمٰعیل بن باس کا عامل حاضر خدمت ہوا اور عرض کی کہ بادشاہ آپ کی ملاقات کے متمنی ہیں چار ہزار درم سفر کے ے پیش کئے اور درخواست کی کہ یمن کے پایۂ تخت زبید تشریف لے جائیں اس درخواست پر زبید ریف لے گئے، سلطان بڑی عزت و تکریم سے پیش آیا اور گزارش کی کہ آپ یہاں درس دیا کریں انچہ آپ نے صحیح بخاری کا درس دینا شروع کیا اس درس میں سلطان اشرف خود شریک ہوتا تھا۔

ایک سال کے بعد ۷۹۷ھ میں عہدۂ قضا بھی تفویض ہوا۔ سلطان کی طرف سے شیخ کی بڑی ردانی ہوئی کتابوں کی تصنیف پر بڑی بڑی رقمیں پیش کی جاتی تھیں بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ جن توں میں رکھکر کتابیں سلطان کی خدمت میں بھیجی گئیں انھیں درہموں سے بھر کر واپس کیا گیا۔ ہاد سے متعلق ان کی کتاب الاسعاد بالاصعاد الی مرتبة الاجتهاد تین جلدوں میں اس شان

۱۔ العقد الثمین

سے بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوئی کہ تین آدمی کتابوں کی جلدیں اپنے سروں پر رکھے ہوئے تھے اور ان کے آگے آگے فقہاء، قضاۃ اور طلبہ چل رہے تھے سلطان نے تین ہزار دینار نذر کئے۔

سلطان کی شادی بھی شیخ کی صاحبزادی سے ہوگئی تھی اس کی وجہ سے علمی احترام کے ساتھ عزیزداری کا سلسلہ بھی ہوگیا تھا سلطان کی محبت وعقیدت کا یہ حال تھا کہ ان کی مفارقت کسی طرح اسے گوارا نہ تھی یہاں تک کہ ۷۹۹ھ میں کعبہ مکرمہ جانے کی اجازت مانگی تو اسے بھی منظور نہیں کیا اور کہا کہ یمن آپ کی تشریف آوری سے منور ہوگیا ہے علم کی بجھی ہوئی شمع روشن ہوگئی ہے آپ اپنی خیر وبرکت سے اس ملک کو محروم نہ کیجئے۔

اس اصرار کی وجہ سے چند سال کے لئے سفر حجاز ملتوی کرنا پڑا لیکن بیت اللہ کی زیارت کا شوق اور مدینہ طیبہ میں حاضری کا جذبہ رہ رہ کر جوش مارتا تھا آخر ۸۰۲ھ میں پھر درخواست کی اور اتنا اصرار کیا کہ سلطان منظور کرنے پر مجبور ہوگیا حج کے بعد کچھ عرصہ اور قیام رہا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حدیث شریف اور امام مالک وامام شافعی کی فقہ کی تعلیم کے لئے دو مدرسے قائم کئے ان امور سے فراغت کے بعد یمن واپس ہوئے لیکن ان کی واپسی سے کچھ پہلے ۸۰۳ھ میں سلطان اشرف اسمعیل کا انتقال ہوگیا۔ یہ بڑا ذی علم اور علماء کا قدر دان، منتظم اور رعایا پرور تھا اس کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا سلطان ناصر احمد یمن کا حکمراں ہوا اس کے اندر باپ کی سی صلاحیت نہ تھی مورخین نے اس کے ظلم وجور اور عدم تدبر اور بد معاملگی کی شکایت کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی وجہ سے یمن کی رونق وآبادی اور خیر وبرکت کا خاتمہ ہوگیا اس کے دور میں شیخ مجد الدین کی بھی وہ قدر دانی نہ رہی اور زندگی کے باقی دن معمولی طور پر گزرے۔

وفات

بالآخر ۸۱۷ھ (۱۴۱۵ء) کو ۲۰ر شوال کی شب میں وفات پائی زبید میں شیخ اسمعیل جبرتی کے مقبرہ میں دفن ہوئے آخر وقت تک کانوں اور آنکھوں کی قوت باقی رہی مرنے سے کچھ

پہلے تک ان کی نگاہ میں اتنی طاقت تھی کہ باریک خط پڑھ لیتے تھے۔

مذہب ومسلک

عقیدہ کے لحاظ سے راسخ العقیدہ سنی تھے اور اشعری مکتب خیال کے پیرو تھے فقہی اعتبار سے امام شافعی کے تابع تھے لیکن دوسرے ائمہ کا بھی احترام کرتے تھے۔ تصوف سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی ان کی کتابوں میں اس کا اثر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ یمن کے زمانہ قیام میں شیخ اسمٰعیل جبرتی سے ملاقات ہوئی شیخ اسمٰعیل شیخ محی الدین ابن عربی کے خیالات سے بہت متاثر تھے بلکہ ان کے مبلغ تھے ان کی صحبت میں شیخ مجد الدین نے بھی ابن عربی کی کتابیں پڑھیں اور ان کے خیالات سے متاثر ہوئے حالانکہ محدثین ابن عربی کے خیالات خاص طور سے عقیدہ وحدت الوجود کے سخت مخالف تھے اس مخالفت کے پیش نظر کبھی کبھی ابن عربی کے ساتھ اپنی عقیدت کے اظہار میں احتیاط سے کام لیتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے دل میں ابن عربی کی عقیدت جاگزین ہو چکی تھی بعض مواقع پر انھوں نے شیخ الطریقت اور امام الحقیقت کے الفاظ سے ابن عربی کا ذکر کیا ہے ان کی شان میں یہ شعر ان کی فرط عقیدت کا گواہ ہے:

اذا تغلغل فکر المرء فی طرف	من بحرہ غرقت فیہ خواطرہ
جب کسی شخص کی فکر ان کے سمندر	کے کنارہ میں داخل ہوتی ہے تو اس کے اندر
	اس کے افکار وخیالات غرق ہو جاتے ہیں

تصانیف

شیخ مجد الدین نے ساری زندگی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بسر کی اور بکثرت کتابیں لکھیں لیکن بہت سی زمانہ کے دستبرد کی نذر ہو گئیں پھر بھی بہت سی کتابوں کے نام معلوم ہیں اور کتب خانوں کے گوشوں میں ان کا کافی ذخیرہ مل جاتا ہے۔ اہم کتابوں کی فہرست درج ہے:

۱۔ القاموس المحیط ۔ لغت کی مشہور کتاب ہے

۲۔ منح الباری ۔ صحیح بخاری کی دس جلدوں میں شرح لکھی ہے۔

۳۔ بصائر ذوی التمیز فی لطائف الکتاب العزیز ۔ سلطان یمن الملک الاشرف اسمٰعیل بن عباس کی خواہش تھی کہ ایک ایسی جامع کتاب تیار کی جائے جس میں تمام علوم وفنون کے بارہ میں ضروری معلومات درج ہوں یعنی علوم وفنون کی انسائیکلو پیڈیا مرتب ہو اس کا ایک خاکہ خود سلطان نے پیش کر دیا تھا اس کتاب کے ۵۶ حصے تجویز کئے گئے تھے پہلا حصہ قرآن مجید سے متعلق تھا۔ یہ حصہ بصائر ذوی التمیز فی لطائف الکتاب العزیز کے نام سے دو جلدوں میں قاہرہ سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہو گیا ہے دوسرے علوم کے متعلق جو حصے تھے معلوم نہیں ان کا کیا حشر ہوا بظاہر قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باقی حصے مرتب نہیں ہو سکے۔

۴۔ شوارق الاسرار ۔ یہ حدیث شریف کی مشہور کتاب مشارق الانوار کی شرح ہے۔

۵۔ عدۃ الحکام ۔ شیخ عبدالغنی بن عبدالواحد نے عمدۃ الاحکام کے نام سے احکام شرعیہ سے متعلق احادیث جمع کی تھیں عدۃ الحکام اسی کی شرح ہے۔

۶۔ تیسیر فاتحۃ الاہاب ۔۔۔ یہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے۔

۷۔ الدر النظیم ۔ اس میں قرآن مجید کے مقاصد کے بارہ میں وضاحت کی گئی ہے۔

۸۔ النفحۃ العنبریہ ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد سے متعلق ایک کتاب ہے۔

۹۔ المغانم المطابہ ۔۔۔ اس میں مدینہ منورہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

۱۰۔ مہیج الی البلد الحرام ۔۔۔ یہ مکہ معظمہ سے متعلق ہے۔

۱۱۔ روضۃ الناظر ۔۔۔ اس میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے حالات لکھے گئے ہیں۔

۱۲۔ المرقاۃ الوفیہ ۔۔۔ یہ فقہاء احناف کے حالات میں ہے۔

۱۳۔ المرقاۃ الارفعیہ ۔۔۔ یہ فقہاء شوافع کے حالات میں ہے۔

۱۴۔ البلغہ ۔۔۔ یہ لغت اور نحو کے علماء کے حالات میں ہے۔

۱۵۔ الفضل الوفی ـــــ اس میں السلطان الاشرف اسمٰعیل بن عباس کے عدل و انصاف کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

۱۶۔ نزہۃ الاذہان ـــــ یہ اصفہان کی تاریخ ہے۔

۱۷۔ التجاریح ـــــ اس میں حدیث کی مشہور کتاب مصابیح کی احادیث کے بارے میں ضروری تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

۱۸۔ سفرالسعادہ ـــــ یہ مشہور کتاب ہے اور ہر جگہ چھپی ہوئی ملتی ہے۔

۱۹۔ الاحادیث الضعیفہ ـــــ اس میں ضعیف روایات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

۲۰۔ تنویر المقباس ـــــ اس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیری روایات جمع کی گئی ہیں یہ بھی چھپ چکی ہے۔

سطور بالا میں چند اہم کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے طوالت کے خوف سے بہت سی کتابوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

انور صدیقی

کچھ نثر کے بیان میں

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے اردو ہی کیا فرانسیسی نثر کو چھوڑ کر، دنیا کی زیادہ تر زبانو
نثر پر شاعری کا غلبہ رہا ہے۔ اس کی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول تو یہ کہ شاعری تمام عا
تہذیبوں کی مادری زبان رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ملکوں میں شاعری پہلے شروع ہوئ
نثر بعد میں۔ دراصل تہذیبیں اپنے اولیں دور میں زندگی کو ایک خاص جذباتی اور شعری اندا
دیکھتی اور سمجھتی ہیں ان کے کائناتی تصورات پر ایک طرح کا اساطیری یا دیو مالائی رنگ حاوی ہ
ان کی زندگی اور کائناتی مظاہر کے درمیان ایک واضح معنوی رشتے کی عدم موجودگی کی وجہ
دیومالا پیدا ہوتی ہے۔ معنوی رشتے جب واضح نہیں ہوتے تو زندگی اور کائنات پر ابہام کی دھ
چھا جاتی ہے اس ابہام کو تہذیبیں مبہم انداز سے پیش کرتی ہیں یا وہ جو انداز اختیار کرتی ہیں ا
میں ایک طرح کا خوبصورت ابہام ہوتا ہے۔ وہ کائنات یا مظاہر کائنات کے صرف جذباتی اد
پر قادر ہوتی ہیں اور جذباتی ادراک کی زبان شاعرانہ ان معنوں میں ہوتی ہے کہ اس میں علامتی ا
استعاراتی انداز بیان غالب ہوتا ہے۔ نثر تہذیبی ارتقا کی بہت بعد کی منزل پر وجود میں آتی ہ
مظاہر کائنات کا ادراک جس قدر فکری، غیر جذباتی، لاشخصی اور واضح ہوتا جاتا ہے اسی تنا
سے نثر بھی شعری اسالیب، جذباتی ردعمل اور استعاراتی انداز سے آزاد ہوتی جاتی ہے۔
تہذیب [illegible] آریائی ملک کے غلبے کی وجہ سے ایک عرصے تک ایک ایسی شاعری کی گرفت
رہی جس میں موسیقی کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ نثر کی ضرورت کا احساس ارتقا کی اس منزل پر ہوا

یونانی ذہن شاعری اور موسیقی کو ترک کرکے فکری استدلال کی طرف مائل ہوا۔ موسیقی اور شاعری دو
میں ایک متعین معنوی دنیا نہیں ہوتی اس میں پھیلاؤ اور رمزیت کی کیفیت ہوتی ہے۔ فکری استدلا
وضاحت اور قطعیت کا مطالبہ کرتا ہے چنانچہ یونانیوں نے نثر کے لئے جو اصطلاح وضع کی تھی ا
کا مفہوم تھا برہنہ الفاظ۔ دنیا کی تمام زبانوں کی نثر کے ابتدائی نمونوں میں ہمیں اس وجہ سے جا
اور ایک ایسی موسیقیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے جس کا تعلق شعر کی موسیقی سے ہے۔ ہر زبان کی
ایک عرصے تک جہاں ایک طرف موسیقی کے آہنگ سے قریب ہوتی ہے وہیں دوسری طرف اس
خطابت اور شاعری کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ انگریزی نثر خود ایک عرصے تک شاعری اور خطا
اور موسیقی کی گرفت میں رہی۔ اس لئے ایک زمانے کے بعد اپنے آپ کو ان عناصر سے پاک کرنے میں
کامیابی حاصل کی ہے یہ عمل اب بھی جاری ہے اور نثر کو شاعری کی تابعداری سے آزاد کرانے ا
اسے اس کی آزادانہ حیثیت دلانے کی تحریک شعوری یا غیر شعوری طور پر مل رہی ہے۔ اس لئے ک
انگریزی نثر پر بھی ایک زمانے تک یہی اعتراض رہا ہے کہ وہ شاعری سے نجات نہیں پا سکی ہے
مشہور انگریزی انشاپرداز کلٹن بروک نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ انگریزی نثر ایک ایسی
قوم کی نثر ہے جو گانا بھی جانتی ہے اور تقریر کرنا بھی مگر گفتگو کرنے کے فن سے ناآشنا ہے۔
دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی نثر میں موسیقیت اور خطابت زیادہ ہے اور
عقلی استدلال کا عنصر کم۔ نثر میں لاشخصی انداز، معروضیت اور منطقی انداز کو بنیادی اہمیت حاصل
ہے۔ اسی لئے مڈلٹن مرے اور بونامی ڈابری دونوں نے ہی نثر کے مزاج کو منصفانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قرار
دیا ہے۔

نثر اور نظم کے فرق پر عالمانہ، نیم عالمانہ اور غیر عالمانہ انداز پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کا
اعادہ کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ یہاں میں اس فرق کی طرف ضرور اشارہ کروں گا جو Herbert
Read نے قائم کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صرف فارم کے اعتبار سے دونوں میں فرق کرنا ممکن
نہیں ہے۔ ہم صرف یہ کہہ کر عہدہ برا نہیں ہو سکتے کہ ایک میں آہنگ ہوتا ہے اور دوسرے میں نہیں۔

اس لئے کہ نثر میں بھی ایک طرح کا آہنگ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ آہنگ اتنا ہموار اور Regular نہیں ہوتا جتنا کہ شاعری میں۔ شاعری تخلیقی اظہار ہے اور نثر تعمیری اظہار۔ شاعری میں الفاظ تخلیقی اور فکری عمل کے دوران پیدا ہوتے ہیں یا دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ یہاں لفظ اور خیال کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ خیال لفظ ہے اور لفظ خیال۔ خیال اور لفظ دونوں ہی شاعری ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نثر تعمیری اظہار ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ نثری مواد عدم سے وجود میں نہیں آتا بلکہ اس کی حیثیت ریڈی میڈ مواد کی ہوتی ہے۔ اس میں موجود اور مستعمل الفاظ کو ان کے موجود اور مستعمل تلازم میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ نثر میں الفاظ کا مفہوم واضح اور متعین ہوتا ہے جبکہ شاعری میں الفاظ ایک بسیط، غیر واضح رمزیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے شاعری میں معنی اور جذبے کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ اگر نثر میں یہ کیفیت پائی جائے تو یہ عیب قرار پائے گا۔ نثر میں وضاحت اور قطعیت پر جو اصرار ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مثالی نثر میں بے کیفی اور اکتاہٹ پائی جاتی ہے۔ اچھی نثر میں ایک طرح کا لوچ اور سہولت اظہار بھی ہوتی ہے جو طویل زمانے کے لسانی ارتقار کا حاصل ہوتی ہے۔ اچھے نثری اظہار میں آہنگ کا جو متنوع دنیا آباد ہوتی ہے وہ بذات خود ایک ایسا وصف ہے جس سے آزاد سے آزاد شاعری بھی محروم ہوتی ہے۔ نثر میں آہنگ کے تنوع، لوچ، جامعیت اور منطقی ارتکاز کے اوصاف تہذیبی ارتقار اور لسانی ترقی کے فیضان ہوتے ہیں۔ نثر میں جو وضاحت ہوتی ہے وہ نتیجہ ہوتی ہے ذہنی وضاحت کا۔ یہ ذہنی وضاحت تہذیب کے تمام مرحلوں میں نہیں ملتی بلکہ اس مرحلے پر نظر آتی ہے جب افراد کے ردِ عمل کے نظام پر عقلیت غالب آجاتی ہے اور اقدار کی ترتیب واضح ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس اور انگلستان میں اٹھارویں صدی کو نثر کا دور زریں قرار دیا جاسکتا ہے۔

اردو قدرے نئی زبان ہے۔ اس کا جن زبانوں سے تعلق رہا ہے وہ بھی تہذیبی لحاظ سے پروردہ تھیں جن میں شاعری اور جذباتی ردِ عمل کی روایت خاصی راسخ ہو چکی تھی۔

ان تہذیبوں میں سماجی انقلاب تو آئے تھے مگر حقیقی اور ذہنی نشاۃ ثانیہ کا کوئی دور نہیں ملتا۔ یہ دراصل شعری اور مذہبی تہذیبیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ مذہب اور شاعری دونوں کی بنیاد عقل سے زیادہ جذبے پر ہوتی ہے۔ ان تہذیبوں کی سماجی تنظیم میں قبائلی نظام کو اہمیت حاصل تھی بہت ہوا تو یہ قبائلی جاگیردارانہ نظام میں تبدیل ہو گیا۔ خطابت قبائلی دور کے باقیات میں ہے۔ ایسی تہذیبوں میں مذہب کی وجہ سے ایک طرح کی دروں بینی اور جذباتیت کو فروغ حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے شاعری پروان چڑھتی ہے۔ سماجی تنظیم انھیں خطابت دیتی ہے۔ چنانچہ شاعری اور خطابت کا کاروبار ایک عرصے تک چلتا ہے اور خوب چلتا ہے۔ یہاں میری مراد ایرانی اور عربی تہذیب سے ہے جس کا تمدنی مواد بڑی حد تک اردو نے قبول کیا۔ ان زبانوں میں آزاد اور خود مکتفی نثر کی کوئی قابل ذکر روایت نہیں تھی۔ اور اگر نثر تھی بھی تو اس پر شاعری اور خطابت کا آمرانہ غلبہ تھا۔ نثر شاعری کی صرف ایک نو آبادی تھی اور بس۔ اِن دونوں تہذیبوں کی وساطت سے جس طرح کا مزاج اردو میں منتقل ہوا یا جو اسالیب راہ پا گئے ان میں شعری اور خطیبانہ اظہار کی سہولت ضرور تھی۔ اردو نثر کی پسماندگی کی ایک اور وجہ ہے وہ یہ کہ اردو نے تہذیبی ابہام اور انتشار کے دور میں اپنے ارتقا کے مراحل طے کئے۔ تاریخ انسانی کے ایسے ہر دور میں اچھی شاعری ہوتی ہے سو اردو میں بھی ہوئی مگر نثر شاعری کے صرف ایک اسلوب کی حیثیت سے باقی رہی۔ کم لوگوں نے درخور اعتنا سمجھا۔ نثر نگار کو سماج میں وہ مقام نہیں ملا جو شاعر کو حاصل تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نثر شاعری کی خوشہ چین تھی اور عام پڑھنے والے بھی اعلیٰ نثر کے تصور سے ناواقفیت کی وجہ سے اسے صرف خراب شاعری کا نمونہ سمجھتے تھے۔ میر امّن کی 'باغ و بہار' اور غالب کے بہت سے خطوط اردو نثر کی تشکیل کے اولین نمونے ہیں ان کے بعد کے دور نے مغربی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے نثر کو ایک وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے قبول کیا۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ بہت سے ادیبوں نے نثر کو شاعری کی چاکری سے نکالنے کی کوشش کا کام شروع کیا۔ حالی اور سرسید نے مغرب سے اخذ کردہ عقلیت کے سطحی تصور کے پرچار کے لئے نثر کو استعمال کیا۔ حالی اور سرسید کے ذہن میں مبہم طور پر ہی سہی یہ تصور

ضروری تھا کہ نثر تفریحی اور شعری مشاغل کا ذریعہ نہ رہے بلکہ کسی اعلیٰ مقصد کی تابع ہو جائے۔ وہ شاعری کے سہارے کا محتاج نہ رہے۔ یہ وہ تصور تھا جس نے اردو میں حقیقی نثر نگاری کی داغ بیل ڈالی ۔۔ اس نثر کی جسے میں مہذب نثر کا نام دیتا ہوں۔ مگر چونکہ یہ نثر کا عبوری دور تھا اس لئے خود نئی نثر کے حامیوں کی تحریروں میں جا بجا ایسے مقامات مل جائیں گے جس پر شاعری یا شعری اسالیب اظہار کا پرتو ہے۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ اردو میں نثر کے سلسلے میں بہ یک وقت دو متضاد رویّے، رجحانات، یا روایات کی کارفرمائی ملتی ہے۔ حالی اور سرسید جس زمانے میں نثر کو اس کا منصب دلانے کی جدوجہد کر رہے تھے اور ایک طرح کی عقلیت جسے میں کسی مناسب اصطلاح کی عدم موجودگی کی وجہ سے رومانی عقلیت کہوں گا، اسی دور میں محمد حسین آزاد شاعری میں انقلابی تبدیلیوں کی علمبرداری کے باوجود نثر کے میدان میں رجعتی رول ادا کر رہے تھے اور نثر کو شاعری سے قریب کر رہے تھے۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ انھیں اس تضاد کا احساس تک نہیں ہوا۔ خود علی گڑھ تحریک سے وابستہ رومانی نثر نگاروں نے کم از کم نثر کے سلسلے میں حالی اور سرسید سے زیادہ محمد حسین آزاد کے مسلک کو قبول کیا اور شعری طرز احساس اور استعاراتی طرز بیان کی مدد سے ایک طرح کی شعر زدہ پر تصنّع نثر کی روایت کو آگے بڑھایا جس میں بہت سے لوگوں کو آج بھی ایک طرح کی تخلیقی شان نظر آتی ہے۔ جب کہ سچ بات یہ ہے کہ اچھی نثر تخلیقی نہیں ہوتی صرف تعمیری ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق جیسے لوگوں نے سرسید کے تصور کے مطابق نثر نگاری کی مگر عام پڑھنے والوں نے مہدی افادی، سجاد انصاری اور سجاد حیدر یلدرم کے نثر پاروں کو سینے سے لگایا جو عالمی نثر کے معیاروں سے نہ تو اچھی شاعری ہی ہے اور نہ ہی اچھی نثر۔ ہم شاعری، سیاست اور تہذیب کے تمام شعبوں میں ایک زمانے سے پر شعر عظمتوں کے قائل رہے ہیں اور اچھی نثر چونکہ اپنے حسن کا اقرار آہستہ آہستہ اور منزل بہ منزل کراتی ہے اس لئے ہم آج تک اچھی نثر کے معیاروں کے احساس سے محروم ہیں۔ آج بھی جدید افسانے میں شعریت موجود ہے اگرچہ اس میں جو شعریت ہے اس کا مزاج بدلا ہوا ہے پھر بھی یہ شعریت ہی ہے اور اسے نثر سے دور رکھنا چاہئے ۔۔۔ ہمارے افسانہ نگاروں کو ہربرٹ ریڈ کی یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ صرف شاعری ہی تخلیقی ہے نثر کا فن تخلیقی نہیں تعمیری یا منطقی ہے۔ اس گفتگو سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اردو میں اچھی نثر کے نمونے نہیں ملتے ایسے نمونے کم ہی سہی مگر موجود ہیں مگر ان کے حسن کے اعتراف و اقرار کے لئے ضروری ہے کہ ہماری نگاہوں سے شعریت اور خطابت کی دھند ہٹ جائے۔ ویسے ایک اچھی اردو نثر کی ترقی کے لئے سماج اور تہذیب میں واضح عقلیت کے فروغ کا انتظار کرنا چاہئے!

شاد عظیم آبادی کی مرثیہ گوئی

عزیز مکرم و فاضل محترم حضرت ضیا ر سلمکم الرحمان   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا ۱۴ ر مارچ کا کارڈ ۱۸ ر مارچ کو ملا۔ پڑھ کر دل خوش ہوا۔ اکبر مرحوم کا مصرعہ مزا دے گیا۔ غالباً اکبر اور اقبال مرحومین نے فدائیان جامعہ ملیہ اسلامیہ ایسے لوگوں کو دیکھتے ہوئے ذیل کے شعر کہے ہیں :

اکبر

تو وضع پہ اپنی قائم رہ، تاثیر دکھا تقریر نہ کر
دے پلٹے نظر کو آزادی قدرت کی مگر تحقیر نہ کر

اور اقبال

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست
من از حرم نہ گذشتم کہ پختہ بنیاد است

برادر عزیز حارث صاحب کو آپ کا سلام پہونچا دیا۔ ان کا جوابی سلام قبول کیجئے۔ بزرگان زیزان جامعہ کا شکریہ۔

مارچ کے پرچہ کے شذرات کے بعد جناب سید سفارش حسین صاحب رضوی کا مضمون "شاد عظیم آبادی کی مرثیہ گوئی" شاید ایام محرم کی وجہ سے پہلے پڑھا۔ مضمون برا نہیں۔ حضرت شاد کی مہارت اور کمال سخن وری کا انکار نہیں۔ لیکن اچھا ہوتا کہ سید صاحب حالی و اقبال کو درمیان میں نہ

لاتے اور انیس سے شاد کو نہ بڑھاتے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اردو مرثیہ کبھی میرا موضوع مطالعہ نہیں رہا۔ لیکن اتنا بے خبر بھی نہیں کہ دبیر و انیس کے کارناموں سے بالکل بے خبر ہوں۔ رہے شاد مرحوم تو ان کے حالات و سیرت کا جو حصہ ان کے یا ان کے مداحوں کے قلم سے شائع ہو چکا ہے اسے بھی بذوق و شوق پڑھا ہے۔ اسی نسبت سے ان کا کلام بھی کسی حد تک نظر سے گذر چکا ہے۔ اس مطالعہ کا مجھ پر اثر یہ ہے کہ مختلف حالات کا شاد پر نفسیاتی اثر یہ تھا کہ وہ خود کو اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے اور خیال کرتے تھے کہ زمانہ اور اہل زمانہ نے ان کی رفعت شان کو پہچانا ہی نہیں۔ لوگ جن کا کلمہ پڑھتے ہیں انھوں نے انہی کے خوان ادب سے زلہ ربائی کی ہے۔ حتیٰ کہ شاد کے بعض مداحوں نے انھیں انیس سے بلند مرتبہ مرثیہ گو ظاہر کیا ہے۔

اقبال کو ہم نے پڑھا تو ہے ہی، دیکھا بھی ہے ان کا طریقہ بڑی عمر کے بزرگوں سے ادب کا تھا، رہے ہمعصر تو ان سے بھی مربیانہ نہ تھا۔ ستم ہوگا کہ اس طریقہ کو کوئی مسترشدانہ یا مستفیضانہ سمجھ بیٹھے۔ مگر حالی کے متعلق شاد کا بیان سراسر اتو عائے بے دلیل ہے۔ حالی نے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کبھی مدعیانہ طور پر لوگوں سے خطاب نہیں کیا۔ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری میں شاد کا پیوند محض خوش نما خواب ہے۔ شاد اور حالی کے تحریری دفتر سامنے ہیں۔ حالی کے کسی دور کی تحریر کو شاد کے کسی دور کی تحریر سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا جائے، زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

حالی اور شاد کی افتاد مزاج میں نمایاں فرق ہے۔ شاد خود ستائی سے کبھی نہیں چوکتے اور حالی کا طرۂ امتیاز سچا اور مخلصانہ و عارفانہ انکسار ہے، مثلاً، سرسید مرحوم کی سوانح حیات بعنوان "حیات جاوید" لکھی نامی پریس سے اس کا شاندار پہلا ایڈیشن شائع ہوا جو میں نے ۱۲ء میں پڑھا تھا۔ مولف و مصنف حالی نے خود کو صرف "خاکسار الطاف حسین حالی" کے الفاظ میں پیش کیا تھا۔ دیوان حالی ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ مقدمۂ شعر و شاعری اسی کا حصہ ہے۔ اس کے سرورق پر

بھی حالی نے اپنے آپ کو "خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی" کے نام سے متعارف اور "مقیم مدرسۃ العلوم علی گڑھ" بتایا تھا۔

فاضل مضمون نگار نے دو ایک جگہ شاد کو انیس کا ہمسر اور بعض جگہ ان سے افضل و برتر قرار دیا ہے اور مثال میں کلام شاد کے نمونے پیش فرمائے ہیں۔ شاد و انیس کے کلام میں کیا نسبت ہے اس پر تو شایدؔ انیسئے "غور کریں گے مگر راقم الحروف جو اردو کا ایک معمولی پنجابی طالب علم ہے چند باتیں عرض کرنے کی جرارت کرے تو اسے معاف کیا جائے۔ مضمون نگار لکھنوی ہیں یا دہلوی اس کا تو مجھے علم نہیں۔ انیس کو چھوڑ کر شاد جو موضوع گفتگو ہیں، لکھنوی تھے نہ دہلوی بلکہ بقول مقالہ نگار "مرکز سے دور" یعنی بہار کے رہنے والے تھے۔ اور حالی و اقبال کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ مقدم الذکر پانی پتی (ہریانوی) اور اقبال پنجابی تھے۔ ان تینوں کا مرکز سے دور ہونا ان کے لئے عیب نہیں۔ کیونکہ انسان کی عزت اس کے وطن کی نسبت سے نہیں ہوتی بلکہ صاحبان کمال سے ان کا وطن شرف واعزاز حاصل کیا کرتا ہے۔

ان سطور میں نعوذ باللہ شاد کے فضل و کمال سے انکار مدنظر نہیں بلکہ گفتگو اس میں ہے کہ شاد کا کمال انیس، حالی اور اقبال سے مقابلہ کئے بغیر بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ پیش نظر مضمون میں شاد کے کمال کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں مجھے ان میں وہی مبالغہ اور تاریخ سے بے نیازی اور وہی مروجہ پیشہ ورانہ پیرایۂ بیان اور وہی بے تکلف مقامی تراکیب اور معنی فی بطن الشاعر قسم کے الفاظ دکھائی دے رہے ہیں مثلاً ملاحظہ ہو جامعہ (بابت مارچ ۱۹۶۸ء) صـ۱۳۵ پر مندرجہ اشعار کا چھٹا شعر:

ادیب لازم معنی پہ سب کے غور کرے
کہ واسطے ہیں کم ان معنیوں میں یا کہ سوا

"ان معنیوں میں" کیا ہے۔ شاید نظر میں موتی موتیوں میں، ہاتھی ہاتھیوں میں، وردی وردیوں میں کو پیش کیا جائے۔ مگر کیا کیا جائے تحریر و تقریر میں معنی سے "معنوں" میں، تو پڑھا اور سنا ہے معنیوں

میں نہ پڑھا ہے نہ سنا۔ مولوی عبدالحق مرحوم اپنی قواعد اردو مطبوعہ اورنگ آباد ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۱۴۸ پر لکھتے ہیں۔ "بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو بعض معنوں میں مذکر ہیں اور بعض معنوں میں مونث" فرمایئے یہ "معنیوں میں" کیسی ترکیب ہے۔

اسی نظم کا نواں شعر ہے :

خلاصہ یہ کہ بہت دور کی نہ کوڑی لائے
کہ سننے والوں کو اک انزجار ہو پیدا

پہلے مصرعہ میں ادیب و شاعر کو دور کی کوڑی لانے سے منع کیا ہے۔ مگر خود دوسرے مصرعہ میں "انزجار" کا استعمال خدا جانے کہاں کی کوڑی ہے۔

ص ۱۳۶ پر آیئے۔ دوسرا شعر ملاحظہ کیجئے :

قلم سے لیتے ہیں وہ لوگ موقلم کا کام
اتار لیتے ہیں گویا ھُوَھُوَ نقشا

دوسرے مصرعہ میں "ھُوَھُوَ" نہ بول چال کی بولی ہے نہ تحریر میں آتی ہے۔ اس کی بجائے "ھوبہو" مستعمل ہے :

ص ۱۵۱ پر جو مرثیہ کے بشکل مسدس پانچ بند نقل کئے گئے ہیں۔ ان میں چوتھے بند کا تیسرا شعر ہے :

موقع کے ساتھ غیظ بھی تھا اور خَصَم بھی تھا
الفت کی بھی نظر تھی جلال و خشم بھی تھا

پہلے مصرعہ میں "غیض" یقیناً نقل و کتابت کی غلطی ہے۔ کیونکہ صحیح لفظ "غیظ" ہے "غیض" نہیں ہے "خصم" کا تلفظ دو طرح کیا جاتا ہے۔ خَصْم اور خَصَم۔ اہل لغت نے دونوں صورتوں میں جدا جدا معنے بھی بتائے ہیں یعنی خَصْم کے معنی دشمن اور خَصَم کے معنی خاوند وغیرہ اور بعض نے تلفظ کی دونوں صورتوں کو جائز رکھا ہے اور دونوں صورتوں میں مذکورہ بالا دونوں معنوں کا ذکر کیا ہے۔

حضرت شاؔد نے خشم کا قافیہ خصم باندھا ہے۔ بجا اور درست۔ مگر سوال شعر کے معنوں اور مفہوم کا ہے۔ مجھے اپنے قصور فہم کا اعتراف ہے۔ تاہم کھلتا نہیں کہ پہلے مصرعہ کا دوسرے سے کیا ربط ہے۔ اور پورے شعر کا کیا مفہوم ہے۔

اسی صفحہ پر منقولہ مسدس کا پانچواں بند ہے:

وہ گہرے گہرے زخم وہ آبلا ہوا لہو — وہ قلب مطمئن وہ شہادت کی آرزو
وہ مشفقانہ پند وہ دلجوئی عدو — لہجہ وہ جانفزا وہ فصیحانہ گفتگو
حیرت سے منہ کو تکتا تھا وہ خود گروہ بھی
وہ بردباریاں کہ ہو شرمندہ کوہ بھی

پہلے مصرعہ میں "آبلا ہوا لہو"۔ چوتھے مصرعہ میں فصیحانہ گفتگو۔ پانچویں مصرعہ میں "وہ خود گروہ بھی" خامی بیان اور سستی ترکیب کی شہادت ہے اور چھٹا مصرعہ محض مبالغہ اور حقیقت کے خلاف دعویٰ۔

صـ۱۳۹ پر جو بند نقل کئے گئے ہیں ان میں سے دوسرے بند کا تیسرا شعر ہے:

کہتے ہیں کس کو صبر یہ سب کو بتا دیا
منکر کے دل سے نقص نبوت مٹا دیا

دوسرا مصرعہ غیر واضح ومبہم ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ "نقص نبوت" کیا تھا جو منکر کے دل سے مٹایا گیا۔ قائل کا مفہوم "فی بطن الشاعر" ہے۔

اسی صـ۱۳۹ پر مندرج تیسرے بند کو دیکھئے:

آمادہ اپنی مرگ پہ ہو جو فلک مقام — سن سن کے حرف سخت بہ نرمی کرے کلام
ہرگز نہ ہو عدو سے بھی خواہانِ انتقام — ایسا بجز حضور کے کس سے ہو یا امام
عالم نہ اس کے حال پہ کیوں کر ہلاک ہو
قاتل کے جو مآل پہ افسوسناک ہو

"حرف سخت" تو خیر مگر پانچویں مصرعہ میں نثار ہونے کے مفہوم کو "ہلاک ہو" سے ادا کرنا، اور قاتل

کے مآل پر افسوس کرنے والے کو "افسوسناک" قرار دینا خدا جانے کونسا مستحسن پیرایۂ بیان اور انیس سے اونچا کمالِ فن ہے۔

گرمی کی فصل اور وہ سولہ پہر کی پیاس
حلقے پڑے تھے چشم میں، تھا رنگِ رخ اداس
خالی کٹورے لے کے بچے کھڑے تھے پاس
اب آئے گا اب آئے گا، پانی یہی تھی آس
ممکن تھی ایک بوند نہ منہ میں چوانے کو
پانی کہاں تھی آگ لگی تھی زمانے کو

جب زمانے کو آگ لگی تھی تو وہاں پانی کہاں سے آتا۔ ایسی حالت میں بچے خالی کٹورے لے لے کے کس کے پاس کھڑے تھے جبکہ نظر آ رہا تھا کہ منہ میں چوانے کو ایک بوند بھی نہ تھی۔ اس لئے بڑے تو شاید کھڑے رہ سکیں معصوم بچے خالی کٹورے لے لے کر کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کو ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنا چاہیئے تھا۔ قطع نظر اس کے پانچویں مصرعہ میں لفظ 'ممکن' شاعر کا مفہوم صحیح طور پر ادا نہیں کرتا۔ اس کی بجائے ایسا لفظ ہوتا جس سے 'موجودگی' کا مفہوم ادا ہوتا۔ مصرعہ کی ترکیب سست اور مطلب غیر واضح ہے۔

اگر کسی کو خیال ہو کہ شادؔ نے صداقت سے واقعہ نگاری کی ہے اور مبالغہ سے کام نہیں لیا اور اس لئے وہ انیس یا دبیر سے ممتاز مقام کے مستحق ہیں تو اسی رسالے کے صفحہ ۱۴۴ پر گھوڑے کی تعریف میں جو بند کہے گئے ہیں دوبارہ پڑھ لئے جائیں۔

اس درازنفسی سے شادؔ مرحوم کے فضل و کمال کا انکار مقصود نہیں۔ یقیناً مرحوم اچھے شاعر تھے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جن باکمالوں سے برابری یا برتری کا ان کو یا ان کے مداحوں کو دعویٰ تھا۔ وہ محض خوش خیالی اور خودستائی ہے، اور حالیؔ جیسے رفیع المنزلت مصنف کی تحریر میں پیوندکاری کا ادعا اسی خودبینی و خودستائی کا قابلِ افسوس اظہار ہے۔

مہر محمد خاں شہابؔ مالیر کوٹلوی
مقیم بمبئی

جامعہ میں مشاعرہ

دہلی میں ہر سال دہلی کلاتھ ملز کے اہتمام میں' بزم شنکر و شاد' کے عنوان سے ایک مشاعرہ ہوتا ہے جس میں ملک کے مشہور شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ بزم سخن ہند پاک مشاعرے کے نام سے منعقد ہوتی تھی، لیکن کئی برس سے اس میں پاکستان کے شعرا شریک نہیں ہو پاتے اور ان کی ہندوستان آنے اور یہاں کے شاعروں اور ادیبوں سے ملنے کی آرزو سیاسی پابندیوں کے ہاتھوں حسرت بن کے رہ جاتی ہے۔ دہلی کلاتھ ملز کے اس مشاعرہ کے بعد اس میں شریک ہونے والے شعرا کی ایک نشست جامعہ میں بھی ہوتی ہے، امسال ڈاکٹر سید عابد حسین کی صدارت میں جامعہ میں یہ نشست ۱۳ راپریل کو ہوئی، اس میں نازش پرتاب گڑھی، ملک زادہ منظور احمد، منظر سلیم، جگن ناتھ آزاد، والی آسی لکھنوی، مخمور سعیدی، کلیم عاجز، صبا افغانی، ہلال رضوی، بیکل اتساہی اور سلام مچھلی شہری نے شرکت کی، ہم ان حضرات کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر جامعہ کے اساتذہ اور طلبا کو اپنے کلام سے نوازا اور استفادہ کا موقع دیا۔ ذیل میں ہم ان نظموں اور غزلوں کے منتخب ٹکڑے اور اشعار نقل کرتے ہیں جو جامعہ کے اس مشاعرہ میں پڑھی گئیں۔

جگن ناتھ آزاد

مری رگوں میں تو میرے لہو کی گردش تھی
تمھارے پاس تھا کیا

ایک خوفِ جاں کے سوا
تمھیں یہ خوف تھا بزمِ طرب نہ لُٹ جائے
تمھیں یہ غم تھا کہ برہم نہ ہو وہ بزمِ نشاط
جو موجِ مئے پہ رواں ہے سیاہ راتوں میں
مجھے یہ ڈر تھا مِری آبرو پہ حرف نہ آئے
مجھے یہ ضد تھی کہ میرے وطن کی دھرتی پر
کسی عدو کے قدم کا کوئی نشاں نہ پڑے
مجھے یہ ضد تھی کہ میرے چمن پہ آنچ نہ آئے
چمن کے پھول اسی طرح مسکراتے رہیں
وطن کے کھیت اسی طرح لہلہاتے رہیں
یہ رودبار اسی طرح گیت گاتے رہیں

(نظم کا عنوان ــــ 'سپاہی')

سلام مچھلی شہری

خداوندانِ شہرِ زر میں انجانے بھی ہوتے ہیں
کرم گسترِ خردمندوں میں دیوانے بھی ہوتے ہیں
پُرانی دِلّی کا ہر خواب ہے مفلس کی انگڑائی
نئی دِلّی میں کیا کیجے پری خانے بھی ہوتے ہیں
یقیناً ابنِ آدم ہر فضا کو جیت لیتا ہے
مگر کچھ مسئلے دنیا کو سمجھانے بھی ہوتے ہیں
سلامؔ اس مصلحت کوشی سے اب بھی باز آجاؤ
کہ تاریخِ ادب کے سخت پیمانے بھی ہوتے ہیں

ش پرتاب گرمی

لفظ ہی پھول بھی ہے لفظ ہی زنجیر بھی ہے
لفظ ہی زخم بھی ہے لفظ ہی شمشیر بھی ہے
لفظ ہی خواب بھی ہے خواب کی تعبیر بھی ہے
اور لفظوں پہ رہا کرتی ہے دنیا کی نظر
لفظ کو جاننے والے ہی سمجھتے ہیں مگر
لفظ شبنم ہے نہ موتی ہے نہ پتھر ہے نہ آگ
لفظ کے سینۂ خالی میں نہ آہیں ہیں نہ راگ
لفظ میں نور سمو دو تو ستارا بن جائے
دل جو رکھ دو تو لبِ ناز کا بوسہ بن جائے
اور بارود جو بھر دو تو دھماکہ بن جائے
لفظ تو آج بھی انساں کی طرف تکتا ہے
لفظ کانٹا ہی نہیں پھول بھی بن سکتا ہے
لفظ ٹپکائے گا امرت لبِ گوتمؔ تو ملے
رقص فرما ہو مگر کوئی کنھیا تو ملے
منتظر ہے کسی چشتیؔ، کسی نانکؔ کے لئے
لفظ ہو جائے گا زندہ کوئی عیسیٰؑ تو اُٹھے
کوئی بنسی میں سمو لے تو یہ نغمہ ہو جائے
لفظ کو کرشن جو مل جائے تو گیتا ہو جائے

(نظم کا عنوان "لفظوں کا المیہ")

کلیم عاجز

غرض کسو سے نہ اے دوستو، کبھو رکھیو
بس اپنے ہاتھ یہاں اپنی آبرو رکھیو

زمانہ سنگ سہی، آئینہ کی خو رکھیو
جو دل میں رکھیو، وہی سب کے روبرو رکھیو

زبان درد بہت کم سمجھنے والے ہیں
یہاں نہ ہر کس و ناکس سے گفتگو رکھیو

اڑا نہ دیجیو سب غم کی رنگ رلیوں میں
بچا کے دل کے پیالے میں کچھ لہو رکھیو

ملک زادہ منظور احمد

دیدۂ عبرت سے پہلے تم مجھے دیکھا کرو
دوستو، پھر اس نگاہِ ناز کا چرچا کرو

گل گریباں چاک، غنچے مضمحل، بلبل اداس
ایسی تعبیروں سے اپنے خواب رسوا کرو

آج ہر لمحہ کے ہاتھوں میں ہے سنگِ بے حسی
اپنا غم کہنے سے پہلے دیر تک سوچا کرو

منظر سلیم

دریا ہیں پھر بھی ملتے نہیں مجھ سے یار لوگ
جرأت کہاں کہ صحرا سے ہوں ہمکنار لوگ

اب سایہ و ثمر کی توقع کہاں کرے
سوکھے ہوئے شجر ہیں سرِ رہگذار لوگ

اک دوسرے کا حال نہیں پوچھتا کوئی
اک دوسرے کی موت پہ ہیں شرمسار لوگ

سورج چڑھا تو پگھلی بہت چوٹیوں کی برف
آندھی چلی تو اکھڑے بہت سایہ دار لوگ

والی آسی لکھنوی

اب تمناؤں کی محفل نہ سجا دیوانے
لٹ چکا شہرِ وفا ہوش میں آ دیوانے

[illegible]

کب خدا جانے کسی بت کا گزر ہو جائے — دل کو دل رہنے دے کعبہ نہ بنا دیوانے

تنویر سعیدی

رُخ کبھی اپنا ہواؤں کو بدلنا بھی پڑا ہے — سر پھرا کوئی پرندہ جب ہواؤں سے لڑا ہے
جب وہ زندہ تھا تو اک چھوٹے سے قد کا آدمی تھا — آج چوراہے پہ جس کا دیو قامت بت کھڑا ہے
خوشنما تاج جو بخشا گیا ہے مجھ کو لیکن — کام میرے آ نہیں سکتا کہ میرا سر بڑا ہے

صبا افغانی

زندگی نکھر آئی غم کی بے پناہی سے — روشنی ملی دن کو رات کی سیاہی سے
مجھ کو بے گناہی کی کون سی سزا دو گے — ہر سزا لرزتی ہے میری بے گناہی سے

بیکل اتساہی

گیت کو روپ ترنم کو جوانی کہیے — لب و رخسار کو الفاظ و معانی کہیے
قاضیِ شہر کے فتوے میں یہی ہے تاکید — آج سے بادۂ گلرنگ کو پانی کہیے
قید یہ ہے کہ سرِ بزم رہیں ہونٹ سلے — حکم یہ ہے کہ ہر اک بات زبانی کہیے

ہلال رضوی

فکر کر شاعر، نہ ان کی شعر ہیں کمزور جو — دوستی ٹھہری تو دوزلی کون دیکھے شعر کو
واہ واہ تیری کروں میں تو مری کر واہ واہ — من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

ذاکر صاحب اپنے ساتھیوں کی نظر میں

(ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے انتقال کے بعد اردو میں ان پر دو کتابیں شائع ہوئی ہیں اور "اردو ادب" (علی گڑھ) کا ذاکر نمبر نکلا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ ذاکر صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر ان پر تبصرہ کروں گا مگر اس شمارے میں اتنی گنجائش نہیں نکل سکی کہ ان پر تفصیل سے اظہار خیال کیا جاسکے، اس لیے اس کی جگہ پیش نظر مضمون مرتب کرکے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس وقت صرف "اردو ادب" کا ذاکر نمبر پیش نظر ہے، اس لیے مرحوم کے دو عزیز ساتھیوں، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی رائیں اور خیالات نہیں پیش کئے جا رہے ہیں، جن کے مضامین حسب ترتیب ماہنامہ جامعہ اور سہ ماہی اسلام اور عصر جدید میں شائع ہوئے ہیں۔ لطیف اعظمی)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ذاکر صاحب کا انتقال ہوگیا۔ کتنی مختصر خبر لیکن کتنا بڑا حادثہ، ان تمام لوگوں کے لئے جو اچھے شخص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے ہیں، تین دن تک مسلسل دہلی میں جو کچھ دیکھنے میں آیا اس سے اندازہ ہوا کہ آج بھی لاتعداد ایسے لوگ ہیں جو اچھے اشخاص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے اور چاہتے ہیں۔ موت اور زیست ہر متنفس کے لیے تقدیر ہے، لیکن ان کا شرف کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کی زندگی اور مرگ دونوں باشرف تھے، اس لیے کہ ان کے دونوں ایک دوسرے سے مشرف تھے....

باایں ہمہ ذاکر صاحب شروع سے آخر تک کبھی بھی رہن سہن، شکل صورت، وضع قطع، میل جول، ہنسنے بولنے، رزم و بزم، تفریح و تفنن کے اعتبار سے دور دور تک عابد و زاہد یا صاحب سنت نہ تھے بلکہ جن کے بغیر ہر محفل سونی ہوتی، جہاں ہوتے اس کی رونق و اہمیت کئی گونہ بڑھ جاتی، اجتماع کیسا

ہی ہر مہمان خصوصی کوئی ہو، سب کی نظر ذاکر صاحب ہی پر پڑتی، ان کی موجودگی سے مجلس کا ٹون صحت مند، خوشگوار اور بلند ہو جاتا۔ ذہانت شخصیت اور انسانیت میں سب ان کو اپنے سے بلند و بہتر سمجھتے تھے، ان کے معاصرین خواہ شناسا ہوں یا اجنبی کسی جولانگاہ میں ذاکر صاحب کو رشک و رقابت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، وہ ہر ایک کے محبوب و محترم تھے، ہر شخص ان کی خوبیوں کا خوشی اور فخر سے اعتراف کرتا۔۔۔

ذاکر صاحب ہر شخص کو عزت و محبت کا مستحق سمجھتے تھے، طالب علمی کی زندگی سے لیکر آخری جدائی تک انھوں نے بھولے سے بھی کسی موقع پر اپنی برتری نہیں جتائی، پردہ داری اور پردہ پوشی، عفو و درگذر، ان کی سیرت کا بڑا نمایاں اور قیمتی جوہر تھا، کسی موضوع پر بحث ہوتی، اس میں تحمل، توازن اور خوش دلی ملتی، گفتگو سہل اور سادہ ہوتی ہوئی پر معنی، فکر انگیز اور پر معنی اور فکر انگیز ہوتے ہوئے سہل اور سادہ ہوتی۔۔۔ کوئی مناقشہ ہوتا تو صلح صفائی کرانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، فریقین کتنے ہی ضدی اور غیر ذمہ دار کیوں نہ ہوتے، ذاکر صاحب کو حکم بنائے جانے پر بلا تامل راضی ہو جاتے۔ اس کی بڑی اچھی مثالیں ان کی صدارت میں راجیہ سبھا کے اجلاس میں ملتی تھیں۔ ان کی وفات پر سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے جو ہدیۂ عقیدت پیش کیے، ان میں ایک ممتاز کمیونسٹ ممبر کا یہ کہنا کہ ذاکر صاحب اپنی صدارت میں اپوزیشن کے تحفظ کو بھی ملحوظ رکھتے تھے بڑا تاریخی اور قابل فخر فقرہ ہے، شاید کسی اپوزیشن نے دنیا کے کسی سیاسی ادارے کے اعزاز میں ایسا ہدیہ نہیں پیش کیا ہوگا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ذاکر صاحب کے تصفیہ پر کسی نے بد دلی یا اپنے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کیا ہو۔ وہ دانشمندی اور قطعًا غیر جانبدار ہو کر تصفیہ کرانے کی کوشش کرتے تھے۔۔۔

ذاکر صاحب میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو کسی درماندہ، متشکک یا برہم و بیزار کو طمانیت خاطر سے بہرہ اندوز کر سکتی تھیں، وہ آرٹ اور علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے، سیرت کی بلندی، پختگی اور پاکیزگی کے لحاظ سے معتبر و محبوب تھے۔ ان میں مذہب کا جو خصوصی احترام ملتا

تھا، وہ کچھ تو خاندان سے ورثہ میں آیا تھا، کچھ بزرگوں کے فیض سے اور بہت کچھ انھوں نے اپنے کو تربیت دے کر حاصل کیا تھا۔ اس تربیتِ نفس کے لیے انھوں نے کتنا ریاض کیا ہوگا اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہ صرف اس منزل سے گذر رہے ہیں بلکہ مسلسل گذرتے رہتے ہیں، وہ صوفی اور آرٹسٹ دونوں تھے، اسکالر بھی تھے عارف بھی ....

خواجہ غلام السیدین

میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کو ہر حالت، ہر رنگ، ہر مقام پر خالص سونا ہی سونا پایا ہو اور کہیں کھوٹ نظر نہ آیا ہو۔ لیکن جب قدرت کسی کو اپنی فیاضی سے مالا مال کرتی ہے (اور بہت بخل کرتی ہے قدرت ایسا کرنے میں) تو پھر اس کی بخشش کی انتہا نہیں رہتی۔ کیا کیا نہیں دیا اس نے ذاکر حسین کو؟ ایسا جمال صورت جو لاکھوں میں ایک آدھ کو نصیب ہوتا ہے، ایسا جمال سیرت جو کروڑوں میں ایک آدھ کے حصے میں آتا ہے، ایسا روشن دماغ جو ہر مسئلے کی تہہ کو پہنچ جاتا، ہر پیچیدہ صورت حال میں سے مغز نکال لیتا اور ہڈیوں کو کتوں کے لیے چھوڑ دیتا، ایسا قلب گداز جس میں عالم انسانیت کے لیے سمائی تھی، جو ہر کسی کی بھلائی چاہتا تھا، کسی کی برائی نہ صرف چاہتا نہ تھا بلکہ ایسا سوچ بھی نہ سکتا تھا، جو ان لوگوں کے ساتھ بھی شفقت اور پردہ پوشی کا سلوک کرتا تھا جنھوں نے اسی کے ساتھ برائی کی ہو، گفتگو میں وہ کشش کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، تقریریں وہ روانی اور برجستگی، وہ سوز و ساز کہ لفظ دل سے نکلتا تھا اور بجلی کی طرح دل پر گرتا تھا، تحریر میں وہ سادگی اور پرکاری اور خلوص کا وہ بے پناہ جوش جو ہر پڑھنے والے کو اپیل کرتا تھا اور ان سب پر مستزاد وہ لطیف لیکن موثر ذوق ظرافت جو ہر قسم کے عناد اور دل آزاری سے پاک تھا اور جس کا شکار بڑی خوبصورتی کے ساتھ کبھی دوسرے لوگ اور اکثر خود ان کی ذات ہوتی تھی۔ وہ یا تو ہر بات میں ایک نئی بات پیدا کرتے اور اپنی طباعی کا ثبوت دیتے یا اگر پرانی بات بھی ہوتی تو اس کو ایک

نئے انداز میں بیان کرتے کہ اس میں نئی جان پڑ جاتی۔ ان کے دماغ میں ماضی حال اور مستقبل، مذہب اور سائنس، فلسفہ اور معاشیات، قوم کی فکر اور انسانیت کا غم، جمالی دلچسپیاں اور حسن عمل کا شیوہ، سب اچھے پڑوسیوں کی طرح پہلو بہ پہلو رہتے تھے انھوں نے نہ فکرِ عاشر سے مرعوب ہو کر کبھی مذہب کو بھلایا (مجھے بتایا گیا کہ رمضان شریف میں وہ ایک دن میں پندرہ پندرہ سپارے پڑھتے تھے اور اکثر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں رہتے تھے) نہ مذہب کی تنگ نظر تعبیر کر کے اس کو حالات حاضرہ سے بے تعلق سمجھا۔ ان کا کہنا تھا کہ زندگی ایک وحدت ہے اور اس کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہیئے۔ لیکن کیا انھیں معلوم تھا کہ اس وحدت کو دیکھنے کے لیے ذاکر حسین کی نظر کی ضرورت ہے؟ ہر نظر اس وحدت کو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ تو اس کے بے شمار پہلوؤں میں سے اپنے چند لپسندیدہ اور مفید مطلب پہلو ہی دیکھ سکتی ہے۔ ان کے نزدیک ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی، سفید و سیاہ سب برابر تھے کیونکہ ایک ہی خدا کے بندے تھے۔ یاد ہوگا کہ انھوں نے صدر ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ ہندوستان میرا گھر ہے اور اس میں رہنے والے میرے خاندان کے لوگ۔ ان کے لیے یہ کوئی خطیبانہ دعویٰ نہ تھا بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی جو ان کے ہر قول اور فعل سے نمایاں تھی اور وہ اس کنبہ کو صدر ہونے سے برسوں پہلے اپنا چکے تھے!

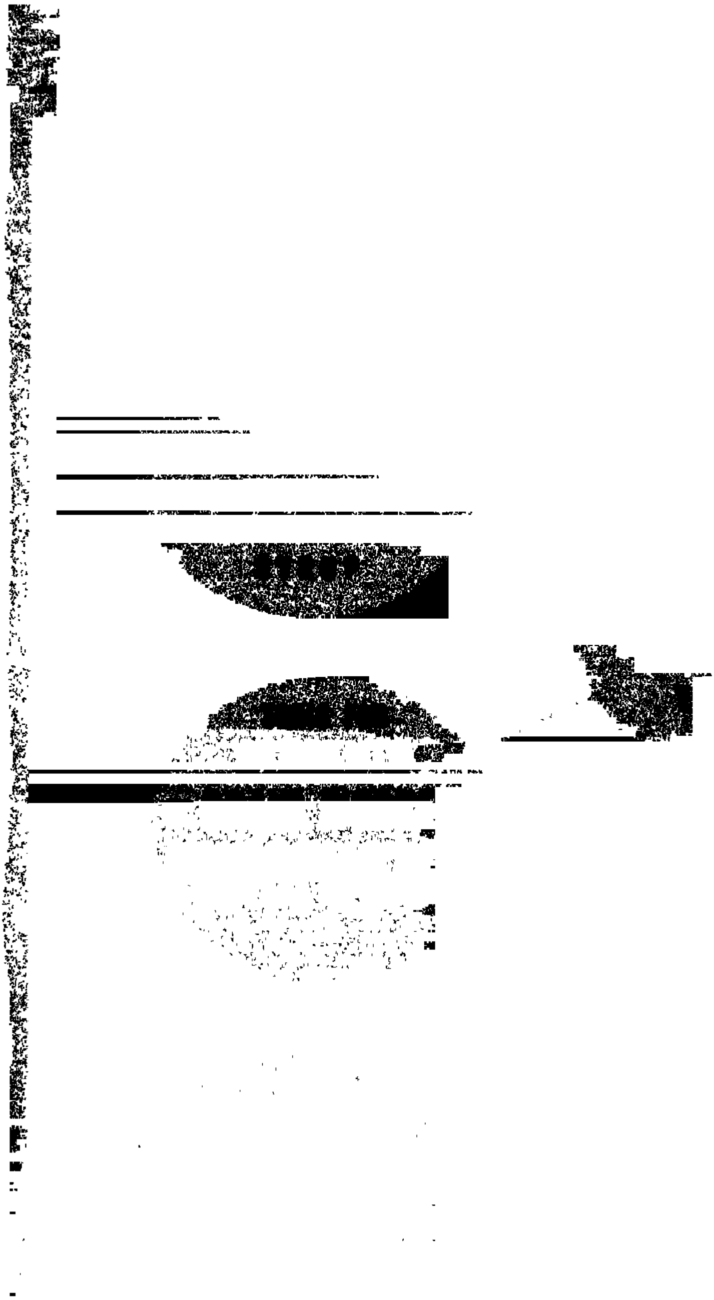
پروفیسر آل احمد سرور

ذاکر صاحب دو سال سے کم ہی صدر رہے، مگر اس زمانے میں بھی انھوں نے صدر کے عہدے کی شان اور بڑھا دی۔ ان کے پیش رو کوئی معمولی آدمی نہ تھے، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس عہدے کو خاصا وزن و وقار عطا کیا تھا۔ ذاکر صاحب نے صدر ہونے کے بعد کہا تھا کہ ان کا انتخاب ایک معلم کی خدمات کا اعتراف ہے، واقعی وہ ساری عمر ایک معلم رہے، انھوں نے طالب علموں کو افکار و اقدار اور کردار کی دولت سے مالا مال کیا، انھوں نے

استادوں کو علم کی لگن اور خدمت کی دُھن دی، انھوں نے سیاست والوں کو اخلاق سکھایا، انھوں نے عوام کو محنت اور خدمت کی تلقین کی، انھوں نے اپنے عمل سے دکھادیا کہ وطن کی محبت اور قوم کے دکھ درد میں شرکت اور سماج کی فلاح کے لیے جدو جہد کس طرح بالآخر سب کے دلوں کو موہ لیتی ہے، خادم کس طرح مخدوم بنتا ہے، عاشق کیوں محبوب ہوتا ہے، عارف کیوں رہ نما مان لیا جاتا ہے۔ وہ بڑے اچھے مسلمان تھے، مگر ان کا اسلام سکڑا سہما، اپنے خول میں بند، تازہ ہواؤں اور نئے خیالات سے خائف اسلام نہ تھا، یہ اپنے ایمان میں مضبوط، اپنے عقائد میں پختہ، اپنی خصوصیات پر مضبوطی سے جما ہوا اسلام تھا۔ جو سب کے لیے اور سب کا تھا۔ یہ اسلام اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے بجائے دنیا میں اسلامی اقدار اور اسلامی کردار کے اثرات کو عام کرنے والا اسلام تھا، اس میں تمام مذاہب کا احترام تھا۔ ...

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے انجام سے ان کا آغاز زیادہ شاندار تھا، وہ ان کے خدمت کے دور کو دیکھتے ہیں، ان کے حکومت کے دور کو نظر انداز کر دیتے ہیں، حالانکہ، دونوں میں ایک وحدت ہے۔ ذاکر صاحب کی طرح جو بھی ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کرے، قوم اسے سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ صدارت ان کی زندگی کی تکمیل کرتی ہے، بذاتِ خود اس کی اہمیت نہیں، یہ صرف اس بات کی علامت ہے کہ خلوص اور خدمت بالآخر اپنا رنگ دکھاتے ہیں اور محبوبیت و مقبولیت کے جو مظاہر ہیں ان میں ایک ہندوستان کے پہلے شہری کے عہدے کا بھی ہے۔

ذاکر صاحب تمام ہندوستانیوں کے لئے عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خصوصاً جینے کا ایک ڈھنگ اور عاشقی کے کچھ آداب دے گئے ہیں۔ انھیں برتنا ہی ان کی گراں قدر خدمات کا سب سے اچھا اور سچا اعتراف ہوگا۔ کاش ہم اس کا ثبوت دے سکیں۔



جائزے

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سالانہ چندہ چھ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد ۶۱ | بابت ماہ جون ۱۹۷۰ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

خط وکتابت کا پتہ :

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون :

اڈیٹر : ۷۴۲۵۸

منیجر : ۷۴۴۷۰

طابع و ناشر : عبداللطیف اعظمی
مطبوعہ : یونین پریس دہلی
ٹائیٹل : دیال پریس دہلی

شذرات

ذاکر صاحب کی لکھی ہوئی کہانی یا تمثیل، یا کہانی اور تمثیل اسے دونوں کہیے، کچھوا اور خرگوش چھپ کر بازار میں آگئی ہے، اسے شائع کیا ہے حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی امداد سے نیشنل بک ٹرسٹ نے، اور چھپی ہے مکتبہ جامعہ کے زیر اہتمام اس کے اپنے لبرٹی آرٹ پریس میں، کتابت وطباعت دیدہ زیب، تصویریں دلفریب، کاغذ اچھا، صحت کتابت کا خاص اہتمام، قیمت برائے نام (مجلد، دو روپے اور غیر مجلد، ایک روپیہ)، ذاکر صاحب ہوتے اور اسے دیکھتے تو خوش ہوتے اور ہم لوگوں کا دل بھی بڑھتا، مگر افسوس، آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

کچھوا اور خرگوش، یہ کہانی بہت پرانی ہے، اور اس سے یہ سبق سکھانا مقصود رہا ہے کہ اگر راستہ چلنے والے میں عزم و حوصلہ اور صبر و استقامت ہے، دھن اور لگن ہے، محنت مشقت کی عادت اور انکسار اور مسکنت ہے، تو ہزار دشواریوں کے باوجود راستہ طے ہو ہی جاتا ہے، راہی اپنی منزل پا ہی لیتا ہے۔ جامعہ ملیہ کی کہانی اور ذاکر صاحب کی زندگی بھی کچھ ایسے ہی راہی جیسی رہی ہے، اس کہانی میں شروع کے تین صفحے اسی حقیقت کی نشان دہی کے لئے وقف ہیں اور آخر میں ایک بلیغ جملہ اسی کی طرف اشارہ ہے "... بہرحال کوئی چلتا رہے، چاہے کتنا ہی آہستہ، تو فاصلہ طے ہو ہی جاتا ہے۔" اس راہ میں غفلت، خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو،

بڑی ہی ہلاکت، مایوسی اور محرومی کی منزل ہوتی ہے، بس کام آتی ہے تو ہر وقت کے نصب العین کی سرشاری، ایک بے نام دیوانگی اور سرمستی، یہ وہ بے خودی ہے جس پر ہزار ہشیاریاں نثار، یہ وہ سرمستی ہے جس پر لاکھوں ہوشمندیاں فدا،

ذاکر صاحب کی اس کہانی میں ایک دوسری حقیقت بھی بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ کہ اکثر بہت سیدھی بات، معمولی بات، ہمارے عالموں کی سمجھ میں کہ ان کا علم محض کتابی ہوتا ہے، سمجھ میں نہیں آتی اور نہ وہ اسے سیدھے سادے لفظوں میں سمجھا سکتے ہیں، یہ لوگ علم کی شان یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی عالم بالا میں رہے اور اتر کر کبھی زمین پر نہ آئے، ایک ان پڑھ، گنوار سے بھی بات کرے تو علم کی شان ملحوظ خاطر رہے اور انھیں اصطلاحوں، تشبیہوں اور استعاروں میں گفتگو کرے جن سے کہ ان کے نزدیک علم کا بھرم قائم رہے، علم کی دنیا میں جب سے تخصص کی وبا پھیلی ہے، یہ مرض عام ہے کہ ایک مضمون بلکہ ایک مضمون کی کسی خاص شاخ کا عالم اپنے مضمون کے سوا اور کسی مضمون یا اپنے مضمون کی کسی اور شاخ سے کوئی... واقفیت نہیں رکھتا، اور زندگی کی بہت ہی سادہ حقیقتوں کے سامنے اکثر اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے خاص اسلوب میں، طنز و مزاح کے لطیف چھینٹوں سے، ایسے عالموں کے 'بار گراں' پر ایک طرح سے اظہار تاسف کیا ہے، اس کہانی کے ایک کردار پروفیسر کپاچاق ہیں، وہ تاریخ کے عالم و ماہر ہیں، مولوی غفران جو دینیات کے عالم ہیں، ان سے اوکھلے میں جمنا کے کنارے ایک بوڑھے کچھوے نے یہ سوال کیا تھا کہ "ملا جی، آپ کی اتہاس کی پستکوں میں کیا لکھا ہے؟ کہیں یہ لکھا ہے کہ پراچین کال میں کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی تھی اور بھلا کیا لکھا ہے کہ کون جیتا تھا؟" مولانا غفران اس کا جواب نہ دے سکے، مشکل یہ تھی کہ اس سوال کا تعلق "تاریخ قدیم" سے تھا اور ان کا میدان تھا دینیات اور الہیات۔ اس میں کہتے ہیں، خرگوش اور کچھوے کا کیا کام؟ اس لیے انھیں کچھوے سے کہنا پڑا کہ وہ کل اپنے ساتھ تاریخ کے پروفیسر کو لائیں گے، شاید وہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔

تاریخ کے ماہر پروفیسر کچاچاق کی ملاقات جب کچھوے سے ہوئی اور اس نے ان کے سامنے بنادہی سوال رکھا تو ان کی طبیعت بہت منغض ہوئی اور وہ سخت ناخوش ہوئے، بولے "حضرت کچھوے اور خرگوش سے میرے فن کو کیا علاقہ۔ میں تو تاریخ کا استاد ہوں۔ اقوام و ملل کے عروج و زوال کے علل مسلسل پر تفکر و تفقہ میرا کام ہے۔ توانائے دولت آفریں کی مخصوص اشکال کے تقاضوں کا تفحص اور ہیئت اجتماعیۂ انسانیہ پر ان کے اثرات کی توضیح، معاشرے میں طبقات ناشی کے تصادم کے ناگزیر عواقب و نتائج کی تشریح، محرکاتِ انقلابی کے ظہور و بلوغ کے اسرار و غامض کو تحقیق و عقیدے کے آمیزے سے قابل فہم بنانا، استعمار و استحصال کے داخلی تضادوں کی روشن بصیرت اور ان عفریتوں کے مفتوح و معدوم ہونے پر انسانیت کی حقیقی تاریخ کا ایک عقلی و معروضی نقشہ مرتب کرنا، یوں کہ ماضی سے مستقبل منطقی لزوم کے ساتھ مستخرج ہو، یہ میرا کام ہے۔ یہ کچھوے اور خرگوش سے متعلق استفسار آپ نے مجھ سے خوب فرمایا" ——— "کچھوے بیچارے کا سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا" ——— یہی معاملہ ادب اور تاریخ ادب کے پروفیسر ڈاکٹر فی الفور اور منطق و فلسفہ کے استاذ الفیلسوف الہندی کے ساتھ بھی پیش آیا اور ان حضرات نے اپنے اپنے مضمون کے تمام لزوم علمی کے ساتھ کچھوے سے گفتگو کی، اس دوران مولوی غفران ترجمان کے فرائض انجام دیتے رہے، الفیلسوف الہندی کی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی استدلال کا یہ نتیجہ نکلا کہ اگر چند شرائط کے ساتھ کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہو تو اس کا قوی امکان ہے کہ کچھوے کی جیت ہو جائے، لیکن چلتے چلتے انھوں نے شرائط کی پابندی پر بہت زور دیا اور کہا کہ "شرط بھول جائیں گے تو سب نقشہ ختم۔ "إذا فات الشرط فات المشروط۔" بالآخر بوڑھے کچھوے اور نوجوان خرگوش جو اکثر میاں کچھوے سے شوخیاں کرتا تھا، دونوں کی دوڑ ہوئی۔ اور یہاں سے یہ دلچسپ طربیہ ایک المیہ میں بدل جاتا ہے، خرگوش منزل مقصود پر پہونچنے سے پہلے ایک شکاری کے ہاتھوں زخمی ہو جاتا ہے جس کا مالک اُسے پکڑ کر ذبح کر ڈالتا ہے۔ کچھوے پر اس المناک انجام کا ایک خاص اثر مرتب ہوتا ہے۔

کہنے کو تو یہ ایک مختصر سی کہانی ہے، مگر اسے مصنف نے بڑی توجہ اور دیدہ ریزی سے لکھا ہے اور بڑے بلیغ جملوں میں زندگی کی کئی حقیقتوں کو اجاگر کیا ہے، یہی بلیغ جملے درحقیقت اس کی جان ہیں۔ بلاشبہ ہم اسے ذاکر صاحب کا کارنامہ کہہ سکتے ہیں، مثلاً چند جملوں میں بڑی خوبصورتی سے یہ بیان کر دیا ہے کہ زبانوں کے فرق کے باوجود انسانوں میں میل جول اور باہمی تعلق و ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مولوی عفران اور کچھوا شروع میں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے، مولوی صاحب مشکل اُردو بولتے ہیں اور کچھوا ٹھیٹھ ہندی، لیکن ذاکر صاحب کچھوے کی زبان سے ایک اہم تاریخی صداقت اور زندگی کی ایک سچی حقیقت بیان کراتے ہیں ــــ کچھوے نے کہا "سوال اتھوا پرشن۔ جواب اتھوا اُتّر۔ مطلب، سو یہ شبد ہم نے اپنے پرکھوں سے سن رکھا ہے۔ جب جمنا ندی ادھر نیلوی کیمری کے پاس بہتی تھی اور بڑے بڑے مسلمان سنت وہاں سورج نکلنے سے پہلے آکر منہ ہاتھ دھوتے کلّا کرتے تھے، ان کی باتیں ہمارے پُرکھے سُنا کرتے تھے۔ اس میں سے کچھ شبد یاد رہ گئے تھے۔ سو مطلب' تو ہم جانتے ہیں۔ مطلب اتھوا ارتھ۔ ہاں اور لُگت اتھوا شبد کوش جس میں شبدوں کا ارتھ لکھا ہوتا ہے۔ سمجھے، ہم سمجھ گئے۔

"اچھا ہوا آپ سمجھ گئے، مگر کل لغت یا آپ کا شبد کوش لاؤں گا تو آپ سے باتیں ہوں گی" ملاجی نے کہا۔

"نہیں نہیں" کچھوا بولا "ایسی بھی کیا بات ہے۔ دیکھیے تھوڑے سے سمے میں ہم نے ایک دوسرے کے کتنے شبد جان لیے۔ بات چلے گی تو میں آپ کا مطلب سمجھ لوں گا۔ میرے شبدوں کا ارتھ آپ سمجھ لیں گے۔"

ڈاکٹر فی الغور نے جو ادب کے امین اور تاریخ ادب کے رازداں ہیں، اپنی تقریروں کے دوران تخلیق ادب، شاعری، تنقید و تحقیق، سب پر روشنی ڈالی ہے، اس طرح ذاکر صاحب نے بڑے حسین پیرائے میں اس فن کے مدعیوں پر بھرپور طنز کیے ہیں اور اپنے تخلیقی ذہن اور بے پناہ

ادبی صلاحیت کا ایک نادر نمونہ پیش کیا ہے، نوٹس کے سہارے یونیورسٹیوں کے پروفیسر جنھیں اکثر قبض کی شکایت رہتی ہے، اپنے لکچرز میں کیا کیا گل کھلاتے ہیں، اس کی عکاسی بھی بڑے لطیف او دلآویز انداز میں ملتی ہے (ڈاکٹر بی الفود اپنے سارے نوٹس لے کر کچھوے سے نبرد آز ہونے گئے تھے۔) تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے اہل سیاست واہل صحافت اور بدمزاج شا اور ادیب، ہفتے میں ایک بار نہانے والے مسلمان، 'ع' کو حرف حلق کے صحیح مخرج سے نکالنے والے مولوی ملاّ، سب کے متعلق کچھ نہ کچھ اس میں ہے اور اس طرح ہے کہ چند جملے ہی، چند کنایے ہی، پوری تصویر سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ کہانی یا تمثیل ایک مرصع غزل ہے جس کا ہر مصرع، ہر ٹکڑا اپنے اندر اسرار و معانی کا ایک دفتر رکھتا ہے اور بیدار مغز انسانوں کے لئے زندگی کی وہ بصیرتیں جنھیں اگر برتا جائے تو یہ دنیا بہت حسین بن جائے۔

اور آخر میں خرگوش کے حسرتناک اور المناک انجام پر کچھوے کا جو حال ہوتا ہے، جس طرح اس کے دل و دماغ کی دنیا دگرگوں ہو کر رہ جاتی ہے اور جو خیالات اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، وہ پڑھنے والے کے دل پر نہ مٹنے والے نقش چھوڑ جاتے ہیں، یہ حصہ پڑھنے کے لائق، بار بار پڑھنے کے لائق ہے، ندامت اور پچھتاوے کا ایک اتھاہ احساس ہے جو کچھوے کو گھیر لیتا ہے، دنیا اسے سنسان نظر آتی ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ تھکا ہوا معلو ہوتا ہے جتنا کہ وہ دوڑ میں تھکا تھا، وہ سوچتا ہے کہ یہ اسے کیا سوجھی تھی کہ دل میں صدیوں کا غبار لئے اُس نے اس کم سن، رنگیلے چھبیلے خرگوش کو دوڑ پر اکسایا، اس کے تو ابھی جینے کے دن تھے، کچھ ہونا تھا تو اُسے ہو جاتا۔ اس سے بڑی بھول ہوئی، یہ تو بڑی ہتیا ہوئی، اتنی عمر پاکر بھی وہ اتنا نہ سمجھ سکا کہ سنسار میں ہر جاندار کی اپنی اہمیت ہے، ہر جاندار کی دنیا الگ ہے، ایک کے لئے جو چیز اہمیت کی ہے دوسرے کے لئے اس میں کوئی خصوصیت نہیں، کچھوے کا جما ہوا، ... خرگوش کا ... اور ... سہاگ نہیں سکتے تو وہ مرنے والا ہو بھی تو پانی میں نہیں

تیر سکتا تھا، کسی کو کچھ ملا ہے، کسی کو کچھ اور، کسی کا کچھ کرتو ہے، کسی کا کچھ۔ سب اپنا اپنا کرتو پورا کریں تو اس میں ایشور کی مرضی پوری ہوتی ہے۔ اس مرضی کو جاننا پہچاننا اور اس کے سامنے گردن جھکانا ہی جیون کا انس ہے۔ یہی دھرم ہے، یہی ستیہ ہے، یہی آنند ہے، یہی موکش ہے۔ یہ جان پہچان، یہ گردن جھکانا ہر ایک کا اپنے اپنے رنگ میں ہوتا ہے۔ اپنی پہچان کو دوسرے کی پہچان سے ناپنا اپنے گردن کو جھکانے کے ڈھنگ کو دوسرے کے جھکاؤ سے ٹکرانا، دوسرے کے کرتو کو اپنے کرتو کا ترازو بنانا، یہ سب بھول ہے، بڑی بھول ہے، بڑی بھول ہے، اور ہم سے یہی بھول ہوئی۔" نوجوان خرگوش کی بے وقت کی موت کا غم، اور جن حالات میں یہ موت ہوئی خاص طور سے اس کا غم، وہ بوجھ تھا جو اب کچھوے کا عمر بھر کا بوجھ بن گیا تھا، کوئی نہیں تھا جس سے کچھ کہہ کر اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتا، مگر کہنے سے دکھ مدھم ہی تو ہوتا ہے، جاتا تو نہیں۔۔۔
۔۔۔۔ یہاں بھی ذاکر صاحب کی شخصیت (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو انوار سے بھر دیں) کے اندر جو معلم تھا وہ پورے طور پر بیدار رہا، اس میں ایک پیغام ہے جو وہ چھوڑ گئے ہیں کاش ہم سب کو، سارے ملک والوں کو یہ توفیق ہو کہ اس پر عمل کریں۔

پروفیسر محمد مجیب

اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام

(۲)

پہلا سوال جو ہر مسلمان کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک عالمی مذہب سمجھتا ہے یا صرف ان لوگوں کا مذہب جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ دینیات کی رو سے جس کی سند قرآن میں ملتی ہے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دین کی تعلیم پیغمبروں کے ذریعہ ساری نوع انسانی کو دی گئی ہے اور پیغمبروں میں سے بعض ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نام سے کیا گیا ہے اور ایسے بھی ہیں جن کے ناموں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، لیکن وہ لوگ جنھیں اس دین حقیقی کی تعلیم دی گئی، اس سے ہٹ گئے اور اس سلسلے میں قرآن میں یہودیوں اور نصرانیوں کے دین سے ہٹ جانے کا خاص طور سے ذکر ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ رہا ہے کہ وہ صحیح راستہ پر ہیں اور بعض عالموں نے تو اس کی ضمانت لی ہے کہ جس نے کلمہ پڑھ لیا، اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور وہ جنت میں جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شک بھی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے بعض فرقے صحیح راہ پر نہیں ہیں اور عوام میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے عقائد میں نامناسب باتیں شامل ہو گئی ہیں، اس لیے کہ انھیں پوری طرح سے ہدایت نہیں ملی۔ ویسے بھی مسلمان اگرچہ اپنے دین پر فخر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح راہ پر ہیں، پھر بھی بھول جاتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی مومنوں اور مسلمانوں کا ذکر ہے، وہاں سچے دل سے ایمان لانے اور نیک عمل کرنے کی شرطیں بھی لگائی گئی ہیں، وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب

یعنی یہودیوں اور نصرانیوں میں بھی مومن ہیں[1]۔ لیکن مومنوں کی جماعت سے ان لوگوں کو خارج کر دینے کے میلان کی وجہ سے جن کا ایمان درست نہیں ہے، مسلمانوں کے خیال میں اسلام کے عالمی مذہب ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک اسلام ایک عالمی ہدایت ہے، جو رب العالمین کے ذریعہ تمام انسانوں تک پہنچی ہے اور جیسا کہ قرآن اپنے بارے میں کہتا ہے:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

(سورہ آل عمران (۳) آیت ۱۳۸)

یہ لوگوں کے لیے ایک بیان ہے اور ان لوگوں کے لیے جو متقی ہیں، ہدایت اور موعظت ہے۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

اور اس آیت کا اشارہ کہ:

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ

(سورۃ الانبیاء (۲۱) آیت ۳۵)

اور ہم تمہیں اچھی بری حالتوں کی آزمائش میں ڈالتے ہیں تاکہ تمہارے لئے آزمائشیں ہوں اور پھر تم سب کو ہماری طرف لوٹنا ہے۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

تمام نوع انسانی کی طرف ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

---

[1] لَيْسُوْا سَوَاءً ۗ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝

(سورہ آل عمران (۳) آیت ۱۱۳)

یہ بات نہیں ہے کہ تمام اہل کتاب ایک ہی طرح کے ہوں، ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو راہِ ہدایت پر قائم ہیں، وہ راتوں کو اٹھ کر خدا کی آیتیں تلاوت کرتے اور اس کے حضور سر بسجود ہوتے ہیں۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

اگر اسلام ایک عالمی مذہب ہے اور انسانوں یعنی مسلموں اور غیر مسلموں میں ایسے لوگ تھے جو ایک خدا اور اس کی ہدایت پر دل سے ایمان لائے، ایسے جو خالی زبان سے ایمان لائے اور ایسے بھی جو ایمان لائے ہی نہیں تو ہمیں تمام مسائل پر صرف تاریخ اسلام کے پس منظر میں نہیں بلکہ تاریخ عالم کے پس منظر میں غور کرنا چاہیے۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ انسان کے ضمیر نے تمام قوموں میں اور تمام حالات میں کس طرح اپنا اثر دکھایا ہے، قرآن کی اُس آیت کی روشنی میں، جس میں انسان کی حیثیت کا ذکر ہے اور ان آیات کی جہاں یہ حکم دیا گیا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ

(سورۂ مائدہ (۵) آیت (۸)

اے ایمان لانے والو! ایسے ہوجاؤ کہ خدا کے لیے مضبوطی سے قائم رہنے والے اور انصاف کے لیے گواہی دینے والے ہو۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(سورہ آل عمران (۳) آیت ۱۰۴)

اور دیکھو، ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی طرف دعوت دینے والی ہو، وہ نیکی کا حکم دے، برائی سے روکے۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

ہمیں تمام مذہبوں کی تاریخ، ان کے عقائد اور رسوم کا مطالعہ کرنا چاہیئے، یہ دیکھنے کے لیے نہیں کہ وہ کہاں پر صحیح راستے سے ہٹ گئے ہیں، اس لیے کہ اس کا فیصلہ صرف خدا ہی کر سکتا ہے، بلکہ یہ دیکھنے کے لیے کہ اصلیت میں وہ انسان کے بنیادی دین سے کس قدر قریب ہیں اور ہمارا مطالعہ مذہبی عقائد اور رسوم تک محدود نہیں ہونا چاہیئے، ہمیں ایسے لوگوں کی زندگی اور خیالات کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے کہ جنھوں نے سقراط کی طرح "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی مثالیں قائم کیں، خیالات کا ایسا تجزیہ کیا جس سے جہالت اور ریاکاری کی شکلیں سامنے آگئیں، اس حوصلے اور ہمت کا نمونہ پیش کیا جو انصاف پر مبنی جماعتی زندگی قائم کرنا چاہتا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ

کے سلسلے میں وہ تمام نقصان اٹھایا، جس کے لیے ہر سچے مسلمان کو تیار رہنا چاہیئے۔ ہمیں ہر جگہ نظر ڈالنا چاہیئے یہ دیکھنے کے لیے کہ جن اسلامی قدروں کو ہم مانتے ہیں وہ کب اور کس طرح عملی شکل میں نمودار ہوئیں اور ہمیں اپنی جانچ اتنی ہی سختی سے کرنا چاہیئے، جتنی سختی سے ہم دوسروں کی کرتے ہیں، اس لیے کہ اس کے بغیر ہمارا دعویٰ کہ ہم ایمان لائے ہیں کسی غیر جانبدار مواخذے کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس آیت کا حوالہ میں دے چکا ہوں کہ "یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ" اسی آیت میں آگے کہا گیا ہے:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ٥	اور ایک، قوم کی دشمنی کے باعث، عدل نہ چھوڑو، عدل کرو، یہی بات لگتی ہے تقویٰ سے۔

(سورۂ مائدہ (۵) آیت ۱۱) (ترجمہ: شاہ عبدالقادر مرحوم)

مسلمانوں کی دوسری قوموں سے دوستی بھی رہی ہے اور دشمنی بھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں نے ایک دوسرے کے بارے جو باتیں کہی ہیں، ان کی وجہ سے ہم میں ایسا تعصب پیدا ہو سکتا ہے کہ ہمیں دوسروں میں کوئی اچھی بات نظر نہ آئے اور اپنی ہر بات اچھی معلوم ہو۔ ہندوستان میں مسلمان اور ہندو صدیوں تک ساتھ رہے اور تاریخ میں جو کچھ ہوا ہے، اس کے بارے میں غیر جانبداری سے رائے قائم کرنے کے لئے انصاف پسند ضمیر کو اپنا جوہر دکھانا ہوگا۔ عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ صدیوں تک لڑتے رہے ہیں اور حالات اور واقعات نے باہمی نفرت کو ایک مستقل شکل دیدی ہے، اب چاہے پورا حساب لگا کر ثابت کیا جائے کہ ایک فریق زیادہ قابل الزام ہے یا دوسرا، مسلمانوں کا بہرحال یہ فرض ہے کہ وہ عدل سے کام لیں۔

ہمیں ماننا پڑے گا کہ مغربی قوموں نے، چاہے ہماری دینیات کے مطابق وہ صحیح معنوں میں عیسائی نہ ہوں، غلامی کو مٹانے کا بڑا نیک کام انجام دیا ہے۔ غلامی کو مٹانا ایک

ایسا کام ہے، جسے مسلمانوں کو اس سے بہت پہلے کر دینا چاہئے تھا، لیکن ہم نے اپنے آپ کو ساتویں صدی کے سماجی نظام میں گرفتار کر لیا اور اس کا خیال نہ کیا کہ غلاموں کو آزاد کرنا ثواب کا کام اس نیت سے ٹھہرایا گیا ہے کہ غلامی کا سدباب ہو جائے۔ یہی مغربی قومیں تھیں جنھوں نے بالآخر جمہوری نظام قائم کیا، اس لیے نہیں کہ یہ ان کا مذہبی عقیدہ تھا بلکہ اس لیے کہ ان کے ضمیر نے ان کو مجبور کیا۔ اس کے برخلاف ہم شخصی حکومت پر راضی رہے، اگرچہ وہ استبدادی تھی اور ایسی حکومت کی قرآن میں اجازت نہیں ہے۔ اور اگر اس نظام کی مخالفت کی گئی تو انفرادی طور پر۔ امام غزالیؒ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ بادشاہوں، درباریوں اور سرکاری ملازموں سے الگ رہیں، اس لیے کہ ان سے میل جول رکھنا دین کے لیے خطرناک ہے اور اچھے مسلمان اس مشورے پر عمل کرتے رہے ہیں، بے شک اگر مسلمان قرآن کی ہدایت پر عمل کرتے اور "قوامین بالقسط" بننے کی کوشش کرتے تو بہت خون خرابا ہوتا اور تکلیفیں پہنچتیں، لیکن مغربی قوموں نے خون بہائے اور مصیبتیں اٹھائے بغیر سیاسی آزادی اور قانونی مساوات حاصل نہیں کی۔ مسلمانوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا اس لیے کہ فقہی دلیلیں ان کے لیے زنجیریں بن گئی تھیں، جنھیں توڑنے کی طاقت ان کے ضمیر نے اپنے اندر پیدا نہیں کی۔ قرآن میں یہ ہدایت کہ مسلمانوں کی حکومت جمہوری ہونا چاہئے، اتنی واضح نہیں تھی کہ شخصی حکومتیں عالموں سے اپنے مطلب کی بات نہ کہلوا سکیں، لیکن یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ حاکم کو زکواۃ بیت المال میں جمع کر کے حاجت مندوں کی مدد کرنا چاہئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان قبیلوں کو زکواۃ ادا کرنے پر مجبور کیا جو اسے ادا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے مسلمان حاجت مندوں کے ساتھ غیر مسلم حاجت مندوں کی بھی مدد کر کے سبق آموز مثالیں قائم کیں، اس کے بعد صرف خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مثال ملتی ہے، جنھوں نے زکواۃ سے حاجت مندوں کی حاجت پوری کی، لیکن ان کی حکومت صرف دو سال قائم رہی اور اس کے بعد سے زکواۃ کو سرکاری طور پر محتاجوں کی مدد اور رفاہ عام کے کاموں کے لئے استعمال کرنے کی رسم اٹھ گئی، یہ اور بات

ہے کہ بعض مالدار اور پرہیزگار لوگ کارِ خیر میں دولت صرف کرتے رہے۔ آج کل جو ویلفیر اسٹیٹ قائم ہوئی ہے، اس پر مسلمانوں کے سماجی تصورات یا ان کے ضمیر کا کوئی احسان نہیں ہے اور یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ پہلے دونوں خلفاء کو چھوڑ کر مسلمانوں کا قائم کیا ہوا کوئی سیاسی نظام اسلام کے نصب العین کے اتنا قریب نہیں ہے جتنی آج کل کی ویلفیر اسٹیٹ۔

عیسائیوں میں مذہبی اختلافات کی بنا پر قرونِ وسطیٰ میں اور عصرِ جدید کے شروع تک سزائیں دی جاتی تھیں، ایسی مثالیں مسلمانوں کے یہاں بھی ملیں گی، پھر بھی غلط عقیدہ رکھنے والوں کو زندہ جلا دینے کا جو رواج عیسائیوں میں تھا اس کی مثال مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی، لیکن جہاں ہم عیسائیوں کے اس عیب کا ذکر کریں وہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ عیسائی راہبوں کے جو سلسلے تھے، انھوں نے خدمت کے بڑے نمایاں کام کئے اور یہ کام مختلف شکلوں میں ہمارے زمانے تک جاری ہیں، مسلمانوں میں کارِ خیر کے جو طریقے رائج تھے، ان میں اس بے لوث خدمت کا جواب نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں کے تسلط کے خلاف بغاوت ہوئی جو بظاہر علمی لیکن بنیادی طور پر دینی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قیمت پر علم حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور اب جو ہم علمی اور صنعتی ترقی دیکھتے ہیں، وہ اسی کا سلسلہ ہے۔ مسلمانوں میں کوئی کلیسا نہیں تھا، صرف علماء اور حاکموں کا ایک اتحاد ملتا ہے، جس کی بدولت شیخ بوعلی سینا اور استاد البیرونی جیسے فلسفیوں، عالموں اور سائنسدانوں کو مسلسل جان کا خطرہ رہا، ایسے لوگ اطمینان سے زندگی گذار سکتے اور ان ہی کے ساتھ ایسے سیکڑوں آدمی بھی جو علم کی ترقی میں اپنی جان کھپانے پر تیار تھے، اگر مسلمانوں کا ضمیر علماء کی رائے سے مرعوب نہ ہوتا اور علمی تحقیق کے شوق کو خیرباد نہ کہتا۔ ضمیر نے اس طرح ہتھیار ڈال دیئے کہ دنیاوی علوم کے ساتھ دینی علوم کو بھی نقصان پہنچا۔ اگر آپ دیکھیں کہ پچھلے دو سو برس میں مستشرقوں کے مقابلے میں مسلمانوں نے اسلام کو سمجھنے، سمجھانے اور مختلف مسائل کے بارے تحقیق کرنے کے لئے کتنا کچھ کیا ہے تو ہنسی [illegible] ہے۔ مستشرق ہمارے عقائد کا احترام نہیں

۔تے اور کبھی کبھی ان کا تعصب صاف نظر آتا ہے، لیکن ہمارے مقابلے میں انھوں نے ہمارے
ینی مآخذوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کی مذمت کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ
انے اپنا علمی فرض ادا کر دیا ہے۔

اگر تاریخ عالم سے یہ ثابت ہے کہ غیر مسلم اسلامی اصولوں کو عمل میں لا سکتے ہیں تو ہمیں
سوچنا چاہیئے کہ ہمیں اپنے ضمیر کو گواہ اور رہنما بنا کر موجودہ سیاسی اور سماجی حالات میں
، سرنا چاہیئے۔

نیشنلسٹ مسلمان اس کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اپنے اس عقیدے کے لیے شرعی
سندیں فراہم کریں کہ مسلمان ہندوستانی قوم کا جزو لاینفک ہیں۔ اس کی کوئی سند نہیں ہے،
زاد، تصورات اور تحریکوں کے بارے میں غیر جانبدار اور علمی رائے صرف ایک روشن اور حساس ضمیر کی بدولت
ئم ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمانوں میں انفرادی ضمیر کو وہ حیثیت دی گئی ہوتی جو اس کا حق ہے تو
یشنلسٹ مسلمانوں کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ عالم کی سند کافی ہوتی۔ مسلمان یہ
ہ سکتے کہ غیر مسلموں میں صرف اسی کا مادہ نہیں ہے کہ وہ مساوات اور عدل کے اسلامی اصولوں
عمل میں لائیں، بلکہ وہ انھیں واقعی عمل میں لا چکے ہیں اور یہ ہر مسلمان کا فرض اولین ہے کہ وہ
رسلموں کے ساتھ آزادی حاصل کرنے اور ایک جمہوری ویلفیئر اسٹیٹ قائم کرنے میں غیر مسلم شہریوں
ساتھ دیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ شرعی اسناد کی تلاش میں ان لوگوں کو جو بنیادی طور پر
دغرض تھے اس کا موقع مل گیا کہ وہ ایک اسلامی نظام حکومت کے خیال کی تبلیغ کریں۔ وہ کہتے یہ
ے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور مطلب یہ تھا کہ مسلمان الگ قسم کے انسان ہیں اور ان کی
اقی اور سماجی ذمہ داریاں ہیں جنھیں پورا کرنے میں غیر مسلم شریک نہیں کئے جا سکتے۔ مسلمانوں
ریاستیں تاریخ میں اور ہمارے زمانے میں ملتی ہیں، اسلامی نظام حکومت یا اسلامی
ست ہندوستانی مسلمانوں کی ایک ذہنی اختراع ہے۔ مسلمان بادشاہ یہ ظاہر کرنے کی ہر طرح
کوشش کرتے رہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خادم ہیں اور عام طور سے اس کا طریقہ

یہ تھا کہ وہ مذہبی تعصب کے مظاہرے یا غیر مسلموں کے خلاف جنگ کرتے۔ "ہدایہ" میں جو عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی ایک متداول کتاب ہے، غیر مسلموں کے خلاف ہر جنگ کو جہاد قرار دیا گیا ہے اور اس طرح کا جہاد کر کے مالِ غنیمت اور ثواب دونوں حاصل کئے جا سکتے تھے لیکن کوئی مسلمان بادشاہ اس کی جرأت نہ کرتا کہ اپنے سیاسی اور انتظامی عمل کو اسلام کی تعلیمات کو معیار قرار دے کر جانچے، اس لئے کہ اس طرح اس کی غیر ذمہ دار استبدادی حکومت کے عیب فوراً ظاہر ہو جاتے۔ لیکن وہ اسلامی حکومت جس کے خواب ہندوستانی مسلمان دیکھ رہے تھے، وہ عیبوں سے پاک مسلمانوں کی ایک ریاست نہیں تھی، وہ سمجھتے تھے کہ خدا کے اختیار کامل کو کسی طرح سے محدود اور مشروط نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کوئی عہدہ دار یا کوئی جماعت یا مجموعی طور پر ملت اسلامی فرماں روا نہیں ہو سکتی تھی، ایسا کوئی قانون نہ بنایا جا سکتا، جس کے بارے میں علمار کی یہ متفق رائے نہ ہو کہ وہ قرآن کی ہدایت کے مطابق ہے یا اس کی وجہ سے کسی ہدایت کی خلاف ورزی نہ ہو گی۔ ایک عالم جو دینی اور دنیاوی معاملات میں امام بننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے تو یہ حکم بھی لگا دیا کہ صرف وہ لوگ قانون ساز منتخب ہو سکیں گے اور عہدوں پر مامور کئے جا سکیں گے، جن کی دینداری ثابت ہو، ریاست اور اس کے منصب کے بارے میں ایسے تصورات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن اور ضمیر کے، اس زمانے میں بھی جب حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، سیاسی اور سماجی معاملات سے الگ رہنے کے کیسے مہلک نتیجے نکلے ہیں۔ اس زمانے میں بادشاہ کی اطاعت اور شخصی طور پر اس سے وفاداری کی جا سکتی تھی، لیکن ریاست کی اجتماعی حیثیت سے وفاداری برتنے اور اس کے ہر مقصد کو اپنا مقصد سمجھنے کا کوئی سوال نہ تھا، ہر ایک کو اپنی فکر تھی اور ریاست کی فکر کرنا خدا پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

مگر یہ رویہ صرف مسلمانوں کا نہیں تھا، بلکہ ہندوستان والوں کا شروع سے یہی رویہ رہا ہے، ہماری قومی تحریک نے ہم کو برطانوی حکومت کی مخالفت میں متحد کر دیا، آزادی

حاصل کرنے کے بعد سے یہ رفتہ رفتہ بہت خطرناک طور پر واضح ہوتا گیا ہے کہ ریاست اور عام مفاد سے شخصی اور غیر مشروط لگاؤ کی کمی ہے۔ انفرادی ضمیر کو بروئے کار نہیں لایا گیا ہے کہ وہ ہمارے عمل کو قابو میں رکھے اور سماجی اور شہری طرز عمل کے معیاری نمونے قائم کرے۔ عام میلان یہ ہے کہ خود کچھ نہ کیا جائے اور دوسروں سے توقع کی جائے کہ جو کچھ کرنا چاہئے، وہ کریں۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو مشورہ دوں کہ انھیں کیا کرنا چاہئے، مجھے ایک بہت بڑے اور پیچیدہ مسئلے کے صرف ایک پہلو سے اس وقت بحث ہے اور وہ ہے مسلمان کے ضمیر کا مقام۔ مجھے یہ مسئلہ بہت اہم معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ مسلمان کا ضمیر ہی اس کو اس فرض سے آگاہ کرسکتا ہے کہ اپنی عقل، اپنی ہمت، اور اپنے ارادے سے کام لے اور اس کے دل میں یہ یقین پیدا کرسکتا ہے کہ خدا کی مرضی بھی یہی ہے۔

میں امام یا مذہبی رہنما کے بارے میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، اسے یہاں دہرانا نہیں چاہتا، رہنما کی تلاش ہم اپنے ضمیر کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی کمزوری کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ملت اسلامی کے اتحاد اور یکجہتی کا مسئلہ دوسری نوعیت کا ہے۔ ہم کو مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے معلوم ہوگیا ہے کہ فرقہ داری اعتبار سے ملک کی جو اکثریت ہے، اس میں ایک جماعت ہے، (جس کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا) جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں بہت کامیاب ہوتی ہے، جو مسلمانوں سے غیریت برتتی رہے گی جب تک کہ مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی جماعت کی سی رہے گی جس کے اپنے عقیدے، اپنا طرز زندگی اور اپنے معاشی مقاصد ہیں، ہمیں ایسے لوگوں کی وجہ سے ایک جماعت بنے رہنے کا خیال کسی طرح چھوڑ نہیں دینا چاہئے، لیکن جیسے کہ میں کہہ چکا ہوں کہ تقلید کے جو معنی ہم نے سمجھے ہیں اور جن کے صحیح ہونے پر صدیوں سے اصرار کرتے رہے ہیں، ہماری روحانی اور ذہنی آزادی کی بنیادیں کمزور کرسکتا ہے۔ میرے نزدیک تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلعم اور پہلے دو خلفائے راشدین کے

بعد تمام مسلمان دینی اعتبار سے متحد رہے ہیں، سوائے اس کے کہ ہم اتحاد کے معنی یہ سمجھیں کہ اکثریت، خواہ وہ حنفیوں کی ہو یا شافعیوں کی یا شیعوں کی، حاوی رہی ہے اور اسلامی دینی اتحاد کا مطلب یہی ہے۔ آج کل کے حالات میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا ایک دینی اور سیاسی محاذ ہو، غالباً ہم اپنی تمام قوت کو یکجا کرنے کے معاملے کو اپنی فلاح کا واحد ذریعہ نہ مانتے اگر ہمیں ہر مسلمان کے ضمیر کی سلامت روی پر اتنا بھروسہ ہوتا کہ اپنی طاقت کو منتشر کر دیں اور یہ سمجھیں کہ ہر شخص اور ہر چھوٹی بڑی جماعت اپنے ضمیر پر بھروسہ کر کے صداقت، عدل اور فیاضی کا حق ادا کر سکے گی۔ ملت کے ایسے نظام کا تصور کہ جس کا اولین اور بنیادی مقصد یہ ہو کہ اپنے مفاد کی تدبیر کرے، ملت کے ہر فرد کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے اور غیر کے فرق پر اصرار کرے اور ہندوستان کی تمام مذہبی جماعتیں یہی کر رہی ہیں، اگرچہ کھلا الزام صرف مسلمانوں پر لگایا جاتا ہے۔ اگر اسلام کا منصب صرف انسانوں کو متحد کرنا ہے اور ان میں تفریق پیدا کرنا نہیں ہے، تو ہمیں ہر مسلمان کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق طے کرے کہ مسلم اور غیر مسلم کا فرق قائم رکھنا کس حد تک ضروری یا مناسب ہے اور ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ مسلمان کا ضمیر ہی یہ طے کر سکتا ہے کہ وہ اسلام کے روحانی، اخلاقی اور سماجی مقاصد کی خدمت کس طرح کر سکتا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ملت کے تصور کو ذہن نشین کرنے کے لیے جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے باوجود اسلام دراصل انفرادی مذہب ہے۔ اسلام نے کوئی کلیسا نہیں قائم کیا، ہر مسلمان خدا کے سامنے بلا واسطہ ذمہ دار ہے اور اس ذمہ داری میں کوئی اور شریک نہیں، مردوں اور عورتوں کے مذہبی فرائض ایک سے ہیں اور دونوں سے ایک ہی طریقے سے جواب طلب کیا جائے گا، ملکیت چاہے وہ امانت سمجھی جائے، ایک شخص کے قبضے میں رہتی ہے اور نکاح کی وجہ سے عورت کے حق ملکیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسلام کا اصل منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملت کا ہر فرد اپنے ارادے سے ملت کو قائم رکھے، یہ نہیں کہ ملت ہر فرد کے ارادے کو سلب کر لے۔

میری نظر میں بعض معاملے ہیں، جن میں ایک ملی محاذ قائم کرنے کی کوشش بیجا طور پر کی گئی ہے اور جن میں ہم نے اپنی عقل اور ضمیر سے کام لینے کے بجائے دینیات کی کتابوں پر بھروسہ کیا۔

جب مرکزی اسمبلی میں شاردا بل پر بحث ہو رہی تھی تو وہ مسلمان جو جانتے تھے کہ مسلمانوں میں بچپن کی شادیوں کا رواج ہے اور اس سے مضر نتیجے نکلتے ہیں، یا تو خاموش رہے یا مسلمانوں کی عام رائے سے دب کر انھوں نے اس تحریک کی تائید کی کہ مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اس کے لئے سب سے اہم دلیل یہ تھی کہ ایسی اسمبلی جس کے اکثر رکن غیر مسلم ہوں، اس کا حق نہیں رکھتی کہ شرعی معاملات میں مسلمانوں کے لیے قاعدے اور قانون بنائے۔ میرے خیال میں دینیات کے اعتبار سے بھی صحیح طریقہ یہ ہوتا کہ بل کی اس بنا پر مخالفت کی جائے کہ نکاح کے لیے کم سے کم جو عمر تجویز کی گئی ہے وہ بہت کم ہے اور چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے، اس لیے وہ نابالغ کی مرضی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نکاح کے لیے جائز عمر بڑھائی نہیں جا سکتی تو لڑکی کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ بالغ ہونے کے بعد وہ نکاح کے معاہدے کو منسوخ کرا سکے۔ یہ دلیل کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے شرعی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے، بہت کمزور تھی، اس لیے کہ لڑکیوں کے حق وراثت کے بارے میں عدالتوں میں فیصلے ہو چکے تھے، جو شریعت کے خلاف تھے اور قانون تعزیرات اور دوسرے قوانین میں جو برطانوی حکومت نے نافذ کیے تھے، شریعت کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے جس طرح سے شاردا بل کی مخالفت کی، اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ دوسروں کی نظر میں ان کی عزت کم ہو گئی۔

اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے نکاح کو ایک روحانی اور دائمی تعلق کے بجائے ایک قانونی معاہدے کی شکل دی۔ اب مسلمان بجائے اس کے کہ اصرار کریں کہ نکاح کے بارے میں ان کا تصور جو اخلاقی اور سماجی اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، عام طور پر صحیح تسلیم کیا جائے، رفتہ رفتہ اپنے رویہ سے اپنے اوپر یہ الزام اوڑھ رہے ہیں کہ وہ ہر نیک تبدیلی کے مخالف ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ عقل سلیم رکھنے والے مسلمان اور خاص طور سے وکیل پیشے

معاہدے مرتب کریں کہ جن سے عملی طور پر عورتوں کو اُن کے جائز اور پورے حقوق مل سکیں۔ لیکن اس کے برخلاف یہ کہا جا رہا ہے کہ اس معاملہ میں صرف علمار کی متفقہ رائے ہی سند ہو سکتی ہے، اگرچہ اس کا بھی یقین ہے کہ علما متفق نہ ہوں گے، چاہے ان سب کو ایک جگہ جمع بھی کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس خیال کی تصدیق کر دیں گے، جو ویسے بھی پھیل رہا ہے، کہ مسلمان چاہے انفرادی طور پر بہت معقول ہوں، مگر اجتماعی طور پر ان کا ذہن اور ان کی اخلاقی حس دینیات کے ایک ایسے نظام میں گرفتار ہے، جس میں کوئی تبدیلی کوئی حرکت ممکن نہیں۔

یہاں پھر وہی سوال آتا ہے جو میں پہلے اٹھا چکا ہوں کہ اسلام کے بارے میں ہمارا تصور کیا ہے؟ کیا وہ ایک جامد چیز ہے یا اس میں نشوونما کا امکان بھی ہے؟ اسلام حکم الٰہی کی اطاعت ہے، خدا کے جو احکامات نازل ہوئے، قرآن میں موجود ہیں، لیکن قرآن کے ذریعہ نازل ہونے سے پہلے اور اس کے نزول کے بعد جو کچھ تھا اور جو کچھ ہوا، وہ بھی خدا کے حکم سے ہوا اور ہم سے کہا گیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اسے مشیئت ایزدی سمجھیں۔ ہم واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے، خود قرآن میں ایسے واقعات کا ذکر ہے، جو پہلے ہو چکے تھے اور ان کا بھی جو اس زمانے میں ہوئے۔ قرآن کے نزول کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے لیے یا جو کچھ ہوا، اس کے باوجود اگر ہم معاملات کو سمجھنے کے لیے قرآن ہی سے ہدایت حاصل کرنا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کے نزول کے بعد جو کچھ ہوا، اسے کالعدم سمجھنا چاہیئے۔ اگر اسے کالعدم سمجھنا ہے تو اس کے لیے کوئی واضح سند چاہیئے اور مجھے کوئی سند نہیں ملی۔ معتزلہ کی رائے تھی کہ قرآن مخلوق ہے۔ ان کی اس رائے کو صحیح نہیں مانا گیا، شاید اس پر جس طرح غور کرنا چاہیئے غور بھی نہیں کیا گیا اور اس کا دینی سے زیادہ سیاسی تھا۔ اس کے برخلاف وہ رائے مانی گئی جو اس وقت راسخ العقیدہ لوگوں کی ہے۔ قرآن مخلوق نہیں ایک دائمی حقیقت ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر ہم اسے دائمی حقیقت مان لیں تو رہنمائی کے لیے ہم براہ راست قرآن تک نہیں پہنچ سکتے، بلکہ تشریحوں اور تفسیروں اور ان مسائل میں جن کا تعلق الفاظ کے اصل معانی سے ہے، الجھ جاتے ہیں، ایمان اور عمل کے

اعتبار سے اسلام کی تکمیل رسول صلعم کی زندگی میں ہو گئی، لیکن خود فقہ کی تدوین سے ثابت ہے کہ اس کے بعد بھی بہت سے سوال تھے جو اس وجہ سے اٹھے کہ حالات بدل گئے تھے اور ان سوالوں کا جواب دینا ضروری تھا۔ بعد میں تقلید کا اصول مان لیا گیا، اس کا سبب کچھ بھی رہا ہو، لیکن اس کی وجہ سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا حکم کیا ہے اور جو واقعات ہو رہے تھے، ان کے مشاہدے سے کیا نتیجے نکلتے ہیں، خود حالات اور واقعات پر غور نہیں کیا گیا، بلکہ پہلے کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھی جاتی رہیں۔ صوفیوں نے مسلمانوں کے ذہن کو تقلید کے تنگ دائرے سے نکال کر بڑی خدمت انجام دی، لیکن انھوں نے اگر ایک طرف یہ کہا کہ خدا اور انسان کا تعلق براہ راست ہے تو دوسری طرف شیخ کو ایک وسیلہ بھی قرار دیا اور اس طرح بھی ایک پابندی لگ گئی۔ تصوف کی ایک اعلیٰ شکل واردات قلبی اور وجد کی کیفیتوں میں نظر آتی ہے۔ اس کی معمولی شکل سے بس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ واقعات کی دنیا سے پناہ لینا اور واقعات میں خدا کی مرضی جس طرح سے ظاہر ہوتی تھی اسے سمجھنے کی ذمہ داری سے بھاگنا چاہتے تھے، پھر بھی تصوف مسلمان کے ضمیر کے اثبات خودی کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔

اس سوال کا ابھی کوئی جواب نہیں ملا ہے کہ ہم خدا کے حکم کی تعمیل کیسے کر سکتے ہیں، جب تک کہ ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ زندگی اور زمانے کے حالات میں اس کی مرضی کس طرح ظاہر ہو رہی ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، وہ ہمارے مقدر کا نتیجہ ہے۔ علم کامل خدا کو ہے، ہم کو حاصل نہیں ہے، خدا کے علم اور کامل اختیار پر قرآن میں بار بار زور دیا گیا ہے، لیکن انسان کو اپنے عقیدے اور عمل کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ ہم یہ سمجھ کر کہ جو کچھ ہونے والا ہے خدا کے حکم سے ہے، ایسے عمل سے پرہیز نہیں کر سکتے جو عقل یعنی انسانی عقل کو ضروری اور مفید معلوم ہوتا ہو۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم سمجھیں کہ کامل علم اور کامل اختیار کی صفات سے مطلب کیا ہے، ایمان لانا کیوں ضروری ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور عمل صالح اور عدل کے قیام کے ذریعہ خدا کی اطاعت کرنا کیوں ضروری ہے۔ اطاعت خلا میں نہیں کی جا سکتی، اسی عمل کی دنیا میں کی جا سکتی ہے اور

ایسے ہی افراد کے ذریعہ کی جا سکتی ہے جو حساس ہوں اور عاقل ہوں، جو اس کوشش میں لگے رہیں کہ ان کا ذہن زیادہ وسیع ہو جائے اور جنھیں ان کا ضمیر مجبور کرتا ہو کہ وہ حق اور عدل کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ دین اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اس دنیا اور اس کے معاملات میں برابر مصروف رہیں تاکہ وہ مقصد حاصل ہو سکے جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ ایسے ہی دین کو نمونہ کہیں گے۔ مسلمان مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا، کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ جتنا کر لیا ہے وہ کافی ہے، مسلمان کو ہمیشہ خود اسے اور دوسروں کو برابر یاد دلاتے رہنا چاہئے کہ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ

(سورۃ الانبیاء (۲۱) آیت ۱)

وقت قریب آلگا کہ لوگوں سے حساب لیا جائے، اس پر بھی ان کا یہ حال ہے کہ رُخ پھیرے غفلت میں متوالے چلے جا رہے ہیں۔

(ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد)

ڈاکٹر سید عابد حسین

مردِ مومن، مردِ حق

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اپنے سہ ماہی مجلّہ "اسلام اور عصرِ جدید" میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے انتقال کے موقع پر ایک مضمون لکھا تھا۔ مگر چونکہ اس کے آخری حصے میں دس بارہ سال کی داستان حد سے زیادہ اختصار سے بیان کی گئی تھی، بہت سے پڑھنے والوں کو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، اب موصوف نے اُس حصے کو کسی قدر پھیلا کر لکھا ہے۔ ہم اس مضمون کو اس اضافے کے ساتھ "جامعہ" میں شائع کر رہے ہیں ——— مدیر

اقبال نے عصرِ جدید کے مثالی مسلمان کا جو تصور "مردِ مومن" کے نام سے اپنے کلام میں اور گاندھی جی نے مردِ حق کا جو نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے ان دونوں کی جیتی جاگتی شبیہ مجھے اور میری طرح اور بہت سے لوگوں کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت میں نظر آتی تھی۔ گزشتہ سال ۳ رمئی کو سنیچر کے دن یہ محبوب صورت ہماری آنکھوں سے چھپ گئی مگر ہمارے مغموم دلوں پر اپنا اَن مٹ نقش چھوڑ گئی۔

ذاکر صاحب ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے طوفانی دَور میں پلے اور بڑھے۔ اِس طوفان و ہیجان کے زمانے میں جہاں بحرِ زندگی کی سطح پر ساحل سے ٹکر لینے والی تُند و پُرشور موجیں اُبھریں، وہاں قعرِ دریا میں اُن موتیوں نے بھی پرورش پائی جن میں بقول غالبؔ دریا کا اضطراب محو ہو گیا تھا۔ ایسا ایک موتی جس کے سکون میں طوفانوں کی خاموش قوت چھپی ہوئی تھی نوجوان ذاکر حسین تھا جو ۱۹۲۰ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ایم۔ اے فائنل میں پڑھ رہا تھا۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کے ارتقا کی کہانی ۱۹۲۰ء سے شروع کرنے کی دو وجہیں

ہیں۔ اوّل تو یہ کہ یہ سال ان کی عمر کا نہایت نازک اور اہم موڑ تھا جہاں سے اُن کی ایک نئی زندگی شروع ہوئی اور ان کی شخصیت کی ایک نئی شان نظر آئی۔ اسی زندگی اور اسی شخصیت کا مجھے ذکر کرنا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی سال میری ملاقات اُن سے ہوئی اور دوستی اور رفاقت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو نصف صدی تک جاری رہنے کے بعد آج سے ایک سال پہلے ختم ہوگیا، اور میری زندگی میں ایک اُداس، سنسان خلا چھوڑ گیا۔ اس سارے عرصے میں ان کی نشوونما کا حال میں قریب قریب شاہدِ عینی کی حیثیت سے بیان کرسکتا ہوں۔

اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں جب میں میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انگریزی ادب میں ایم۔ اے کرنے کے لئے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل ہوا تو سارا کالج ذاکر حسین کی شہرت سے گونج رہا تھا۔ وہ ایم۔ اے معاشیات کے دوسرے سال کے طالب علم بھی تھے اور شعبۂ معاشیات میں جونیر لکچرر بھی۔ مجھے اگر پہلی ملاقات میں نہیں تو دو چار ملاقاتوں میں اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ میں نے ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی صفات اور دلکش شخصیت کے بارے میں جو افسانوی روایتیں سُنی تھیں وہ بڑی حد تک صحیح تھیں۔ مجھے اُن کی ذہانت میں ایک طرف ادراک و وجدان کا اور دوسری طرف تفکر و تخیل کا ایک ایسا مرکب نظر آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ اُن سے گفتگو کریں تو وہ چشم زدن میں بات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ اُبھر کر سطح پر آتے تھے۔ وہ خود کسی مسئلے پر غور کریں تو اُن کی قوتِ فیصلہ بجلی کی طرح کوند کر صحیح حل کے مرکزی نقطے کو روشن کردیتی تھی۔ پھر اس کی ضو رفتہ رفتہ پورے دائرے میں پھیلتی تھی۔ ان کی تقریر میں بھی یہ خصوصیت تھی کہ پہلے سیدھی دل میں اُتر جاتی تھی اور پھر استدلال کے ذریعے دماغ کو قائل کرتی تھی۔ ان کی شخصیت میں بڑی دلکشی تھی مگر یہ دلکشی اس وقت تک ہمہ گیر نہ تھی۔ جو لوگ ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے اُن کے ہم جنس اور

ہم رنگ تھے وہ بے اختیار اُن کی طرف کھنچتے تھے مگر ناجنس ان سے بہت گھبراتے اور ڈرتے تھے۔ بڑے بڑے زبردست حریفوں کو جب بحث و مباحثے میں ان سے پالا پڑتا تو اُن کے چبھتے ہوئے طنز و مزاح اور بے پناہ قوتِ مناظرہ کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہوجاتا۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک خوش باش، لاابالی مزاج رکھتے ہیں، زندگی ان کے لئے کوئی گہرا، وزنی، سنجیدہ مقصد نہیں بلکہ ایک ہلکا پھلکا دلچسپ مشغلہ ہے۔

مگر چند ہی روز بعد ذاکر صاحب کی شخصیت کا ایک نیا پہلو جواب تک دبا اور چھپا ہوا تھا اُبھر کر نظروں کے سامنے آیا اور معلوم ہوا کہ اس بظاہر بے تہہ، بے پروا نوجوان کے سینے میں ایک پُر خلوص، پُرسوز اور پُرجوش دل ہے اور اس دل میں محکم ایمان، اٹل ارادہ اور اتھاہ ہمت و حوصلہ ہے۔

شروع اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طالب علموں کو جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی دعوت دی تو لبیک کہنے والوں کے سرگروہ ذاکر صاحب تھے۔ یہ منچلے معلم اور طالب علم سرکاری امدادی کالج کو خیرباد کہہ کر ایک آزاد تعلیم گاہ میں داخل ہوگئے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم کی گئی اور ہندوستانی مسلمانوں میں قومی تحریک کی ہراول بن گئی۔

اپنے دوست اور رفیقِ کار خواجہ عبدالحمید کے اصرار سے ذاکر صاحب اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی پہنچے جہاں میں پہلے سے برلن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور مجیب صاحب آکسفورڈ سے بی۔ اے آنرز کی ڈگری لینے کے بعد فنِ طباعت میں مہارت حاصل کر رہے تھے۔ برلن میں تین سال سے کچھ اوپر قیام کے دوران میں ذاکر صاحب کو وہ سازگار ماحول ملا جس میں نئی صلاحیتوں کے اُبھرنے اور نئی قدروں کے نشوونما پانے سے ان کی شخصیت میں بڑی وسعت، گہرائی اور پختگی پیدا ہوگئی۔ شعر و ادب سے انھیں پہلے ہی سے لگاؤ تھا۔ یہاں رہ کر فنونِ لطیفہ، موسیقی، مصوری، ڈراما اور فنِ تعمیر کا ذوق پیدا ہوا اور پروان

پڑھا۔ یونیورسٹی میں ان کا میدان مطالعہ معاشیات تھا، لیکن اپنے خاص مضمون سے کہیں زیادہ دلچسپی وہ علمِ تعلیم اور فنِ تعلیم سے رکھتے تھے۔ انھیں میرے استاد پروفیسر ایڈوآرڈ اشپرنگر سے جو فلسفۂ تعلیم کے جیّد عالم سمجھے جاتے تھے، گہری عقیدت تھی، بڑے شوق سے اُن کے لکچر سنتے تھے اور ان کی کتابیں پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ جرمنی کے مختلف حصوں میں جو مدرسے تعلیم کے جدید ترین تصوّرات اور طریقوں کا تجربہ کرتے تھے انھیں وہاں جاکر غور وتحقیق کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تعطیل کے زمانے میں انھوں نے جرمنی کے مختلف علاقوں کے علاوہ انگلستان، فرانس، ڈنمارک، ناروے اور سویڈن کا سفر بھی کیا اور مغربی تہذیب کے مادّی، ذہنی اور روحانی مظاہر کو مختلف صورتوں میں دیکھا اور سمجھا۔ اپنے ذہن کو مغربی علم وعقل کی روشنی سے منوّر کرنے کے باوجود انھوں نے اپنے دل میں نُورِ ایمان کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔

ہندوستان واپس آکر ذاکر صاحب نے جامعہ ملّیہ کی قیادت کی باگ سنبھالی اور چند سال کے اندر اُسے قومی تعلیم کی ایک خانقاہ بنا دیا جہاں وہ اور اُن کے رفیق گاندھی جی کے فیضان سے نئے زمانے کے سادھوؤں کی طرح صاف ستھری فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور بچّوں اور نوجوانوں کو خدا پرستی، انسان دوستی اور وطن پروری کی تعلیم دیتے تھے۔ اگلے تیئس ۲۳ سال میں ذاکر صاحب نے جامعہ ملّیہ کے اندر تعلیم کو جس اصول کے مطابق چلایا وہ کام کے ذریعے سیکھنے "کا اصول تھا۔ "کام" کا تصوّر ان کے یہاں محض ذہنی نہیں بلکہ بڑی حد تک روحانی تھا۔ اس کا ذہنی عنصر انھوں نے جدید مغربی ماہرینِ تعلیم خصوصاً کیرشن اشٹائنر سے لیا تھا اور روحانی عنصر مہاتما گاندھی سے اور ان دونوں کے امتزاج سے خود اپنے نظریۂ تعلیم کی تشکیل کی تھی۔ اسی نظریئے کے سانچے میں انھوں نے بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم ڈھالی تھی جو ذاکر حسین اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی۔

اگر ہم اس نظریئے کو چند لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم نام

ہے کسی قوم کی روحانی اور تہذیبی قدروں کو اُس کی نئی نسل تک اس طرح پہنچانے کا کہ وہ اس کی زندگی کا جز بن جائیں۔ یہ قدریں مجسّم شکل میں قوم کی تہذیبی میراث کے مختلف شعبوں میں موجود ہوتی ہیں جیسے مذہب، اخلاق، علم، آرٹ وغیرہ۔ معلّم کا کام یہ ہے کہ ان قدروں کو پہلے خود اپنائے اور پھر اپنے شاگرد بچّوں اور نوجوانوں کو ان کے حاصل کرنے میں مدد دے۔ قدروں کے حصول کا مؤثر ذریعہ صرف "کام" ہے یعنی مذہب صرف مذہبی عمل سے، اخلاق صرف اخلاقی برتاؤ سے، علم صرف علمی تجربے سے اور آرٹ صرف آرٹ کی مشق سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ذاکر صاحب نے جامعہ کو ایک نمونے کے "کام" کا مدرسہ بنا دیا تھا جہاں کتابی درس کم سے کم ہوتا تھا اور تعلیمی قدر و قیمت کی حامل عملی سرگرمیاں زیادہ سے زیادہ دکھائی دیتی تھیں۔ کام ــــ مفید منظم ماہرانہ کام ــــ ذاکر صاحب کے نزدیک صرف تعلیم و تعلّم کا آلہ ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ بلند و برتر شے ہے۔ اسی سے انسان زندگی کا لُطف اُٹھا سکتا ہے۔ اسی سے بحیثیت فرد کے اور بحیثیت سماج کے رکن کے اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کر سکتا ہے اور اسی سے نجاتِ روحانی اور معرفتِ الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔

ہمیں اس فلسفۂ زندگی کی طرف جو ذاکر صاحب بحیثیت معلّم کے رکھتے تھے اس وجہ سے اشارہ کرنا پڑا کہ وہ اپنے کام اور اپنی ذات کو ایک سمجھتے تھے اس لئے ان کی زندگی بحیثیت انسان کے بامعنی طور پر صرف اسی فکر و نظر کے پس منظر میں دکھائی جاسکتی ہے جو بحیثیت معلّم کے ان کی خصوصیت تھی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت میں جو وسعت اور رنگا رنگی یورپ کے قیام سے پیدا ہوئی تھی اس کو وحدت اور ہم آہنگی اس ریاضت سے نصیب ہوئی جو انھوں نے جامعہ کی تعلیمی خانقاہ کے مرشد کی حیثیت سے کی تھی۔ مختلف انسانوں کی وضع نفسی کے اس نقشے کے مطابق جو ایڈوارڈ اشپرانگر نے ترتیب دیا ہے، ذاکر صاحب ایک "سماجی انسان" بن گئے یعنی ایک ایسے شخص جن کے وضع نفسی

میں غالب رجحان خلقِ خدا کی خدمت اور محبت کا ہو۔ اگرچہ ان کی شخصیت کے مرقع میں مذہبی عقیدت، فکر و نظر، ذوقِ جمال کے گہرے رنگ موجود تھے لیکن اس کی ساری زمین انسان دوستی کے رنگ میں رچی ہوئی تھی۔ اس کی دو بڑی علامتیں یہ تھیں، ایک یہ کہ ان کے لئے انسان سے خواہ وہ فرد کی شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کرنا محض اخلاقی یا مذہبی فرض نہ تھا جس کے لئے شعور اور ارادے کی ضرورت ہو بلکہ ان کی فطرت کا قانون تھا جو بلا شعور اور بلا ارادہ کام کرتا تھا۔ میرے علم و یقین میں انھیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی زندگی کو قومی خدمت کے لئے وقف کیا ہے اور اس میں کسی قسم کے ایثار یا قربانی سے کام لیا ہے۔ اگر احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود ایک خاص سمت بہہ رہا ہے اور انھوں نے کہا کہ اچھا ہے، بہنے دو۔ ان میں "خودی" اور "بے خودی" اس طرح گھل مل کر ایک ہوگئی تھی کہ کسی انسان کے مقابلے میں خواہ وہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کا ہو انھیں احساسِ کمتری اور اظہارِ برتری کی کش مکش سے گذرنا، خود نمائی اور خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑا۔ نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے تھے جیسے برسوں کا دوست ہو۔ انسان کو وہ کتاب سمجھ کر اس کی تنقید یا تحلیل نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی طرح بحرِ وجود کا ایک قطرہ جان کر جیسا بھی ہو سارے کا سارا لے لیتے تھے اور اپنے آپ کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے تھے۔

ذاکر صاحب جامعہ ملیہ میں معلموں اور طالب علموں کو بہت جانچ اور پرکھ کر لیتے تھے۔ جانچ اور پرکھ ان کی ذہانت اور قابلیت سے کہیں زیادہ ان کی شرافت اور انسانیت کی ہوتی تھی۔ دو ڈھائی سو اشخاص کا یہ گروہ ایک متحد، ہم آہنگ خاندان تھا۔ افسر خاندان کی حیثیت سے ذاکر صاحب ہر چھوٹے بڑے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے اور ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیتے تھے۔ اُن کا ہر شخص کے ساتھ ایک مخصوص طریقہ تھا جو نہ صرف اُن کے فطرتِ انسانی کے ادراک پر بلکہ ایک

حد تک ان کی وجدانی بصیرت پر بھی مبنی تھا۔ کسی کو وہ کڑی تنقید سے اکساتے تھے، کسی کی تعریف وتحسین سے ہمت بڑھاتے تھے، کسی کی قدم قدم پر رہنمائی کرتے تھے اور کسی کو تنہا چھوڑ دیتے تھے کہ جاؤ اپنی راہ خود ڈھونڈو۔

ان کی ہمدردی اور محبت کا یہ حال تھا کہ کسی رفیق یا شاگرد کو ذرا سی بھی تکلیف ہو تو بے چین ہو جاتے اور ہر امکانی طریقے سے خواہ وہ کتنا ہی مشکل اور صبر آزما کیوں نہ ہو اُسے دُور کر کے رہتے تھے۔ مگر اسی محبت کا ایک رُوپ بظاہر بے دردی کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا تھا۔ اگر ان کا کوئی عزیز ساتھی ان مشکلوں اور مصیبتوں سے جن کا جامعہ کے لوگوں کو ایک چوتھائی صدی تک مقابلہ کرنا پڑا، گھبرا کر جامعہ کو چھوڑنا چاہتا تھا تو وہ ان اخلاقی بندھنوں کو جنھوں نے اُسے ان کی ذات اور ان کے ادارے سے وابستہ کر رکھا تھا اس طرح کس دیتے تھے کہ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ مگر یہ صورت بہت کم پیش آتی تھی۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا تھا کہ جب کوئی رفیق نیم فاقہ کشی کی زندگی سے تنگ آکر اُن کے پاس جاتا کہ فریاد، شکایت یا طنز و طعن کے ذریعے اپنے دل کا بخار نکالے تو وہ خود اُن کی حالت دیکھ کر اور اُن کے صبر و حلم سے شرمندہ ہو کر یا اُن کی محبت اور اعتماد سے خوش ہو کر لوٹتا۔ وہ اُسے روٹی کے بدلے "کام" دیتے تھے اور وہ فخر ومسرت سے پھُولا نہ سماتا تھا۔

میں نے کہا تھا کہ طالب علمی کے زمانے میں جہاں ذاکر صاحب کی شخصیت کی موہنی ایچھوں کو ان کی طرف کھینچتی تھی وہاں ان کے بحث واستدلال کی کاٹ اور طنز و مزاح کی دھار بُروں کو ان سے دور رکھتی تھی۔ مگر اب کچھ تو معلمی کے پیشے کے رُوحانی تقاضے سے، کچھ صوفیائے کرام کی تعلیم سے اور کچھ گاندھی جی کی مثال سے ان میں بے حد برداشت اور رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ معلم کی حیثیت سے وہ ہر شخص کی سیرت کے بُرے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اچھے پہلو ڈھونڈھ نکالتے تھے اور ان کی قدر و ہمت افزائی کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے پیرو کی حیثیت سے وہ بُرے آدمی اور اس کی بُرائی میں اسی طرح فرق

کرتے تھے جیسے بیمار اور اس کی بیماری میں، برائیوں سے اور خصوصاً کمینہ پن اور بے وفائی سے انھیں نفرت تھی مگر بُرے کام کرنے والے سے اس قدر درگذر، ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے کہ اگر اس میں ذرا سی بھی انسانیت ہوتی تو اس کی سیرت میں کایا پلٹ ہوجاتی تھی۔

فیاضی اور سیر چشمی میں ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اُس بائیس تیئیس برس کے عرصے میں جب وہ جامعہ ملّیہ میں پچھتّر روپے ماہوار پاتے تھے اور اس تنخواہ کے ساتھ نجی جائداد کی تھوڑی سی آمدنی ملا کر تنگی سے بسر کرتے تھے، نہ صرف مستحق طالب علموں کی مدد کرتے بلکہ کسی مستحق یا غیر مستحق سائل کے سوال کو نہیں ٹالا خواہ ان کو اس کی وجہ سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔

ذاکر صاحب کی خوشی اور کامیابی کی زندگی اُسی روز سے ختم ہوگئی جب وہ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے اصرار سے جامعہ ملّیہ کو چھوڑ کر مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوکر گئے۔ انھوں نے خوف و ہراس اور غم و غصّے کے اُس کابوس کو جو تقسیمِ ہند کے بعد سے یونیورسٹی پر مسلط تھا، دُور کیا، بدخواہی اور مخالفت کے اس طوفان کو جو اس کی سمت چاروں طرف اُمڈ رہا تھا روکا، اور اس کی مالی اور تعلیمی حالت کو بہت کچھ دُرست کیا، مگر ان کی یہ سعی کہ جس طرح جامعہ ملّیہ میں انھوں نے اتحاد اور یک جہتی کی رُوح پھونک دی تھی اسی طرح مسلم یونیورسٹی کو ایک ہم رنگ اور ہم آہنگ ادارہ بنا دیں مشکور نہ ہوسکی۔ علی گڑھ میں انھیں جامعہ ملّیہ جیسی کامیابی نہ ہونے کی دو وجہیں ہیں، ایک وہاں پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد اُن پر قلب کا شدید دَورہ پڑا اور اُن کی صحت جو پہلے بھی کچھ بہت اچھی نہ تھی، نہایت کمزور ہوگئی، اس لئے وہ اس قدر محنت اور لگن سے جو اتنی بڑی اقامتی یونیورسٹی کو چلانے کے لئے درکار تھی، کام نہ کرسکے، دوسرے جن رفیقوں سے انھیں واسطہ تھا وہ اُن کے منتخب کئے ہوئے نہ تھے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرنی تھی وہ اُن کا بنایا ہوا نہ تھا۔

اس کے بعد جب وہ قومی خدمت کے تقاضے سے پہلے بہار کے گورنر، پھر

ہندوستان کے نائب صدر اور آخر میں صدر بنے تو اُن کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ ذاکر صاحب کے قریبی دوستوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب مرحوم مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہوئے تو انھیں بوجوہ یہ اُمید تھی کہ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے پہلے غیر سرکاری چیرمین بنائے جائیں گے، مگر جب یہ نہیں ہوا اور انھیں اس کے بدلے گورنری کا منصب پیش کیا گیا تو انھوں نے قطعاً انکار کر دیا۔ پھر ایک بیرونی ملک کی سفارت پر جانے کو کہا گیا۔ انھوں نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔ کچھ عرصے بعد اُن کی صحت بہت خراب ہوگئی اور وہ علاج کے لئے جرمنی چلے گئے۔ طبیعت کچھ سنبھلی تھی کہ ہندوستانی سفیر متعینہ برلن کے ذریعے انھیں پنڈت جواہر لال نہرو کی یہ محبت آمیز تہدید پہنچی کہ میں تمھیں بہار کا گورنر بنانا چاہتا ہوں، تمھیں وہاں جانا پڑے گا۔ کوئی عذر نہیں سُنا جائے گا۔ ذاکر صاحب نے جواب کے لئے چند روز کی مہلت مانگی اور ہندوستان میں اپنے دوستوں کو خطوط لکھ کر مشورہ چاہا۔ جہاں تک مجھے علم ہے سب کی یہی رائے تھی کہ ذاکر صاحب کی صحت کا جو حال ہو گیا ہے اسے دیکھتے ہوئے انھیں گورنری قبول کر لینا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس وقت تک گورنر کی زندگی مقابلتاً پُر سکون ہوتی تھی۔ پھر یہ خیال بھی تھا کہ ہر چند گورنر عوامی وزارت کی موجودگی میں آئینی طور پر ریاست کے کاروبار میں دخل نہیں دے سکتا پھر بھی اپنی شخصیت کے اثر سے کسی نہ کسی حد تک حکومت کی پالیسی پہ اثر انداز ہو سکتا ہے۔ یہ اُمید تھوڑی بہت پوری بھی ہوئی۔ ذاکر صاحب کو بہت سے معاملات (خصوصاً تعلیمی معاملات) میں حکومت کو مشورے دینے اور ان پہ عمل کرانے کا موقع ملا۔ گورنری کی پانچ سال کی مدت ختم ہونے پر وہ یہ طے کر چکے تھے کہ مزید پانچ سال کی توسیع جس کا تقریباً یقین تھا، منظور نہیں کریں گے۔ مگر جب حکومتِ ہند نے انھیں اپنا نائب صدر مقرر کرنا چاہا تو انھوں نے یہ سمجھ کر قبول کر لیا کہ اس عہدے کا کام بھی ہلکا ہوگا اور بے ضابطہ طور پر مرکزی حکومت کو مفید مشورے دینے کا موقع بھی ملے گا۔ ابتدا

کے چند سال میں واقعی یہ توقع پوری ہوئی۔ راجیہ سبھا میں جس کی صدارت اُن کا اصل کام تھا اُن کی رہنمائی میں بڑا خوشگوار اور پُرامن ماحول پیدا ہو گیا تھا اور حکومتِ ہند بھی بہت سے معاملات میں بے ضابطہ طور پر اُن سے مشورہ لیتی رہتی تھی۔ مگر آخر میں جب عام طور پر ملک میں ایک طوفان اور ہیجان کی کیفیت پیدا ہو گئی اور اس کے اثر سے ایوانِ بالا بھی پہلوانوں کا دنگل بن گیا تو وہ عارضی سکون جو ذاکر صاحب کو میسّر آیا تھا غارت ہو گیا۔ گو وہ بڑے وقار اور صبر و تحمّل کے ساتھ اس طوفان میں راجیہ سبھا کی کشتی کو کھیتے رہے، مگر ہر وقت کی کوفت سے ان کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا کہ وہ نائب صدارت کی میعاد ختم ہونے کے بعد نئے انتخاب میں اس عہدے کے اُمیدوار نہیں ہوں گے۔ مگر ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں ملک کی تاریخ میں ایک ایسا نازک موڑ آ گیا، معلوم ہوتا تھا کہ مرکزی حکومت بھی اسی پراگندگی اور ابتری کا شکار ہو جائے گی جو بعض ریاستوں میں نظر آ رہی تھی۔ اس موقع پر ملک کی حکمراں پارٹی کی یہ رائے ہوئی کہ اگر ذاکر صاحب صدر جمہوریہ منتخب ہو جائیں تو ممکن ہے کہ مرکزی سیاست میں جو بُری طرح ڈانوا ڈول ہو رہی تھی توازن پیدا ہو جائے۔

ذاکر صاحب اپنی زندگی میں بہت سے کڑے امتحانوں سے گزرے تھے، مگر یہ اُن کے لئے سب سے سخت امتحان تھا۔ ان کی صحت قریب قریب جواب دے چکی تھی۔ اس طوفانِ بے تمیزی میں جو سارے ملک میں برپا تھا اس کی کچھ زیادہ اُمید نہ تھی کہ وہ صدر منتخب ہو سکیں گے اور اگر ہو بھی گئے تو بگڑے ہوئے حالات اُن کی مدد سے دُرست ہو جائیں گے مگر مشکلات سے ٹکّر لینا ذاکر صاحب کی طبیعت بن گئی تھی۔ وہ اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر اس آزمائش کے لئے تیار ہو گئے۔ خلافِ توقع رائے عامّہ کے نمائندوں کی بڑی اکثریت نے اُن کا ساتھ دیا اور وہ صدر

منتخب ہو گئے۔ انتخاب سے پہلے اور انتخاب کے بعد کچھ لوگوں نے نادانستہ بدگمانی سے
اور بعض نے دانستہ بدبینی سے اُن پر طرح طرح کے الزام تراشے مگر مجموعی طور پر اُن
کی دلکش شخصیت کی موہنی نے دوست دشمن سب ہی کے دلوں کو موہ لیا۔ اور
انھیں وہ ہر دلعزیزی نصیب ہوئی جو اُن سے پہلے بہت کم قومی رہنماؤں کو نصیب
ہوئی تھی۔ مگر جہاں تک ملک کی بگڑی کو بنانے کا تعلق ہے وہ اس سے زیادہ نہ کر سکے
کہ ایک طرف ان خوشگوار ذاتی تعلقات کی بنا پر جو ان میں اور قریب قریب سب
سیاسی گروہوں کے لیڈروں میں پیدا ہو گئے تھے، انھیں سمجھا بجھا کر اُن کی باہمی
رقابتوں اور عداوتوں کو ایک حد سے آگے نہ بڑھنے دیں اور منظر عام پر نہ آنے
دیں اور دوسری طرف بیرونی ملکوں کے رہنماؤں کے میزبان یا مہمان کی حیثیت
سے اُن کے دلوں پر ہندوستان کی قدر و عزّت کا نقش بٹھائیں۔ اُن کے یہ
کارنامے اپنی جگہ کچھ کم نہ تھے، مگر خود اُن کے نزدیک یہ قومی تعمیر و ترقی کی میزان میں
کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتے تھے۔ دنیا نے پبلک زندگی کے پیمانے سے ناپ کر اُن کی
عظمت کا اعتراف کیا اور ان کے سر پر کامیابی کا تاج رکھا۔ مگر ان کے دل کی دنیا میں
بے حاصلی اور ناکامی کے احساس سے افسردگی چھائی رہی۔ ذاکر صاحب بنیادی طور
پر ایک معلّم تھے اور ان اعلیٰ مناصب پر پہنچ کر بھی معلّم ہی رہنا چاہتے تھے، مگر یہاں
نھیں سابقہ سیاست کاروں سے تھا جنھیں تعلیم دینا بہت مشکل کام ہے۔ معلّم صرف
لاقی اثر ڈال سکتا ہے اور سیاست کار اور رہبر اثر سے تو متاثر ہو سکتے ہیں، مگر
بہ استثنائے چند) اخلاقی اثر کو قبول نہیں کرتے۔ پھر بھی چونکہ ذاکر صاحب نے
ں آخری عمر میں بھی عوام کی تعلیم کے لئے اتنا کچھ کیا کہ ملک کی تاریخ میں بہت کم
ں نے کیا ہوگا۔ اس لئے خواہ وہ کتنے ہی بددل کیوں نہ ہوں، مایوس ہرگز نہ تھے۔
ں یقین تھا کہ جب ملک کے عوام تعلیم پا جائیں گے تو وہ خود اپنے سیاسی رہنماؤں کو

حسبِ ضرورت سبق پڑھا سکیں گے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا ذاکر صاحب میں اقبال کے مردِ مومن اور گاندھی جی کے مردِ حق دونوں کی شان نظر آتی تھی۔ انھوں نے "فقیری میں بھی شاہی" اور شاہی میں بھی فقیری کی۔ انھوں نے کبھی تلوار پر بھروسہ نہیں کیا، عمر بھر "بے تیغ" لڑتے رہے۔ انھوں نے کبھی تقدیر کی آڑ نہیں لی بلکہ خود "تقدیرِ الٰہی" بن کر اپنی قوم کا مقدر بدلنے کی کوشش کی۔ خدا اُن کی رُوح کو سکونِ ابدی بخشے اور ہم سب کے دل میں وہ مبارک بے چینی اور بیتابی پیدا کرے جو سکونِ ابدی کی راہ دکھاتی ہے۔

غلام ربانی تاباںؔ

غزل

شکستِ شوق بہت ناگوار بھی تو نہیں
یہ کیا ستم ہے کہ دل بے قرار بھی تو نہیں
مری وفا پہ عجب سانحہ سا گزرا ہے
کہ مدتوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں
تری جفا کے سہارے گزر تو سکتی ہے
تری جفا کا مگر اعتبار بھی تو نہیں
چمن میں پھول کھلیں، یا جگر میں زخم کھلیں
ہوائے دہر پہ کچھ اختیار بھی تو نہیں
کچھ اس طرح سے مٹا شہر آرزوؤں کا
کوئی نشان، کوئی یادگار بھی تو نہیں
مجھے تو خار بھی پھولوں سے کم نہیں لیکن
میں کیا کروں کہ مقدر میں خار بھی تو نہیں
عروج پر ہے مرا بختِ نارسا تاباںؔ
کہ غیر درد کوئی غم گسار بھی تو نہیں

اختر انصاری دہلوی

غیر مرئی مہمان

میجر برائٹ کے تقریباً سارے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ بڑی بیتابی کے ساتھ اپنے سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلا رہا تھا اور ہائے ہائے کر رہا تھا۔ کروٹ بدلنے یا اٹھ کر بیٹھ جانے کی اس میں طاقت نہیں تھی۔ صرف ہاتھوں کو جنبش دے سکتا تھا مگر اس کی اُسے اجازت نہیں تھی۔ ذرا ہاتھ ہلاتا اور گارڈ ماسٹر پھرتی کے ساتھ اُس کے بیڈ کے قریب آکر اُسے بے حس و حرکت لیٹے رہنے کی ہدایت کرتا۔ کبھی وہ اُس کے سرہانے کی طرف آکر اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتا اور دلاسائی کے طور پر کہتا "میجر برائٹ! صبر اور ہمت سے کام لیجئے۔ آپ کی حالت سدھر رہی ہے۔ آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔ اور وہ ہوائی جہاز بھی بس آیا ہی چاہتے ہیں جو آپ لوگوں کو یہاں سے مختلف ہسپتالوں میں منتقل کریں گے۔" ایسے موقع پر میجر برائٹ اس سے یہ ضرور پوچھتا۔ "گارڈ ماسٹر! ہنری کی کوئی خبر؟" گارڈ ماسٹر جواب دیتا، "آپ کا پیغام بھیجا جا چکا ہے۔ جلد ہی جواب آئے گا۔ صبر سے کام لیجئے۔"

یہ دوسری جنگِ عظیم کے شباب کا دَور تھا۔ اتحادی طاقتیں پوری قوت کے ساتھ محوری طاقتوں سے نبرد آزما تھیں۔ اور کئی محاذوں پر گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ شرق اوسط میں بن غازی کے محاذ پر میجر برائٹ زخمی ہوا اور دوسرے زخمیوں کے ساتھ فسٹ ایڈ کے لئے فیلڈ ہاسپٹل میں لایا گیا جو گویا محاذِ جنگ کا ایک ناگزیر دُم چھلا تھا اور چند چھوٹے بڑے خیموں پر مشتمل تھا۔ کسی خیمے میں دواؤں کا ذخیرہ تھا۔ کسی میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی جاتی

تھی، اور اس بڑے خیمے میں جہاں اِس وقت میجر برائٹ پٹیوں سے کسا بندھا اور دوائیں میں نہایا ہوا پڑا تھا سب کو برابر برابر بچھے ہوئے پلنگوں پر لاکر لِٹا دیا جاتا تھا اور وہ اس وقت تک یہاں زندگی اور موت کے درمیان معلق رہتے تھے جب تک کہ ان کو مستقل علاج کے لئے کسی مستقل ہسپتال میں منتقل کرنے کا انتظام نہیں ہو جاتا تھا۔

میجر برائٹ ابتدائی امداد کے بعد جب پہلی مرتبہ ہوش میں آیا تو اوّلیں الفاظ جو اُس کی زبان سے ادا ہوئے وہ ہنری کے بارے میں تھے۔ کیپٹن ہنری اُس کا عمر بھر کا ساتھی اور جگری دوست تھا جو شمالی فرانس میں نارمنڈی کے محاذ پر لڑتا ہوا زخمی ہوا تھا اور اب وہاں کے فیلڈ ہاسپٹل میں زیرِ علاج تھا۔ برائٹ جواب خود بھی اسی حالت میں تھا اور موت جس کے سامنے مُنھ پھاڑے کھڑی تھی دنیا کی ہر بات اور ہر چیز کی طرف سے بظاہر بالکل بے پروا تھا اور صرف ہنری کی یاد کو حرزِ جاں بنائے ہوئے تھا۔ وہ شاید زندہ ہی اس لئے تھا کہ اُسے ہنری کی خیریت معلوم کرنی تھی۔

خیمے کی دوسری طرف سے گارڈ ماسٹر اپنی نپی تُلی فوجی چال سے چلتا ہوا برائٹ کی طرف آیا۔ اور جھانک کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ برائٹ نے آنکھیں کھولیں اور بولا، "گارڈ ماسٹر! کیا وقت ہوگا؟"

گارڈ ماسٹر نے کہا، "چار بجنے والے ہیں۔ ٹھیک چار بجے آپ دوا کی اگلی خوراک پئیں گے" اور یہ کہہ کر برابر کی میز پر جو چارٹ رکھا ہوا تھا اُسے اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

"ہنری کے بارے میں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی؟" برائٹ نے سوال کیا۔

"آپ کو بتایا جا چکا ہے" گارڈ ماسٹر نے جواب دیا، "کہ نارمنڈی کے محاذ سے شام کے چھ بجے کے قریب خبریں موصول ہوں گی۔ اُس وقت تک صبر کے ساتھ انتظار کیجئے اور آرام کرنے کی کوشش کیجئے ــ آرام آپ کے لئے بہت ضروری ہے۔ آپ کو کیپٹن ہنری کا جتنا دھیان ہے اتنا اپنا نہیں ہے۔ آخر کیوں؟ جی اچھا تو جہان اچھا! اپنی صحت کا

خیال کیجیے اور خاموش رہ کر آرام کیجیے۔ آرام! آرام! آرام!"

برائٹ نے خالی خالی نظروں سے یہ ایڈریس سنا اور آہ کر کے خاموش ہو گیا۔ گارڈ ماسٹر وہاں سے پلٹ کر ایک نرس کی طرف متوجہ ہوا جو قریب ہی کسی مریض کو دوا پلا رہی تھی۔

چند منٹ کے بعد برائٹ اچانک اپنی غفلت اور نیم بے ہوشی کی حالت سے بیدار ہوا اور ہڑبڑا کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ہنری! میرے دوست، جان سے عزیز دوست! تم یہاں؟ آؤ آؤ! خوش آمدید! خوش آمدید!" اس نے اپنے سامنے کسی غیر مرئی وجود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گارڈ ماسٹر لپکا ہوا اور ہائیں ہائیں کرتا ہوا اس کی طرف آیا: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اُٹھنے کی کوشش نہ کیجیے۔ آپ اپنے آپ کو سخت نقصان پہنچائیں گے۔ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ کیوں اُٹھنے کی کوشش کر رہے ہیں؟....."

برائٹ نے گارڈ ماسٹر کی تنبیہ کا بالکل کوئی خیال نہیں کیا اور بدستور کہنیوں کے بل پر اوپر اُٹھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو" اُس نے کہا: "مجھے مت روکو۔ مجھے اپنے دوست سے ملاقات کرنے دو۔"

جب گارڈ ماسٹر نے اپنی فہمائش کو بے اثر اور روک تھام کی کوشش کو بے سود پایا تو اپنا ایک پاؤں بیڈ پر رکھ کر خود ہی برائٹ کو اپنے ایک ہاتھ کے سہارے سے اوپر اُٹھایا۔ اور برائٹ اپنے غیر مرئی اور نامعلوم مہمان کی پذیرائی میں لگا رہا۔

اتنے میں نرس دبے پاؤں وہاں پہنچی اور میز پر رکھا ہوا چارٹ اُٹھا کر دیکھنے لگی پھر اُس نے دوا کی شیشی اُٹھائی اور شیشے میں دوا انڈیلنے لگی۔ برائٹ، گارڈ ماسٹر اور غیر مرئی مہمان، اِن تین کرداروں کی مدد سے جو ڈرامہ یہاں کھیلا جا رہا تھا اُس کا اُس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس طرح کی ہڑبونگ اُس کے لئے غالباً کوئی نئی چیز نہیں تھی۔

گارڈ ماسٹر نے اسی ہڑبونگ کے درمیان برائٹ سے کہا: "چار بج گئے ہیں میجر برائٹ!

دوا پیجیئے۔"

"دوا گئی جہنم میں۔" برائٹ نے جواب دیا۔"مجھے اپنے دوست سے بات کرنے دو۔ بیٹھو ہنری! تم بیٹھتے کیوں نہیں؟ گارڈ ماسٹر! مہمان کو کرسی دو!"

نرس نے دوا کا شیشہ برائٹ کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے دوا نہیں چاہیئے۔" اس نے چیخ کر کہا۔"مجھے ایک کرسی چاہیئے۔ میرے دوست کے لئے ایک کرسی لاؤ۔ کرسی! خدا کے لئے کرسی! اللہ ایک مرتے ہوئے فوجی افسر کی آخری التجا پر کان دھرو!"

اس دوران میں ہسپتال کے اسٹاف کے کچھ اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ کسی نے ایک کرسی وہاں لاکر رکھ دی۔

"بیٹھو ہنری! بیٹھو!" برائٹ نے کسی قدر مطمئن لہجے میں کہا، اور پھر اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ گفتگو ناقابلِ فہم تھی اور لہجہ اکھڑا اکھڑا!

"اچھا اچھا! میں سمجھتا ہوں.... تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ شاباش میرے دوست شاباش!..... یہ تو ہونا ہی تھا .... بے شک، بے شک! ہاں کیوں نہیں! کیا واقعی؟ ...... اچھا! تو پھر یہ تو خوب ہوا۔ بہت خوب! بہت خوب! یہ سب تقدیری امور ہیں میرے دوست! تقدیری امور! اور ہم دونوں کی قسمتیں توازل سے ..... ضرور! اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ یہ تو طے ہے....."

یہ اور اس قسم کے کچھ اور الفاظ تو لوگوں کی سمجھ میں آرہے تھے، لیکن اس کی بظاہر یکطرفہ گفتگو کا بڑا حصّہ بالکل بے ربط اور یکسر ناقابلِ فہم تھا۔

"اچھا خدا حافظ! خدا حافظ!" یہ آخری الفاظ کہہ کر برائٹ نے ایک طویل آہ کھینچی، اور پھر اپنے بدن اور گردن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ گارڈ ماسٹر نے اپنا ہاتھ اس کی گردن کے نیچے سے نکال لیا اور اس کے سر کو تکئے سے ٹکا دیا۔

ایک مرتبہ پھر اُس کو دوا پلانے کی کوشش کی گئی، لیکن اُس نے اِس طرح کڑک کر "نہیں نہیں" کہا کہ سب مرعوب ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اُس نے پھر کراہنا اور سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلانا شروع کر دیا۔

چھ بجے کے قریب ایک وردی پوش فوجی خیمے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک رجسٹر تھا اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے مختلف زخمیوں کے پاس ٹھہرتا ہوا اور اُن سے کچھ کہتا ہوا برائٹ کے بیڈ کی طرف آیا۔ کسی قدر جھکا اور اس سے کہا، "میجر برائٹ! نارمنڈی کے محاذ سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ آج سہ پہر کو چار بجے کیپٹن ہنری کا انتقال ہو گیا!"

برائٹ پر اس اطلاع کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ہنری کی موت کی خبر اس طرح سُنی گویا یہ اس کے لئے کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ وہ اس المناک واقعہ سے دو گھنٹے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا، بلکہ اپنے گزرے ہوئے دوست سے ملاقات بھی کر چکا تھا!

کوائف جامعہ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی پہلی برسی

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی پہلی برسی کو حکومت ہند نے بڑے اہتمام مگر بڑی سادگی کے ساتھ منایا۔ ۳ مئی کی صبح کو نائب صدر جمہوریہ جناب گوپال سروپ پاٹھک صاحب تشریف لائے، قبر پر پھول چڑھائے، فوج کی تینوں شاخوں، بری، بحری اور ہوائی فوج کے ڈیڑھ سو جوانوں نے سلامی دی اور اپنی بندوقیں سرنگوں کرلیں اور تینوں شاخوں کے ۱۲ نوجوانوں نے ماتمی بگل بجایا اور اس کے بعد دو منٹ تک سب لوگ خاموش رہے اور چپ رہ کر خراج عقیدت پیش کیا۔

اس موقع پر وزیراعظم مسز اندرا گاندھی اور دوسرے وزیر، بہت سے سفیر اور معززین شہر موجود تھے۔ محمد علی ہال میں مردوں کے لیے اور ذاکر صاحب کے مکان پر خواتین کے لیے قرآن خوانی کا انتظام تھا، محترمہ بیگم ذاکر حسین صاحبہ اور ان کی دونوں صاحبزادیاں بھی تشریف لائی تھیں۔ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی ذاکر صاحب کے مکان پر بھی تشریف لے گئیں اور تھوڑی دیر بیگم ذاکر حسین صاحبہ کے ساتھ رہیں۔ قرآن خوانی کے بعد بچوں کے گھر کے طلبا، اور طالبات کھانے پر مدعو تھے۔

دوسرے دن یعنی ۴ مئی کی سہ پہر کو جامعہ کے اہتمام میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس کی صدارت کے فرائض ذاکر صاحب کے ایک پرانے ساتھی ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے انجام دیے۔ تلاوت قرآن حکیم کے مدرسۂ ثانوی کے ایک طالب علم خورشید لطیف نے "بچوں کے ذاکر صاحب" کے عنوان پر ایک مضمون پڑھا، جس میں اختصار کے ساتھ ان خدمات کو بیان کیا گیا تھا جو ذاکر صاحب نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں انجام دیے ہیں اور بچوں سے مرحوم کو جو غیر معمولی محبت اور تعلق تھا، اس کا بھی ذکر تھا۔

آخر میں دو اقتباس تھے، جن میں بتلایا گیا تھا کہ وہ جامعہ کے بچوں سے کیا چاہتے تھے۔ یہ دونوں اقتباسات قارئین جامعہ کے لئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے، عرصہ ہوا جب وہ شیخ الجامعہ تھے، ایک موقع پر اپنے پیغام میں فرمایا تھا:

"جامعہ تمھیں سکھانا چاہتی ہے کہ اپنے سینوں میں بھائیوں کی خدمت کا ولولہ پیدا کرو، سچائی کو ہاتھ سے جانے نہ دو، اس راہ میں مشکلیں سامنے آئیں تو منہ مت موڑو، خود سختیاں اٹھاؤ اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، تن بدن موٹے کپڑے سے ڈھانپ لو، روکھا پھیکا کھا کر گذارہ کر لو، مگر دماغ اونچے سے اونچا خیال سوچ سکے، دل اچھی سے اچھی آرزوؤں سے بھرا ہو۔"

"جامعہ تمھیں یہ بھی سکھانا چاہتی ہے کہ تم سچے ہوگے، اچھے ہوگے، تندرست ہوگے، صاف ستھرے ہوگے، بڑوں کے لیے لوہا ہوگے، اچھوں کے لیے موم، غریبوں کا سہارا ہوگے، بےکسوں کا آسرا، سوتوں کو جگاؤ گے، ڈوبتوں کو تراؤ گے، غریب ہوگے تو بھی سیر چشم دوسروں کی دولت کو منہ پھیر کر دیکھو گے، امیر ہوگے تو اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھو گے اور اس کے بندوں کی سیوا میں خرچ کرو گے۔"

اس کے بعد وزیر تعلیم ڈاکٹر راؤ نے ہندوستانی میں تقریر کی، ڈاکٹر صاحب کی انسانیت، شرافت، خلوص اور جذبۂ خدمت کی تعریف کرنے کے بعد مرحوم کی یادگار کے سلسلے میں ان باتوں کا اعلان فرمایا جن کے بارے میں جامعہ کے پچھلے شمارے کے شذرات میں لکھا جا چکا ہے۔ دو نئی باتیں انھوں نے یہ بتائیں کہ ایک تو مرکزی یونیورسٹیوں میں ذاکر حسین میموریل لکچرز کا سلسلہ شروع کیا جائے گا جو باری باری سے جامعہ ملیہ، دلی یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، شانتی نکیتن میں ہوا کریں گے، دوسرے نہرو یونیورسٹی میں ذاکر صاحب کے نام پر علم تعلیم اور فن تعلیم کا ایک اعلیٰ مرکز قائم ہوگا۔

وزیر تعلیم کی تقریر کے بعد استادوں کے مدرسے کے پرنسپل ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے ذاکر صاحب کے تعلیمی تصورات پر ایک مضمون پڑھا، اس کے بعد ڈاکٹر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے تقریر کی اور ذاکر صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا، کنزرو صاحب کے بعد ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے تقریر کی۔ انھوں نے خاص طور پر مرحوم کی رواداری، انسان دوستی، امید پروری پر اور ان کی سیرت و شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ ان کی خاص خوبی ان کی امید پروری تھی وہ

کبھی مایوس نہ ہوتے، خراب سے خراب حالات میں بھی امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ جاتا۔ آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تقریر کی۔ موصوف نے فرمایا کہ ذاکر صاحب کی جس خوبی سے سب سے زیادہ لوگ متاثر ہوئے اور آج جو سب سے زیادہ یاد آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص بھی ان سے ملنے جاتا تھا وہ نیا حوصلہ لیکر آتا تھا، مایوس سے مایوس اور بد دل سے بد دل آدمی جب ان سے ملتا تو اس کی افسردگی اور مایوسی، حوصلے اور امید سے بدل جاتی۔ ان میں قوت کا یہ خزانہ اس لیے تھا کہ ان میں کامل ایمان تھا، اپنے اوپر ایمان، اپنی قوم پر ایمان، ملک پر ایمان اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مالک، اپنے رب پر ایمان تھا۔ وہ انتہائی مخالف اور نامساعد حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتے تھے، ان کا ایمان تھا کہ ملک ترقی کرے گا اور مسلمان اس میں عزت و آبرو سے رہیں گے، ان کے اس ایمان میں کبھی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

جامعہ جب مشکل حالات سے دوچار تھی تو وہ جامعہ والوں سے کہا کرتے تھے کہ آپ بہت سی خوشیوں سے محروم ہیں اپنا کام اچھی طرح کرنے اور اس میں کامیابی حاصل ہونے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ سب خوشیوں سے بڑھ کر ہے اور اسے کوئی آپ سے نہیں چھین سکتا۔ ان کا یہ پیغام اب صرف جامعہ والوں کے لیے نہیں ہے، سارے ملک کے لیے ہے اور ضرورت ہے کہ سب تک پہنچایا جائے۔ ملک کے معاشی اور سماجی حالات بدل رہے ہیں، اس میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی، ان کو برداشت کرنا ہے۔ ہر حال میں اپنا اپنا فرض اچھی طرح انجام دینا ہے اور اسی میں مسرت و سعادت حاصل کرنا ہے۔

پروفیسر محمد مجیب صاحب امریکہ میں

پروفیسر محمد مجیب صاحب آج کل امریکہ میں ہیں، جیسا کہ ہم نے اپریل کے شمارے میں لکھا تھا، وہ ۱۰ اپریل کو دہلی سے روانہ ہوئے، پہلے ترکی گئے، چند روز ٹھہر کر ۱۵ کو نیویارک گئے اور ۱۵ مئی تک وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں میں ان کا پروگرام ہے، وہاں سے فارغ ہوکر دوبارہ ترکی واپس آئیں گے

اور تقریباً ۱۰ جون تک دہلی واپس ہوں گے۔

جاتے وقت ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنے سفر کا روز: رہیں اور واپسی کے بعد ماہنامہ جامعہ کے لیے ایک دو مضمون میں اپنے تاثرات سے قارئین جامعہ کو مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمائیں۔ امید ہے کہ وہ اس کا ضرور لحاظ رکھیں گے۔ موصوف کے جس مضمون کی پہلی قسط اپریل کے جامعہ میں شائع ہوئی تھی اور دوسری قسط اس شمارے میں شامل ہے، اسے انھوں نے میکگل یونیورسٹی (کینیڈا) کے ادارۂ علوم اسلامیہ (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز) میں بھی لوگوں کی خواہش اور اصرار پر پڑھ کر سنایا اور اس پر عالمانہ بحث و گفتگو ہوئی۔

"امریکن رپورٹر" جو دہلی سے شائع ہوتا ہے، پروفیسر محمد مجیب صاحب کا بڑے شاندار لفظوں میں ذکر کیا ہے۔ اس نے اپنی ۱۸ مئی کی اشاعت میں ان کی تصویر شائع کی ہے اور لکھا ہے کہ جامعہ ملیہ دہلی کے وائس چانسلر اور ممتاز ہندوستانی ماہر تعلیم پروفیسر محمد مجیب صاحب کا نیو یارک میں بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا، اس نے اس مقالے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، جس کا عنوان ہے "دو ہم مزاج شاعر — غالب اور ایملی ڈکنسن" اور اس نے لکھا ہے کہ جب یہ مقالہ پڑھا جا رہا تھا تو حاضرین جلسہ نے اپنے قہقہوں سے بار بار اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

ملا نظام الدینؒ پر مقالہ

مولانا مفتی محمد رضا انصاری صاحب، استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی نے ۲۶ اپریل کو جامعہ میں ملا نظام الدینؒ پر ایک مقالہ پڑھ کر سنایا جس کا انتظام ناظم شعبۂ دینیات مولانا عبد السلام صاحب قدوائی نے کیا تھا۔ مقالے میں ملا نظام الدین کے حالات زندگی اور ان کی علمی و مذہبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ موصوف پر اردو میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ کے مضامین میں جستہ جستہ معلومات ملتی ہیں مگر کسی ایک مضمون میں پوری تفصیل سے ان کے تمام حالات اور ان کی مذہبی اور تعلیمی خدمات کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اس مضمون کی اشاعت سے یہ کمی بڑی حد تک پوری ہو جائے گی۔ انشاء اللہ جامعہ کی اگلی اشاعت میں یہ مضمون شائع ہوگا۔ (عبد اللطیف

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

صحرا میں اذان   از گوپال متل

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۱۱۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش، کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ،

قیمت : چھ روپے ، تاریخ اشاعت : ۱۹۷۰ء

ملنے کا پتہ : مکتبۂ تحریک' ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی ۶

'صحرا میں اذان' اردو کے مشہور صحافی اور معروف شاعر جناب گوپال متل کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ پہلا مجموعۂ کلام تقسیم ملک سے پہلے لاہور سے شائع ہوا تھا۔ متل صاحب ہمارے ان شاعروں میں ہیں جو بہت کم کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ اس کم سخنی اور کم گوئی کی وجہ یہ ہے کہ وہ شعری اظہار کے جمال اور شاعری کے منصب سے آگاہ ہیں۔ یہ آگہی جس میں بھی ہوگی وہ پرگوئی سے گریز کرے گا۔ اپنی بات کو اپنی آواز اور اپنے لہجہ میں کہنے کے لمحے کم آتے ہیں اور دوسروں اور اپنے آپ کو دہرانے کے زیادہ۔ صحیح تخلیقی لمحوں کو جو بھی شاعر پہچان لیتا ہے، اچھے شعر کہتا ہے۔ چنانچہ متل صاحب کے زیر نظر مجموعے میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو اپنے اندر تازگی اور ندرت رکھتے ہیں اور شاعر کی تخلیقی صلاحیت کے غماز اور اظہار کی انفرادیت کے مظہر ہیں۔ میں ذاتی طور پر متل صاحب کے اس شعر سے پہلے واقف ہوا یہ جانے بغیر کہ یہ شعر اُن کا ہے :

مجھے زندگی کی دعا دینے والے   ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

اس کے بعد تحریک کے صفحات پر میں نے کبھی کبھار ان کی کوئی غزل دیکھ لی یا پھر مشاعروں میں انھیں سن لیا۔ مگر ہر بار یہ محسوس ہوا کہ میں کسی ایک شاعر کو پڑھ یا سن رہا ہوں جو "بے خودی" میں بھی انداز گفتار رکھتا ہے اور وہ بھی ایک ایسا انداز گفتار جس میں ایک طرح کی انفرادیت ہو۔ مثل صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ وہ غزل کی مانوس اشاریت اور عام موضوعات کو اپناتے ہیں اور اپنے انداز سے اپناتے ہیں۔ مثلاً زاہد و شیخ پر اردو میں بے شمار اشعار ہیں مگر مثل صاحب جب انھیں اپنا ہدف بناتے ہیں تو اس میں ایک ایسا رنگ پیدا ہو جاتا جو لطف سے خالی نہیں ہے۔ ویسے مجموعی طور پر اُن کی فطانت میں ایک نمایاں طنزیاتی رَو ملتی ہے۔ یہ طنزیاتی رَو کبھی ناقدین کی طرح اداروں کو اپنی زد میں لیتی ہے کبھی افراد کو اور کبھی خود اپنے آپ کو۔ دوسروں پر ہنسنا آسان ہے مگر اپنے آپ کو بھی نہ بخشنا ایک ایسی خوبی ہے جو کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔ وہ جب اپنے آپ پر ہنستے ہیں تو اس میں ایک ایسی غم گینی پیدا ہو جاتی ہے جس کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں [illegible] کا شدت سے احساس ہے کہ ان کی ذہانت رائگاں گئی۔ اس احساس نے اُن سے بہت سے اچھے شعر کہلوائے ہیں جن میں کہیں خود اذیتی ہے، کہیں خود ترسی تو کہیں خود تنقیدی۔ اس لحاظ سے ان کا شعری کردار جدید اردو شاعری کے شعری کردار سے ہم آہنگ ہو گیا ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے ذہنی اور فنی سفر میں کہیں رُکے نہیں اور یہ کہ ان کا تخلیقی ذہن عمر کی اس منزل پر بھی جامد نہیں ہوا ہے۔ وہ متحرک ہے اور جدید زمانہ و زندگی کی ہوش رُبا حقیقتوں کو سمیٹنے کے لئے بے تاب۔ انھیں ہر لحہ اپنی فطانت کا احساس رہتا ہے اور یہ احساس اکثر صورتوں میں ایک طرح کا احساسِ تنہائی پیدا کرتا ہے اس وجہ سے کہ فطانت کی ہم رہی مشکل ہوتی ہے، اسے ایسے رفیق نہیں ملتے جو اُسے مطمئن کر سکیں۔ مجموعۂ کلام کے نام کے انتخاب میں بھی اسی احساس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں | میں سونے مکان کا دیا ہوں
منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی | آشوب سفر میں مبتلا ہوں

اس شہر میں وضع کج کلاہی　　میں واقعی درخورِ سنا ہوں

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب　　اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

سر یہ کہتا ہے گوارا نہیں اب بارشِ سنگ　　دل یہ کہتا ہے اسی کوچہ میں جایا جائے
ہم بھی پیچھے رہیں کیوں دعوئ جانبازی میں　　کیا ضروری ہے کہ مرکر بھی دکھایا جائے

وہ بھی انسان ہے لے دل اُسے الزام نہ دے　　جانے اس کو بھی کن آفات نے گھیرا ہوگا

آؤ کچھ جشنِ شہادت ہی میں شرکت ہوجائے　　اپنی کھڑکی ہی سے مقتل کا نظارہ دیکھیں
کون منجدھار میں جائے سرِ ساحل بیٹھیں　　دور سے ڈوبنے والوں کا تماشا دیکھیں
اب بھی ہوتا ہے وہاں ذکر بہار اکہ نہیں　　عالم اس بزم کا اب کیا ہے ذرا جا دیکھیں

ہر ایک شخص ترکِ تمنّا کا مدعی　　ہر ایک شخص تیری تمنّا لئے ہوئے

پی ہے اگر شراب تو کچھ لطف اٹھائیے　　کیوں اتنی احتیاط ذرا لڑکھڑائیے
اتنا لحاظ روح کا اور اتنی فکر بھی　　جھوٹا ہے شیخ، باتوں میں اس کی نہ آئیے

بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقصِ بصارت ہو　　بڑی سرعت سے دنیا کھو رہی ہے دلکشی اپنی

مجموعے میں آزاد نظمیں بھی ہیں اور پابند بھی۔ ان کی بہت سی نظمیں اپنی شدتِ احساس

کی وجہ سے متاثر کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر متلی صاحب کی نظموں میں بھی ایک طرح کی خوشگوار غزلیت ہے۔ ایک عرصے کے بعد ایک معتبر مجموعۂ کلام سامنے آیا ہے جو مجھے امید ہے کہ 'سرمۂ دیدۂ صاحب نظراں' ثابت ہوگا۔

(انور صدیقی)

غالب اور حیدر آباد ازضیاء الدین احمد شکیب

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$، حجم ۲۲۴ صفحات، مجلد مع گردپوش، قیمت: ۷ روپے،
تاریخ اشاعت: فروری ۱۹۶۹ء، ملنے کا پتہ: ادبی ٹرسٹ بکڈپو۔ کنار اینک بلڈنگ
حیدر آباد ــ ۱ (اے پی)

حیدر آباد ان جگہوں میں سے ہے، جہاں غالب کبھی نہیں گئے، انھیں مشورہ ضرور دیا گیا کہ اگر حیدر آباد جائیں تو ان کی مالی مشکلات کا حل نکل آئے گا، مگر یہ کہکر ٹال گئے "اب میں کہاں اور سفر دکن کہاں"۔ ان سے کہا گیا کہ حیدر آباد کے وزیر اعظم چندو لال جو ریاست کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں، ان کی قدر کریں گے، اس پر فرمایا "چندو لال میرے زمزمے کو کیا جانے اور میری روش کو کیا پہچانے۔" مگر وہاں ان کی شہرت گئی، جس طرح ملک کے اور حصوں میں گئی، وہاں ان کے شاگرد اور قدرداں تھے، جس طرح اور مقامات پر پھیلے ہوئے تھے، وہاں کے ادیبوں نے ان کے ادبی محاسن کا جائزہ لیا اور مشکل اشعار کی شرحیں لکھیں، ان ہی سب باتوں کی تفصیل زیر تبصرہ کتاب میں بیان کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے بہرحال اس کتاب کے لکھنے کا ایک جواز ہے اور غالبیات میں ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر کتاب بہت ہی عجلت میں لکھی گئی ہے۔ چنانچہ محترم مصنف نے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"یہ کام مجھے ایک ایسے وقت سونپا گیا، جب غالب صدی تقاریب کے لیے صرف تین ہفتے باقی تھے۔ اس مختصر سی مدت میں اس موضوع سے انصاف کر سکنا دقت طلب اور جو

وسائل موجود ہوں ان سے استفادہ کرنا مشکل تھا، بہر حال تین چار ہفتوں میں جو بن پڑا وہ کیا۔" (صفحہ ۷)

اس کی وجہ سے کتاب میں بہت سی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ سب سے بڑی خامی مجھے ترتیب میں نظر آئی۔ کتاب کئی ابواب میں تقسیم ہے، مثلاً پہلے باب کا عنوان ہے "فضا" اس میں حیدر آباد کے پس منظر، عہد غالب کے حیدر آباد اور غالب کے بعد کے حیدر آباد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب کا عنوان ہے "تعلقات" پہلے کی طرح اس کے بھی تین حصے ہیں، تماشائے اہل کرم، ادبی تعلقات، سخنہائے گفتنی۔ تیسرے کا عنوان ہے "دبستان" جس کے دو حصے ہیں تشکیل اور اثرات۔ چوتھے کا عنوان ہے "غالبیات" جس کے ذیلی عنوانات ہیں، انتقادیات، غالب کی شرحیں، شذرات۔ کتاب کی یہ ترتیب مناسب اور اچھی ہے، مگر واقعات بیان کرتے وقت اس ترتیب کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، جس کی وجہ سے تکرار کا عیب پیدا ہو گیا ہے، مثلاً "حیدر آباد پس از غالب" (۱۸۶۹ تا ۱۹۶۹) کے تحت لکھتے ہیں:

"حیدر آباد کی علمی ادبی محفلوں میں غالب، موضوع بحث ہوا کرتے تھے اور یہ بحثیں بعض اوقات سخت وشدید بھی ہوتی ہیں، طرفداران غالب کی تعداد بھی کافی تھی اور ان کی منزلت بھی اونچی تھی، یہی وہ دور ہے جب حیدر آباد میں غالب فہمی کی کوششیں شروع ہوئیں، کلام غالب کی شرحیں لکھی گئیں، ان کے کلام پر مناظر اور مباحثے ہوئے اور تنقیدات غالب کا آغاز ہوا، ساتھ ہی ساتھ غالبیات کو حیدر آباد کے بعض کالجوں کے نصاب میں بھی داخل کیا گیا۔" (صفحہ ۲۱ و ۲۲)

یہ بحث و گفتگو چوتھے باب "غالبیات" میں آنی چاہئے تھی اور آئی بھی ہے، اسی وجہ سے یہاں یہ ذکر بے موقع محسوس ہوا۔ اسی طرح "حیدر آباد پس از غالب" میں صفحہ ۳۴ پر حبیب اللہ ذکا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"غالب کے حیدر آبادی شاگرد حبیب اللہ ذکا غالب سے اس وقت متاثر ہوئے

ہیں جب غالب کی وفات سے برسوں پہلے وہ موجودہ آندھرا پردیش کے ضلع نیلور کے ایک
چھوٹے سے مقام اودگیر میں رہتے تھے ..." (صفحہ ۳۵)

اولاً حبیب اللہ ذکا کے بارے میں "ادبی تعلقات" کے تحت بہت تفصیل سے لکھا گیا، تعجب کی بات یہ ہے کہ "عہد غالب کا حیدرآباد" (۱۷۶۱ء تا ۱۸۶۹ء) میں ذکا کا بالکل ذکر نہ گیا، جبکہ محترم مصنف کے مطابق ذکا کا ربط مرزا غالب سے بذریعہ مراسلت ۷ر ستمبر ۱۸۶۱ء پہلے قائم ہو چکا تھا۔" (صفحہ ۱۰۲)

اس کتاب میں دعوے بہت ہیں اور ثبوت بہت کم دئے گئے ہیں، مثلاً صفحہ ۴۴ پر جامعہ کے ابتدائی اساتذہ کی ایک لمبی چوڑی فہرست دیکر لکھا ہے کہ "ان میں سے کئی ایسے ہیں جنھوں "غالبیات" کے ارتقا میں اہم خدمت انجام دی ہے۔" اگرچہ ان میں سے بعض اساتذہ کی کت اس قدر مقبول اور مشہور ہیں کہ ان سے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ناواقف ہو، لیکن مصنف تھا کہ ان کتابوں کا یہاں ذکر ضرور کر دیتے، اس کے دارالترجمہ اور فاضل مترجمین کا ذکر کر کے بعد لکھا ہے کہ "اصحاب دارالترجمہ کی اس مختصر سی فہرست سے یہ بات واضح ہوتی ہے میں دلدادگانِ غالب کتنے ہیں۔" میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ جب تک ان مترجمین کے کی طرف اشارہ نہ کیا جائے، محض فہرست سے کیسے واضح ہو گیا کہ فلاں فلاں دلدادۂ غالب میں شامل ہیں۔ "حیدرآباد پس از غالب" میں صفحہ ۳۶ پر درج ہے: "نواب عماد اور سر راس مسعود نے غالب کی شرحیں لکھوانے کی طرف خصوصی توجہ دی۔" غالب کی شر جہاں مستقل عنوان کے تحت تفصیل سے بحث کی گئی ہے، وہاں یہ تو لکھا ہے کہ "غالب کی شرح کا خیال سب سے پہلے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو پیدا ہوا" (صفحہ ۲۱۰) مگر سر راس مسعود کہیں نظر نہیں آیا۔ صفحہ ۳۶ پر سر راس مسعود کے ذکر کے بعد ہی ہے: "اس دور کے حید کے ادبی ماحول کو ان شخصیتوں کے علاوہ جو یہاں مقیم تھیں، مرزا غالب کے اہم ترین شاگ حالی اور رفقاء سرسید میں مولانا ذکاء اللہ اور مولانا شبلی نعمانی کے گاہ بہ گاہ دورے

رونقِ تازہ ملتی رہی ۔" اے کاش تھوڑی بہت تفصیل دیدی گئی ہوتی ۔ مولانا شبلی پر میں نے تھوڑا بہت کام کیا ہے، میرا احساس ہے کہ انھوں نے غالب کو بالکل نظر انداز کیا ہے ۔ ایک صاحب کا جامعہ کے غالب نمبر میں مضمون شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے "شبلی ـــ منکرِ غالب" منکرِ غالب ہونے کی فاضل مضمون نگار نے جو دلیل دی ہے، اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے، مگر کوئی ایسا ثبوت میری نظر سے نہیں گذرا جس سے معلوم ہوتا کہ شبلی غالب کی عظمت کے معترف رہے ہوں۔ حیدر آباد کی ادبی رونق میں اگر شبلی کے دوروں سے اضافہ ہوا ہو، تو اس کی تفصیل سے مجھ جیسے بہتوں کو فائدہ پہنچتا۔ "حیدر آباد پس از غالب" کے خاتمہ پر فاضل مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ: "جدید سائنٹیفک طریقہ ہائے تحقیق کے مطابق غالبیات کے آغاز کا سہرا حیدر آباد ہی کے سر جاتا ہے۔" (صفحہ ۴۲) میرے خیال میں یہ دعویٰ بہت زیادہ ہے۔

اپنی ناپسند کی آخری بات یہ عرض کر دوں کہ بعض الفاظ اور طرزِ نگارش مجھے غالب کی شان اور مرتبے کے خلاف نظر آئے ۔ فاضل مصنف کے قیاس کے مطابق ناسخ نے غالب سے زر ڈگری معلوم کیا تھا، غالب نے اس کے جواب میں جو خط لکھا ہے، جس کا ترجمہ زیرِ تبصرہ کتاب میں درج ہے، اس کا انداز اور لب و لہجہ بہت اچھا ہے، مگر محترم مصنف نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "مرزا اس مشورے پر الٹا چراغ پا ہو گئے۔" (صفحہ ۵۰) اسی طرح جب مرزا غالب کو نظام دکن کی خدمت میں قصیدہ لکھکر بھیجنے کا مشورہ دیا گیا تھا تو غالب اپنی بدنصیبیوں کی داستان لکھنے کے بعد فرماتے ہیں: "اب جو میں والیِ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست تباہ ہو جائیگی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔" (صفحہ ۳۰)، بظاہر غالب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی شوخیِ قلم کا نتیجہ ہے، نہ کہ واقعی غالب سمجھتے تھے کہ ان کے قصیدہ لکھنے سے نظامِ دکن پر آفات سماوی و ارضی ٹوٹ پڑیں گے۔ مگر محترم مصنف نے اسے حقیقت سمجھ کر لکھا ہے کہ اس عمر میں (بڑھاپے میں) وہ

اپنے آپ کو بڑا منحوس اور مربی سوز سمجھنے لگتے ہیں۔" (صفحہ ۷۱) آگے چل کر لکھتے ہیں: میرزا اگرچہ اپنی نحوست کے خیال سے والیِ دکن کا قصیدہ نہیں لکھنا چاہتے تھے۔۔۔" (صفحہ ۷۵)

اس میں شبہ نہیں کہ کتاب اچھی اور مفید ہے، اگر رواروی میں نہ لکھی گئی ہوتی اور تحقیق و تفتیش کا پورا حق ادا کیا گیا ہوتا تو یہ کتاب اور بہتر اور مفید ہو سکتی تھی۔ مگر موجودہ حالت میں بھی اسے غالبیات میں ایک مفید اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

آثارِ محروم

مرتبہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

سائز ۲۰×۳۰/۸، حجم ۲۶۸ صفحات، قیمت: سات روپے، سنہ اشاعت: ۱۹۷۰ء

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

"آثارِ محروم" دراصل ماہنامہ "پگڈنڈی" (امرتسر) کا محروم نمبر ہے، فاضل مرتب کے بیان کے مطابق "حضرت محروم کی زندگی ہی میں شروع ہوا تھا، لیکن بوجوہ اس کی اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔" یہاں تک کہ حضرت محروم کا انتقال ہو گیا، اس کے بعد منتظمین نے شاید فیصلہ کیا کہ ان کی پہلی برسی کے موقع پر شائع کیا جائے، لیکن نہ جانے کیوں اس موقع پر بھی شائع نہ ہو سکا اور اب انتقال کے چار سال کے بعد شائع ہوا ہے۔ اس غیر معمولی تاخیر سے ایک عجیب صورت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اس کے بہت سے مضمون نگار اور پیغامات دینے والے بھی وہیں پہنچ گئے ہیں، جہاں حضرت محروم ۶ جنوری ۱۹۶۶ء کو تشریف لے گئے۔ مثلاً پیغامات دینے والوں میں، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، سردار پرتاپ سنگھ کیروں، نواب مہدی نواز جنگ، سردار گورمکھ نہال سنگھ، احمد محی الدین، شری شام ناتھ، نواب سعادت علی خاں اور مضمون نگاروں میں، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، محمد اجمل خاں، نریش کمار شاد اور مولانا ضیا الباقی۔ یہ وہ نام تھے جو میرے علم میں ہیں، تحقیق کی جائے تو ممکن ہے ایک آدھ نام اور نکل آئیں۔ اتنے مرحومین کو اکٹھا دیکھ کر ذہن کو ایک جھٹکا لگا کہ اس مختصر مدت میں ہم اتنے مدیروں اور ادیبوں سے محروم ہو گئے۔

حضرت محروم کی پہلی برسی پر "افکار محروم" کے نام سے مختلف مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جسے جناب مالک رام صاحب نے مرتب فرمایا ہے اور جس کی رسم اجرا، جامعہ ملیہ کے ایک جلسے میں عمل میں آئی تھی۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے، مگر اس میں مرحوم کی شخصیت اور شاعری کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین شامل ہیں، زیر تبصرہ کتاب "آثار محروم" کے مضامین مختصر ہیں، مگر ان میں تنوع ہے اور مضامین کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی ہیں، جن سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، مثلاً مشاہیر کے پیغامات اور مکتوبات ہیں، منظوم خراج عقیدت ہے، اخبارات اور رسالوں کے اقتباسات ہیں اور وہ سپاسنامے ہیں جو مرحوم کو ان کی زندگی میں مختلف مواقع پر پیش کئے گئے تھے۔ غرض اس کتاب ــ یا خاص نمبر ــ میں حضرت محروم کی زندگی اور شاعری کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس کے مطالعہ سے مرحوم کی مکمل شخصیت کے بارے میں جملہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

جگر بریلوی

مرتبہ: مالک رام، سیفی پریمی

سائز $\frac{۱۸\times۲۲}{۸}$، حجم ۱۹۲ صفحات، تاریخ اشاعت: مئی ۱۹۷۰ء

ملنے کا پتہ: علمی مجلس، ۱۴۲۹ ـ چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ۔ دہلی ۶

"تحریر" ایک سہ ماہی رسالہ ہے جو اردو کے مشہور ادیب جناب مالک رام صاحب کی ادارت میں چار سال سے کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے، اس کا بارہواں شمارہ، بابت مئی ۷۰ ۱۹ء جناب شیام موہن لال جگر بریلوی کے لیے مخصوص ہے، جن کا اردو کے بلند پایہ ادیبوں اور ممتاز اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ مجموعۂ مضامین میں موصوف کی نثری اور شعری خدمات اور کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ موصوف کی نظم و نثر میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جنھوں نے نقادوں سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ حضرت نیاز فتحپوری نے ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "جگر بریلوی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے اور غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت

سے وہ بہت معروف و مقبول ہیں، وہ کلاسیکل رنگ کے شاعر ہیں اور بہت شائستہ، صاف ستھرے ذوق کے۔" اس مجموعے میں موصوف کے اشعار کا الگ سے انتخاب نہیں دیا گیا ہے حالانکہ اس کی ضرورت تھی، اس لیے مختلف مضامین میں جو اشعار حوالے کے طور پر دئے گئے ہیں، ان میں سے کچھ اشعار نقل کرتا ہوں، جن سے قارئین جامعہ موصوف کی شاعری کا کچھ اندازہ کر سکیں گے۔

چھوٹی بحر کے کچھ متفرق شعر ملاحظہ ہوں:

کیا تبسم میں اس کے دیکھ لیا
کیوں جگر اشک بار رہتا ہے؟

تھک کے منزل پہ سو گیا ہے، جگر
منہ پہ ڈالے ہے کوئی داماں سا

لا رہا ہوں انھیں تصور میں
اپنے خاکے میں رنگ بھرتا ہوں

وہ سمایا ہوا ہے رگ رگ میں
فیض ہے یہ غم نہانی کا

تیری رحمت سے ناامید نہیں
اپنی محرومیوں سے ڈرتا ہوں

ستم و جور پر یقین کرم
اور بھی استوار ہوتا ہے

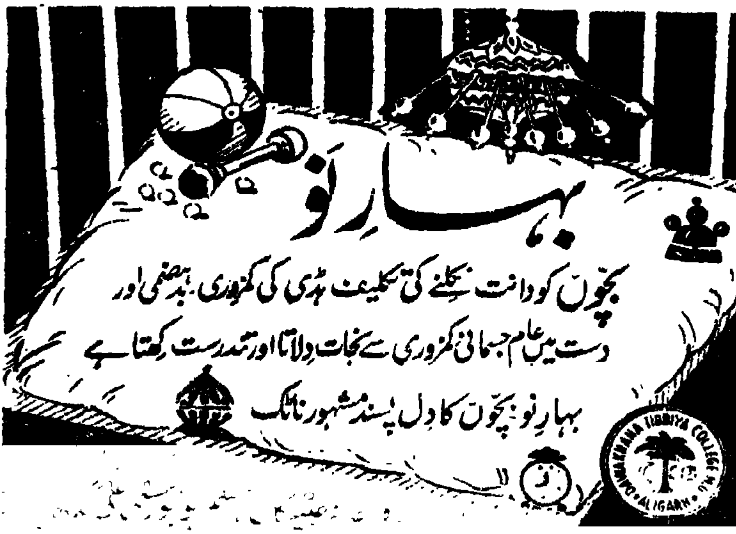
نہ پوچھو زندگی کس طرح گذری
میں ہر ہر سانس پہ رو رو دیا ہوں

کچھ نسبتاً طویل بحر کے چند شعر پیش خدمت ہیں:

دل کی سی کہاں ویرانی ، دل کی سی کہاں شادابی
سو بار بیاباں دیکھ لیا ، سو بار گلستاں دیکھ لیا
غم خانۂ دل کی ویرانی ، کچھ گھٹ نہ سکی کچھ بٹ نہ سکی
مہتاب کو تاباں دیکھ لیا ، خورشید درخشاں دیکھ لیا
یاد کسی کی آگئی ، کٹ گئی زندگی کی رات
ورنہ کہاں نمودِ صبح ایسی شبِ دراز میں
تیرے ستم نے توڑ دیا دل ، لیکن اس کو کیا کہئے
تیرا ہی دامن پکڑا ہے ، جب آنکھ میں آنسو آئے ہیں
جسے دیکھ وہ فلک زدہ ، یہ جہاں ہے یا کوئی غم کدہ
جو پلٹ دے گردشِ آسماں ، ہمیں اس جواں کی تلاش ہے

حضرت جگر بریلوی کی عمر اس وقت کوئی ۸۰ برس ہے اور کچھ عرصے سے صحت خراب رہتی ہے، اس لیے مدیرِ "تحریر" جناب مالک رام صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ مجموعہ شائع کرکے اور اردو کے ایک بزرگ ادیب کی خدمات کا اعتراف کرکے فرض کفایہ ادا کیا ہے اور جناب سیفی پریمی کا بھی اردو ادب پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے ان مضامین کو اکٹھا کرکے ایک مفید کام کیا ہے۔

(عبداللطیف اعظمی)



(یو پی)

ماہنامہ جامعہ

ہر ماہ کی پہلی یا دوسری کو روانہ کیا جاتا ہے، اگر کسی صاحب کو ۱۵ تک کوئی شمارہ نہ ملے تو براہ کرم اُسی مہینے کے اندر اطلاع کر دیا کریں تاکہ اگلے شمارے کے ساتھ اسے بھیج دیا جائے، بہت تاخیر سے اطلاع کرنے پر مطلوبہ پرچہ کبھی مہیا کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

منیجر

Regd. No. D-768 June, 19

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25